رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے اُفق

کراچی

ابتدائیہ

دستک	مشتاق احمد قریشی	8
گفتگو	عمران احمد	10
اقرأ	طاہر قریشی	20

سچی کہانیاں

گردش حالات	خلیل جبار	99
سنہرا جال	طلعت نفیس	108
اعتماد	نوشاد عادل	114
میں دیوانہ	محمد سلیم اختر	136
اقبال جرم	انجم فاروق ساحلی	180
دیر آید	ریاض بٹ	198
وحشی	عبداللہ شاہد	206

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

مغرب سے انتخاب

دم رخصت	طاہر رانا	55
قاتل خطوط	سلیم انور	58
پڑتال	صابر حسین	61

ناول

بلاوا	خورشید پیرزادہ	22
گمراہی	خان شفیق	236

مستقل سلسلے

گردش	شہناز بانو	64
گنگا کا پجاری	اے۔حمید	144
روحانی مسائل	حافظ شبیر احمد	226
خوشبوسخن	عمر اسرار	229
ذوق آگہی	عفان احمد	233

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ادارہ مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

ہاں، ہم امریکا کے بغیر جی سکتے ہیں......!

پاکستانی قوم کو ایک فیصلہ کرنا ہی ہوگا۔ آج نہیں تو کل، اپنی قوت ارادی سے نہ سہی مجبوراً ہی کرنا تو پڑے گا۔ امریکا کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنا تو پڑے گا۔ اس سے قبل کہ ہماری توانائیاں جواب دے جائیں اور ہم ان زنجیروں کو توڑ نہ سکیں اور ان کی دی ہوئی سُولی کے پھندے کو اپنی گردن میں اتار لیں۔ ابھی وقت ہے کہ پاکستانی قوم بے دار ہو جائے، ہوشیار ہو جائے۔ ابھی تاریکی اتنی نہیں بڑھی کہ بنیادی کام نہ کر سکیں ہاں، ہمیں اجتماعی طور پر بحیثیت مسلمان قوم کے ایک فیصلہ کرنا ہی ہوگا، ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہی ہوگا تب ہی ہم اس ظالم بے درد دنیا میں جی سکیں گے، سر اٹھا سکیں گے۔ وہ وقت گزرے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ذوالفقار علی بھٹو نے یہ فیصلہ کیا اور عالمی سطح پر اس کا اظہار بھی کر دیا کہ ہم گھاس کھالیں گے لیکن جوہری قوت ضرور حاصل کریں گے۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ہماری اس کوشش کو بارآور کیا، تمام دنیا کی مخالفتوں ناراضگیوں اور ترکِ تعلق کی دھمکیوں اور عملی اقدامات کے باوجود پاکستان نے جوہری قوت حاصل کر کے ہی دم لیا۔ یہ تو بہت بڑی جرأت کا اقدام تھا، خود مختاری حاصل کرنا اور خود کو امریکا کی غلامی سے آزاد کرنا تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی اقدام ہوگا۔ اللہ نے پاکستان کو یورینیم کی دولت سے نوازا ہے۔ سونے، تانبے سے، لوہے کے ذخائر سے اور ان سب سے بڑھ کر تیل کی دولت سے نوازا ہے۔ خود کفالت کے لیے اللہ تعالیٰ نے پانچ دریا عطا کیے تھے جن میں سے، ہم اپنی کاہلی، سستی اور بدنیتی کے باعث دو دریا کھو چکے ہیں۔ اب ان تینوں پر بھی دشمن کی آنکھ لگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سونا اُگلتی زرخیز زمین سے نوازا ہے۔ دنیا کی قابلِ ذکر وہ کون سی معدنی دولت ہے جو وطن عزیز میں میسر نہیں؟ دفاعی ضروریات کے لیے لڑنے مرنے والے جہاد کے نام پر جانیں قربان کرنے والے جوان غذائی ضروریات پوری کرنے والی زمینیں اللہ نے ہمیں عطا کی ہیں۔ وہ کون سی دولت ہے، جو ملک چلانے کے لیے بچانے کے لیے ہمیں حاصل نہیں؟ ہمیں ایسا خوب صورت برمحل خطہ ارض عطا کیا گیا ہے کہ دشمنِ جاں بھی منفی قدم اٹھاتے ہوئے نا صرف ڈرتا ہے بلکہ سوچتا بھی ہے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اگر اس کے باجود بھی ہم اپنے گلوں سے غلامی کے طوق نہ اتار سکیں تو اسے ہم اپنی بدنصیبی نہیں بلکہ کاہلی اور سستی کہیں گے۔

بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کا خیال ہے کہ قوم میں رہنمائی کا فقدان ہے، دیانت دار مخلص رہنما قوم کو میسر نہیں ہیں۔ ایسا کہنے والے سوچنے والے ذرا فکر کریں کہ کیا یہ سیاسی رہنما اور لیڈر کرام ہمارے لیے آسمانوں سے اتریں گے۔ وہ بھی ہم میں سے ہی اٹھتے ہیں، ہم ہی انہیں اپنا لیڈر منتخب کرتے ہیں، یہ تو ہماری اپنی خامی اور کمزوری ہے کہ ہم خود اپنے گلوں میں ایسے پھندے ڈال لیتے ہیں جس کی ڈوریں غیروں کی ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔

سیاست، اہلِ سیاست کے لیے اب خدمت خلق نہیں رہی بلکہ تجارت بن چکی ہے۔ ہر سیاست دان اپنی اپنی دکان چمکانے اپنے مفادات حاصل کرنے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ کسی کو ملک و قوم کی فکر نہیں، اگر فکر ہے تو صرف اتنی کہ اقتدار کی کرسی پر کس طرح بیٹھا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے وہ خود کو تو بیچتا ہی ہے، ملک و قوم کو بیچ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا، انہیں ملک و قوم سے زیادہ ذاتی مفاد عزیز و مقدم ہوتا ہے جب کہ ہماری، ہمارے اسلاف کی تاریخ گواہ ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر جب خلیفہ مقرر ہوئے یعنی مسلمانوں کے حکمران بنے تو ان کا قول تھا کہ اگر دریائے فرات (جو مدینہ منورہ سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر تھا) کنارے کوئی کتا بھی بھوکا ہوگا تو عمر سے جواب طلب ہوگا۔ یہ تھا احساس ذمہ داری! ایسے واقعات سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز جو خود خلیفہ بننے سے پہلے بڑے امیر و متمول حیثیت کے مالک تھے لیکن خلیفہ بن جانے کے بعد انہیں اس احساس نے کہ وہ عوام کے دکھ درد میں ان کی ضروریات کا کس طرح خیال کریں، ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ ایک شب جب سرکاری کام میں مشغول تھے کہ ان کی اہلیہ محترمہ کسی کام سے ان سے بات کرنے تشریف لے آئیں تو انہوں نے سرکاری تیل سے جلنے والا چراغ صرف اس لیے بجھا دیا تا کہ سرکاری تیل ان کی ذاتی ضرورت میں کام نہ آ سکے۔ ادھر ہمارے حکمران خود تو جو عیاشیاں اور مزے کرتے ہیں ساتھ ساتھ اپنے حواریوں کو بھی خوب مزے کراتے ہیں، دورے پر اگر کہیں جانا ہوتا ہے تو ایک پورا قافلہ ایک ہجوم ساتھ چلتا ہے وہ بھی سرکاری ماہرینِ معاشیات کا کہنا ہے کہ ایوانِ صدر کا صرف ایک دن کا خرچہ دس لاکھ روپے ہے اور وزیراعظم کے ایک دورے پر کم از کم پینتیس سے چالیس کروڑ کا خرچا آتا ہے۔ ایسی دھکم پیل ایسی دوڑ میں کون پیچھے رہ سکتا ہے ملک و قوم کا مفاد کیسے کس طرح عزیز رہ سکتا ہے؟ ہاں، اگر ہم اسلامی شعائر کو اپنا لیں، سب نہیں تو کچھ ہی سہی اپنے مفادات پر قومی مفادات کو ترجیح دینے لگیں تو وہ دن دور نہیں جب امریکا ہم کو مدد دینے کے بجائے مدد مانگنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اگر ہم اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کریں اور ان کا درست استعمال کرنے لگیں تو کون ہوگا جو ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہمیں روک سکے؟ ہم دنیا میں سر اٹھا کر جی سکتے ہیں۔ ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہمیں خود کرنا ہوگا کسی بیرونی بیساکھی کسی سہارے کے بغیر ورنہ ہر سہارا دینے والا اپنے مفادات کے حصول کے لیے ہمیں ہمیشہ دھوکا ہی دیتا رہے گا اور سب کچھ ہونے کے باوجود ہم منہ کے بل گرتے ہی رہیں گے۔ علامہ اقبال کے اس شعر پر غور و فکر کرنا ہی ہوگا، سوچنا سمجھنا ہی ہوگا۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی



گفتگو

عمران احمد

سیدنا سلمان فارسیؓ سے روایت ہے، نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور جس قدر اس امکان میں ہو طہارت کرے پھر اپنا تیل لگائے یا اپنے گھر کی خوشبو استعمال کرے اس کے بعد (نماز کیلئے) نکلے اور آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے پھر جس قدر اس کی قسمت میں ہو نماز پڑھے بعد اس کے جس وقت امام خطبہ پڑھنے لگے چپ رہے تو اس کے وہ گناہ جو اس جمعہ اور دوسرے (گزشتہ) جمعہ کے درمیان میں ہیں، بخش دیئے جائیں گے۔ بخاری: کتاب الجمعۃ

عزیزان محترم...... سلامت باشد

کراچی جو کبھی عروس البلاد یعنی روشنیوں کی دلہن کہلاتا تھا۔ آج خوف و ہراس کی علامت بن چکا ہے' کوئی دن نہیں جاتا جب دس' بارہ افراد کی ٹارگٹ کلنگ کی اطلاع نہ آتی ہو۔ کراچی جس کی راتیں ہوں یا دن ہمہ وقت جاگتے رہتے تھے' اب راتیں تو راتیں دن بھی سونے سونے ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوبے محسوس ہوتے ہیں۔ صنعت کار ہوں یا تاجر ایلیٹ کلاس ہو یا مڈل کلاس ہر شخص ملک چھوڑنے پر تیار بیٹھا ہے۔ وہ شہر جو ملک کے خزانے کو ستر فیصد ریونیو فراہم کرتا ہے اس کی غریب بستیوں میں بھوک اور بے روزگاری رقص کرتی نظر آتی ہے کہ جب فائرنگ اور دہشت گردی کے نتیجے میں بازار' مارکیٹیں اور صنعتیں بند ہوں گی تو دیہاڑی پر کام کرنے والے مزدور اور خوانچہ فروش کہاں سے کھائیں کمائیں گے۔ نتیجتاً ان کی اولادیں اپنے حالات کی تبدیلی کے لیے دہشت گرد گروہوں کا ایندھن ہی بنیں گے۔ جو غیر ملکی سرمایہ کے بل بوتے پر انہیں اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے ڈالروں کی ڈھیریاں خرچ کرنے کو تیار بیٹھی ہیں۔ دعا کریں اللہ ہمیں اپنے حال پر رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور عقل سلیم دے کہ ہم یہود و نصاریٰ کی سازشوں کو سمجھ سکیں۔

اب آیئے اپنے تلخ و شیریں خطوط کی طرف۔

نازسلوش ذیشے...... میر پور آزاد کشمیر۔ قابل احترام عمران بھیا بعد از سلام۔ سب سے پہلے سب کو عیدالاضحیٰ مبارک۔ 20 اکتوبر کو جب پوسٹ مین کے ہاتھوں سے نئے افق مجھ تک پہنچا میں سی وی بنانے میں مگن تھی ارادہ تو تھا کہ فرصت میں پرچہ لفافہ چاک کرکے نکالوں گی۔ مگر بھابی نے مجھ سے دو منٹ قبل پھرتی دکھائی اور پرچہ چاک کرکے میرے حوالے کردیا۔ میں سارے کام پس پشت ڈال کر ٹائٹل دیکھ کر گفتگو پڑھنے بیٹھ گئی۔ اس بار تو میں بہت دل سے عمران بھیا اوران صاحب کو مبارک باد دوں گی جنہوں نے ماہ نومبر کا ٹائٹل چوز کیا۔ اتنا اچھا لگا کہ کیا بتاؤں۔ ہلکے ہلکے رنگوں کا امتزاج' عرب کا صحرا اور شتربان اپنے اونٹ کے ساتھ دف بجاتا ہوا' اونٹ کی بڑے فخر سے اٹھی گردن' یقین مانیے دل خوش ہوگیا۔ دوسرے لفظوں میں لگا جیسے آج جو بارش ہوئی ہے اس میں نئے افق دھنک کی طرح بکھر گیا ہے۔ آج ہی سردیوں کی پہلی بارش تھی اور آج ہی ادارہ نئے افق سے تحفہ موصول ہوگیا۔ فہرست اس بار پھر میرے انوکھے اور دلچسپ نام سے محروم رہی۔ دل اداس تو ہوا مگر کیا کیجیے...... کوشش کی کہ ذرا اور صبر کرلوں کیا معلوم صبر کا پھل بہت ہی میٹھا مل جائے۔ مشتاق انکل کا اداریہ ''امریکی امداد کے بغیر زندگی'' جی ہاں ہم امریکی امداد کیا

کسی بھی ملک کی امداد کے بغیر نہ صرف جی سکتے ہیں بلکہ بہت خوشی خوشی بہت خوشحال زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اس بار الیکشن کے لیے عمران خان جیسا انقلابی بندہ بھی کھڑا ہوگا شاید میرا' میری زندگی کا پہلا ووٹ انہی کو جائے اور خدا کرے اس ارض وطن کو مخلص اور صاف نیت صدر میسر آجائے۔ گفتگو میں عمران بھیا کے الفاظ پڑھ کے میں کیا کہوں؟ سچ کہوں تو لاجواب ہوگئی ہوں۔ اس ملک میں بہت کچھ ہوسکتا ہے اگر عمل کرلیا جائے۔ ہم دوش کس کو دیں آج کل جو مسلمانوں کا طرز عمل ہے۔ اسی پر شہ پا کر وہ خبیث لوگ اس طرح کی ناپاک حرکتیں کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی میں نے عنایت اللہ کی لکھی ''فردوس ابلیس'' پڑھی۔ گیارہویں صدی میں اس ملعون (حسن بن صباح) کا فتنہ اٹھا اور اس نے جی بھر کر ابلیس اور دشمنان اسلام کو خوش کیا۔ وہ گیارہویں صدی کا دور تھا اور آج اکیسویں صدی ہے۔ ہزار برس پرانے حالات پڑھ کر کچھ عجیب نہیں لگا ہاں تب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ تب میں نے سوچا اگر حسن بن صباح آج ہوتا تو اس کی حکومت یقیناً پوری دنیا پر پھیل چکی ہوتی۔ 90 سال کی عمر تک اس نے حشیش کے زور پر ٹیلی کمیونیکیشن نہ ہونے کے باوجود لوگوں کے دلوں پر راج کیا۔ اسلام کی نامور شخصیات' بڑے بڑے علماء' وزراء اور مسلمانوں کو اس نے قتل کروایا۔ بدامنی پھیلائی' لوگوں کو اسلام کے نام پر اسلام سے خارج کردیا اور آج...... سوچتی ہوں بس ماہ و سال آگے بڑھ کر کلینڈر پر تاریخ ہی بدلی ہے ورنہ حالات و واقعات تو آج بھی وہی ہیں وہی نہتے بے ضرر مسلمانوں کا قتل عام ہورہا ہے۔ پچھلے ماہ کی بات ہے میرا ایک کزن جو کہ تربیلہ کے ایک گاؤں میں مقیم تھا بیس برس عمر تھی کسی وجہ سے ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا شاید گیارہ ستمبر کے دن اسے کسی نے نشہ حد سے زیادہ پلا دیا۔ بارہ ستمبر کو عصر کے وقت وہ گھر سے نکل گیا اور باوجود تلاش کے نہ ملا۔ اٹھائیس ستمبر کو پولیس اسٹیشن سے کال آئی۔ بھائی' ماموں اور کزنز وغیرہ جب گئے تو اس کی لاش ملی وہ بھی مٹی کے تلے۔ ہوا کچھ یوں کہ جب وہ گھر سے نکلا تو ایک شخص اس کے ساتھ لگ گیا۔ کزن پہلے ہی مدہوش تھا اس شخص نے اسے اغوا کیا اور اپنے اڈے پر لے جاکر زندہ ہی اس کے گردے اور آنکھیں نکال لیں اور لاش کو غازی بروتھا نہر میں پھینک دیا۔ اٹھارہ ستمبر کو لاش پانی سے نکالی گئی مگر ورثا کا علم نہ ہوپانے پر اٹک میں دفن کردی گئی۔ اتفاقاً ان کی نگاہ سے گمشدگی کی خبر گزری تو ماموں کو کال آئی۔ اٹھائیس تاریخ کو دوبارہ قبر کھولی گئی اور میرے عدنان بھائی نے قبر میں اتر کر سولہ دن پرانی گلی سڑی لاش قبر سے نکالی اور اپنے گاؤں لائے اور اپنے قبرستان میں دفن کردیا۔ اتفاقاً جب میں کھانا کھانے بیٹھی تبھی بھائی نے کزن کی وفات کی خبر اور مردے کی تصاویر مجھے دکھائیں بغیر آنکھوں اور خون میں لت پت پانی میں پھولی لاش نے پھر مجھے نہ کھانا کھانے کے قابل چھوڑا اور نہ ہی اگلے کئی دن سوسکی۔ اک خوف تھا میں نے گھر سے نکلنا بھی ترک کردیا۔ آپ بھی کہیں گے آج ذیشے تبصرہ کرنے کے بجائے کہانیاں سنانا شروع ہوگئی ہے۔ اب بات سے بات نکلی ہے تو آگے کا حال بھی سن لیجیے تاکہ بات مکمل ہوجائے۔ اٹک سائیڈ پر رہنے والے گاؤں جلال پور سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ وہاں سے ایک گروہ پکڑا گیا جو لوگوں کو زندہ باندھ کر ان کے گردے اور آنکھیں نکال کر پمز اسپتال میں فروخت کرتا تھا۔ بات بہت لمبی ہے ان شاء اللہ جلد اس پر کہانی لکھ کر بھجواؤں گی مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ کارروائی کرنے والے بھی مسلمان اور شکار ہونے والے بھی مسلمان۔ میرے کزن کے ساتھ شکار ہونے والوں کی داستان اس سے بھی زیادہ المناک ہے' دل کانپ اٹھتا ہے۔ میں تو اس قدر ڈر گئی ہوں کہ نانو کا وہ گاؤں

جہاں میری ایک عمر گزری ہے اب وہاں فیملی کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ نجانے کب کہاں سے کوئی آئے اور ہماری لاش اگلے دن نہر سے ملے۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ ان معصوموں کے لیے دعائے مغفرت ضرور کیجیے گا۔ کہانیوں پر تبصرہ بالکل نہیں کروں گی ارادہ تو تھا کہ بہت شگفتہ سا خط لکھوں گی مگر انجانے میں اک دکھی کتھا لے بیٹھی۔ اب آتی ہوں گفتگو کی طرف۔ اس بار صدارتی کرسی شہناز مما کے ہاتھ میں تھی ہاہاہاہا۔ ویسے لوگ جان گئے ہوں گے کہ شہناز مما کی کون سی بیٹی پیا دیس سدھارنے والی ہے ہوسکتا ہے کہ وہ میں ہی ہوں اور شہناز بانو آپ کو انکل اور اسد کو بہت بہت حج مبارک ہو۔ یاد ہے نا میں نے کچھ دعائیں کہی تھیں کعبہ کے سامنے کیجیے گا مجھے یقین ہے آپ نے ضرور دعائیں کی ہوں گی۔ آپ حج سے آجائیں تبھی میں شادی کروں گی یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ماں اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت نہ کرے؟ اور ہاں میں بہت خوش ہوں کہ شہرِ آزار مل گئی عمران بھیا کے پاس ہی تھی۔ ایویں مجھے چار پانچ ماہ پریشان کیے رکھا اور آپ کی ڈانٹ کھانے کے لیے یہ بھی بتادوں کہ میں نے ابھی تک گردش نہیں پڑھی۔ ویسے انعم اور امی بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ شہنی ارشاد پر رشوت کا الزام توبہ۔ جی یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ رشوت لیتی ہو؟ ویسے شہنی ارشاد نے ٹھیک کہا رسالے کی قیمت بڑھ ہی جانی چاہیے اس روز میں نے ایک رسالہ لیا 75 روپے کا...... تب نئے افق کی قدر آئی کہ اعزازیہ جب سے ملنے لگا ہے تب سے لیا ہی نہیں اور یہ بھی بتادوں کہ میں نے کہانی پر فاتحہ نہیں پڑھنی تھی بلکہ اپنے پورے رائٹنگ کیریئر پر فاتحہ پڑھ لینی تھی اور محض 4 ہی سال میں ناز سلوش نام کا سورج ابھر کر ڈوب جانا تھا۔ اچھا ہے آپ نے عبداللہ شاہد کو بتا دیا کہ مجھے لکھنا آتا ہے ویسے انہوں نے بھی ٹھیک کہا شروع میں مجھ میں اتنی پختگی نہیں تھی یہ تو قارئین کی محبت اور عمران بھیا کی عنایت ہے کہ میرے قلم کو اتنی استقامت بخشی۔ ریاض بٹ' سلام قبول کیجیے۔ اسے اتفاق کہہ لیجیے کہ جس جس خط میں' میں نے صرف آپ کو مخاطب کیا وہ ڈاک ردی کی ٹوکری کی نذر ہوگئی۔ خدا آپ کے مہروں کے درد کو شفا دے آمین۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میر پور میں فوٹو اسٹیٹ 3 سے 4 روپے فی صفحہ ہوگیا ہے اور کہانی لکھنے کا انداز آپ کو معلوم ہے میری کہانیاں اب ذرا طویل ہوتی ہیں اگر میں کاپی کروا بھی لوں تو فائدہ نہیں کیونکہ اول خرچ دگنا ہوجاتا ہے دوسرا کہانی چھپنے کے بعد کاپی شدہ مواد میرے کسی کام کا نہیں رہتا۔ عمران بھیا کو میں نے سب حالات بتائے ہیں۔ محمد فہد خدا آپ کو آپ کے امتحانات میں کامیاب کرے۔ میں لکھ تو ریگولر رہی ہوں مگر چھپنے کا جب وقت آتا ہے تب غیر حاضری لگ جاتی ہے۔ عالیہ انعام اتنے بڑے خط میں میرے لیے ایک لائن بھی نہیں بہت افسوس ہوا۔ ریاض حسین قمر' شکریہ کہ آپ نے مجھ ناچیز کو اتنا جانا۔ صدارتی کرسی کبھی کبھی ہاتھ لگتی ہے۔ سید عبداللہ شاہد جی تو بھائی صاحب اندازہ درست ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں۔ لو پھر بھی کوشش کرتی ہوں جو کام شروع کروں اسے مکمل بھی کروں۔ شہرِ آزار آپ سب کی دعاؤں سے مل گئی ہے جلد ہی نئے افق میں آپ اسے پڑھیں گے ہاہاہاہا۔ اس شریر اور الھڑ مزاج لڑکی کو خوش گلو طوطی کی مانند چہکنے اور پیارے پیارے خط لکھنے پر ماہنامہ ریشم میں ایوارڈ اور انعام بھی مل چکا ہے۔ اصل میں میرے قارئین ہیں ہی اتنے اچھے کہ بس الفاظ خود بخود ان کے لیے ذہن میں امڈتے چلے آتے ہیں۔ اس بار آپ میری نئی نظم پڑھ لیجیے۔ فقیر محمد بخش انکل شکریہ اور سلام۔ ابن مقبول انکل کو بھی سلام۔ لیجیے آپ نے کہا اور میں لکھنے کے لیے پھر حاضر ہوگئی۔ مجاہد ناز عباسی ''ان بارشوں سے دوستی اچھی نہیں فراز'' والا حساب آپ کے

ساتھ ہوگیا۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کی مشکلات میں آسانی فرمائے۔ جس طرح آپ کراچی گئے اور ڈر کر بھاگ آئے ہاہاہاہا۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا میں جب فروری میں بھائی کی شادی میں کراچی گئی تب بہن کے لیے ولیمے کا ڈریس لینے جامع بازار چلی گئی۔ میں' میری دوست اور بہن تینوں اکیلی تھیں اور کراچی میں نئی بھی۔ شاپنگ کرتے کرتے رستہ بھول یا بھٹک گئے۔ فون بھی گھر پر تھا ڈر کے مارے کسی سے رستہ بھی نہ پوچھا کہ وہ غلط ہی نہ بتادے۔ بس جی پھر جی بھر کر شاپنگ کی پورا بازار گھوما ہاں بس وہ چٹ پٹی چاٹ والا نہ ملا۔ ایک پان والے سے پان بنوائے اور اتنی دیر میں اس کا پورا انٹرویو لے ڈالا۔ پھر جب W-11 کے چکر میں روڈ پر کھڑے ہوئے تو کھڑے ہی رہے میری دوست نے تو کہا تم نے گم کروادیا نا۔ میں بھی کھڑی رہی خدا خدا کرکے بس آئی اور ہم کیماڑی پہنچے پھر امی سے جو عزت ہوئی اب وہ تو ہرگز نہیں بتاؤں گی ورنہ آپ ہنسیں گے۔ بس اب اجازت دیں اگلے ماہ پھر حاضری دوں گی۔ والسلام

ریحانہ سعیدہ...... لاہور۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم اب تو سلام کے فوراً بعد خیریت پوچھی جاتی ہے کیونکہ پاکستان کے حالات دن بدن اتنے غیر یقینی ہوتے جارہے ہیں کہ خیریت نام کا لفظ ختم ہوتا جارہا ہے کہیں وزیرستان میں قتل عام تو کبھی کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور پھر ہمارے میڈیا کی دو رخی پالیسی ایک ملالہ کا اتنا بڑا ایشو بنالیا اور ہزاروں لوگ جو روزانہ مر رہے ہیں اس کی پروا نہیں جبکہ ملالہ کے فادر امریکی ایجنٹوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب پاکستان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ چور مچائے شور کے تحت کوئی ایک ڈرامہ کرکے میڈیا کی توجہ اس طرف کرکے ملک کے بڑے بڑے مسائل کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ جامعہ حفصہ کے مدرسے میں شہید طالبعلم بھی اپنے گھر سے علم کے حصول کے لیے اس شہر ظلم میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن تب وہاں زخمی ہونے والوں کے علاج برمنگھم میں نہیں ہوئے کئی عورتوں کی عزت کی پامالی ہوئی ہے لیکن میڈل صرف مختاراں مائی کو ملا کیونکہ اسے این جی اوز نے پرموٹ کردیا۔ اب گستاخی رسول کے لیے شیطان پر لعنت ڈالنے کے لیے ریلیاں نکالی جارہی تھیں اور یہ ملالہ یوسف زئی کا قصہ ہوگیا جو باہر گئی اب الحمدللہ ٹھیک بھی ہے اور ایک ہفتہ میڈیا پر اس کے علاوہ کوئی خبر نہ تھی۔ خیر اللہ نے پاکستان مقدس رات یعنی 27 رمضان المبارک کو ہمیں تحفے کے طور پر دیا اور اللہ ہی اس کی حفاظت کرے گا کیونکہ ہمارے صاحب اقتدار تو بے غیرت اور بے حمیت لوگ ہیں اس لیے اللہ ہی معصوم عوام پر رحم کرے گا۔ خیر یہ تو تھے پاکستان کے حالات اب ذرا بات کرتے ہیں نئے افق کی تو جناب اتنا پیارا سرورق تخیلاتی سا اور ہم تو ویسے ہی رائل فیملی آف مغل سے تعلق رکھنے والے ہیں سو مجھے تو بہت متاثر کیا اس اونٹ اور ساربان نے اور پھر پس منظر بھی خوب صورت تھا۔ نئے افق میں لکھنے والے تمام لوگوں کی میں مشکور ہوں جو مجھے یاد بھی رکھتے ہیں پسند کرتے ہیں اور میری غیر حاضری کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ اللہ پاک آپ سب کو کامیابیاں دے۔ ''بلاوا'' کہانی دلچسپ تھی لیکن اس دفعہ اتنا سسپنس نہیں رہا۔ جناب خورشید اپنی گرفت کہانی پر مضبوط رکھیں۔ دوسری شادی کرنے والے لوگوں کے لیے ''منصوبہ'' اچھی کہانی ہے کہ جس سے شادی کرنی ہو اسے اپنے بچوں سے اس طرح متعارف کروائیں کہ وہ خود اپنے ابا جان کی شادی نئی ممی سے کروانے کے لیے خوشی خوشی تیار ہوجائیں۔ ورنہ پاکستان میں تو ''اے شادی نہیں ہوسکدی'' کا نعرہ لگتا ہے۔ ''انتخاب'' کوئی خاص نہیں لگی۔ ''گردش'' میں حشام کو مرنا نہیں چاہیے۔ نعمان صاحب نے بہت اچھی کہانی لکھی۔ واقعی مال اور اولاد

فتنہ و آزمائش ہے۔ اس میں ماں نے ایک بہترین کردار ادا کیا ہے۔ محمد اعظم خان نے ''نفرت'' بہت اچھے ٹاپک پر لکھی لیکن اختتام پر تو انہوں نے بھی اس بات کو سچ کر دیا کہ داڑھی والے دہشت گرد ہوتے ہیں عمر تو ٹھیک تھا لیکن باقی تین تو واقعی دہشت گرد ثابت ہوئے اس لیے مجھے اختتام پسند نہیں آیا۔ نوشاد علی نے آج کل خود غرض ہوتے ہوئے رشتوں پر ایک اچھی کہانی لکھی ہے کہ تقدیر بے سہارا لوگوں کا ایسے ہی ساتھ دیتی ہے کہ پیتل بھی سونا بن جاتا ہے۔ یہ تو خیر تھا ہی سونا۔ اے حمید صاحب کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ انہیں تو میں بچپن سے پڑھ رہی ہوں۔ آپ جیسی منظر کشی کرتے ہیں لگتا ہے کہ ہم خود بھی اس جگہ پر موجود ہیں۔ عبداللہ صاحب نے جس طرح ایلیٹ کلاس کو بے نقاب کیا ہے اور جس طرح مردان خان نے اپنا کردار نبھایا ہے وہ خوب ہے کیونکہ نسل در نسل گمراہی سے بہتر تھا کہ وہ انہیں ختم ہی کر دیتے جس طرح کہ امتیاز کریم کے باپ نے ان سے عہد لیا تھا کیونکہ انہیں بھی پوت کے پاؤں پالنے سے ہی نظر آ گئے تھے کہ پیسا کہیں ان کے بیٹے کو گمراہ نہ کر دے۔ خوش بو سخن میں سب کی کاوشیں اچھی تھیں۔ ان سیٹ پیج پر آزاد حسین آزاد کی نظم نے متاثر کیا۔ اسی طرح ذوق آ گہی میں ''آنکھوں والے اندھے'' نے بہت متاثر کیا۔ اب اجازت چاہوں گی۔ اللہ حافظ

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! اس میں آپ کا اور ہمارا کوئی قصور نہیں ہے قصور ہے صرف ہمارے حکمرانوں کا' ہمارے حکمران جب دن بدن امریکا کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھا رہے ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بس میں اتنا کہوں گا کہ ہمارے حکمران امریکی امداد کے بغیر ایک پل بھی نہیں جی پائیں گے۔ آپی شہناز بہت خوشی ہوئی یہ سن کر کہ آپ حج کا فریضہ سرانجام دے کر آئی ہیں اب آپ تو ماشاء اللہ حجن صاحبہ بن گئی ہیں آپ کو بہت بہت مبارک ہو آپی۔ شہنی ارشاد آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ اب ادارے کو رسالے کی قیمت بڑھا دینی چاہیے کیونکہ 40 روپے بہت کم قیمت ہے مارکیٹ میں جتنے بھی چھوٹے بڑے میگزین ہیں سب کی قیمت زیادہ ہے لیکن ہمارے نئے افق کا معیار سب سے بہتر ہے اس لیے ہم آپ کو کھلی اجازت دیتے ہیں کہ رسالے کی قیمت بڑھا دیں امید ہے تمام رائٹرز اور تمام نئے افق پڑھنے والوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ عصمت اقبال عین صاحبہ منگلا ڈیم (اتنا چھوٹا نام پلیز تھوڑا بڑھا لو) کیسے مزاج ہیں آپ کے اور یہ میں نے کیا سنا کہ آپ اتنی مصروف تھیں کہ آپ کو تھوڑا بھی ٹائم نہیں ملا گفتگو میں حاضری دینے کے لیے۔ مصروفیات تو سب کو ہیں لیکن ہم بھی تو تھوڑا ٹائم نکال لیتے ہیں پلیز آپ بھی آئندہ اپنی ساری مصروفیات کو چھوڑ کر اس محفل کی رونق بڑھاتی رہنا۔ انکل اسلم جاوید صاحب سدا خوش رہو ہمیشہ مسکراتے رہو۔ انکل میں آپ کی غزلیں اور بھی کئی رسالوں اور اخبارات میں پڑھتا رہتا ہوں انکل ایک اخبار فیصل آباد کا ہے امید ہے آپ کو ملا ہوگا اس میں آپ کی غزل شائع ہوئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے لڑکے کی تصویر کے ساتھ غزل شائع ہوئی ہے تو انکل وہ تصویر میری ہے آپ ایک بار غور سے ضرور دیکھ لینا۔ ریاض بٹ صاحب بہت دکھ ہوا یہ سن کر کہ آپ پچھلے 8 برس سے مہرے کی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ بٹ صاحب اگر آپ میرا ایک مشورہ مانیں تو ان شاء اللہ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ جون 2012ء کے شمارے میں میرا نمبر ہے آپ مجھے کال کرنا پھر آپ کو بتاؤں گا۔ فہد صاحب آپ نے تو صرف محفل گفتگو والوں کو سلام دیا ہے کیوں بھائی اگر ہم ایک بار غیر حاضر رہے تو ہمیں سلام بھی دینا گوارا

نہیں کیا۔ ویسے بھائی آپ کے لکھنے کا انداز بہت پسند ہے مجھے۔ عالیہ جی' بہن آپ دعا کیا کریں ان شاء اللہ بہت جلد کراچی کے حالات میں بہتری آئے گی۔ ریاض حسین قمر سلام! کیا حال ہے اور بہت شکریہ غزل پسند کرنے کا۔ سید عبداللہ شاہد صاحب آداب' دیکھو بھائی آپ نے حکم دیا اور ہم نے حاضری دے دی۔ انکل فقیر محمد بخش آپ سے تو ہمیشہ بہت ہی پیاری پیاری نصیحتیں ایس ایم ایس کے ذریعے ملتی رہتی ہیں۔ امید ہے ہمیشہ آپ کا ہاتھ یونہی ہمارے سر پر رہے گا۔ انکل بس اب آپ لوگوں کے پیار کی ضرورت ہے ماں کا پیار تو شروع سے ہی نصیب نہیں ہوا جب میں پیدا ہوا تھا تو میری امی کو اللہ تعالیٰ نے بلا لیا تھا یہاں تک کہ میں نے اپنی امی کی تصویر بھی نہیں دیکھی کیونکہ امی نے کبھی اپنی تصویر نہیں بنوائی تھی۔ بس ایک انجان چہرہ' دھندلا سا دل میں سمائے ہوئے ہے کہ امی ایسی تھیں۔ ابن مقبول جاوید صدیقی اور بشیر احمد بھٹی بھی محفل میں چار چاند لگائے ہوئے تھے۔ طاہر قریشی صاحب نے ہمیں اقراء کی تعلیم دی۔ سچی کہانیوں میں ''پچھتاوا'' طاہرہ جبین تارا ''نفرت'' محمد اعظم خان اور ''اصول پسند'' ریاض بٹ کی بہت پسند آئیں۔ مستقل سلسلے میں ہمیشہ کی طرح ''گردش'' بہت پسند آئی۔ ''بلاوا'' اور شب خون دونوں ناول بہترین تھے۔ خوش بو سخن میں شہنی ارشاد' ریحانہ سعیدہ' سید عبداللہ شاہد' پروفیسر واجد نگینوی' محمد فہد' ریاض حسین قمر' قدیر رانا کی غزلیں اور ناز سلوش ذشے کی نظم بہت اچھی تھی۔ ناز سلوش جی آپ کو تو میں بھول گیا تھا شکر ہے یاد آ گئی سلام قبول فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کہاں گم ہو گئی ہیں۔ ذوق آ گہی کا سارا انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال۔ ماہنامہ نئے افق نومبر 2012ء جس کا سرورق مصور صاحب نے بڑی محنت اور لگن سے سجا سنوار کر عید الاضحیٰ نمبر کے مطابق پیش کیا۔ جس کی سجاوٹ میں دف بجا کر پیش کرتے ہوئے سجے سجائے اونٹ کی مہار تھامے ہوئے برخوردار شان سے چلا جا رہا ہے کہ عید کا دن آنے والا ہے اور اسے گھر پہنچ کر سب کے ساتھ ساتھ ماہنامہ نئے افق کے اراکین کو عید مبارک کا محبت نامہ لکھنا ہے۔ فقیر کی طرف سے مصور' عمران احمد قریشی صاحب کو مبارک باد۔ اشتہارات کی مد میں ماہنامہ نے کوئی کامیابی کا میدان نہیں مارا وہی نتیجہ 2 فیصد رہا دستک' گفتگو' اقراء' ذوق آ گہی' خوش بو سخن' روحانی مسائل کے علاوہ سچ بیانیاں' مغرب سے انتخاب' ناول اور مستقل سلسلے سمیت کلیہ تعداد 19 رہی۔ ہر ایک لکھاری نے اپنے انتخاب میں موتی پرو کر پیش کیے۔ ''دستک'' بھیک مانگنے سے توجہ اور بھیک ملنے سے انکار ہمارے ملک کی بڑی کرسیوں پر سونے والوں کو جاگ اٹھنے کا سبق دے سکتی ہے اور پھر چاروں سے آواز آئے گی کہ جاگ اٹھا ہے پاکستان اور امداد کی ضرورت ہی نہ ہوگی اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور اس غلامانہ ذہن اور غلامی سے راہ نجات عطا فرمائے باقی قریشی صاحب ہم دعا کے طلب گار ہیں۔ ماہنامہ نئے افق میں تراش خراش ٹکڑوں کو بھی اس دفعہ کچھ نہ کچھ سجاوٹ دی گئی اور جو ٹکڑے دل کے اندر سما کر رہ گئے ان میں شامل یہ ٹکڑے سو فیصد ہیں۔ ''حرام کے مال کا اثر اولاد پر پڑتا ہے'' محمد ارشاد قریشی، اسلام آباد۔ آپ کا پیش کردہ اقتباس دل سے پسند آیا پر ساتھ ہی سوال ہے کہ جو کچھ آپ نے پیش کیا آپ نے کبھی خود بھی اس پر عمل کیا ہے۔ ''دیوالی کی صفائی'' صابرہ کلثوم لنگاہ آف خانیوال کی دل سے پسند کیا گیا مبارک باد صاحبزادی۔ ایم عثمان کیانی صاحب کی نظم بہت خوب صورت رہی۔ مبارک باد اور دعائیں پیش ہیں۔ آزاد حسین آزاد صاحب کی غزل جس کے شاعر بھی وہ خود ہیں بہت پسند آئی مبارک باد

اور دعائیں۔ محمد عبداللہ عاطر صاحب، منگلا کینٹ جگر مرادآبادی کی توبہ کو بار بار پڑھا گیا اور پسند کیا عید کی مبارک باد اور دعائیں۔ تنزیلہ ہاشمی جھنگ صدر کی نظم دل کو سمجھانے کے لیے ایک سبق ہے پسند کیا مبارک باد ودعائیں محترمہ۔ حاسد کا انجام محمد ندیم قابل سبق اقتباس تھا دل سے پسند کیا ہماری طرف سے مبارک باد اور دعائیں صاحبزادہ ندیم صاحب۔ یہ بہت کم تراش خراش کے ٹکڑے تھے مگر پھر بھی ان حصوں نے ماہنامہ سجا کر رکھ دیا۔ مبارک وشکریہ عمان احمد صاب اور دعائیں۔ ''اقرأ'' طاہر قریشی صاحب، دل سے پڑھی گئی۔ باقی فقیر لنگاہ وممبران لنگاہ کی طرف سے بہت بہت مبارک باد اور عید مبارک ہمارے لیے بھی دعائے خیر کر دیا کریں جناب عالی۔ ''روحانی علاج'' حافظ شبیر احمد صاحب مسائل کے حل قرآن مجید کی آیات اور مختلف سورتوں کی تلاوت کا سبق دے کر پیش کر کے مسلمان اسلام کی خدمت وعلاج کیا جاتا ہے واقعی قابل سبق ہے اگر وقت اور زندگی نے ساتھ دیا تو فقیر محمد بخش لنگاہ بھی آپ کے روحانی علاج سے فیض اٹھائے گا۔ خوش بو سخن قارئین بہن بھائیوں کا مقابلہ مصنف محترم عمر اسرار صاحب نے صدارتی کرسی کا اعزاز شہنی ارشاد صاحبہ کو دیا، مبارک باد قبول کریں۔ باقی مقابلہ میں شامل اجنبی شخص نظم سید عبداللہ شاہد صاحب، امکان صورت نظم ظریف احسن صاحب اور نظم ناز سلوش ذشے نے بہت خوب صورت انداز و بیان میں پیش کیں پسند آئی مبارک باد اور ریاض حسین قمر صاحب کی غزل ومحمد فہد کی نظم دل کو بھی دل سے پسند کیا گیا مبارک باد پیش ہے کے علاوہ باقی دوست بھی اچھے رہے فقیر کی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ذوق آگہی میں قارئین بہن بھائیوں کے انتخاب کو محترم عفان احمد صاحب نے سجا کر پیش کیا۔ صدارتی نمبر وسیم اختر نے حاصل کیا مبارک باد لیکن اعزازی نمبر آنکھوں والے اندھے بشیر احمد بھٹی نے میرے دل سے حاصل کیا مبارک باد پیش ہے۔ معلومات کی مد میں پروفیسر واجد نگینوی صاحب نے دل خوش کر دیا مبارک باد قبول کریں باقی دوست بھی اچھے رہے میری طرف سے سب کو مبارک باد ہو۔ ''گردش'' میں شہناز بانو نے ایکشن تیزی و میلان کو برقرار رکھا بہت خوب اگلی قسط کا انتظار رہے گا میری اور گروپ آف لنگاہ کی طرف سے ان موتیوں کی لڑیوں کو پرو کر پیش کرنے پر شہناز بانو کو مبارک باد اور ڈھیر ساری دعائیں۔ ''گنگا کا پجاری'' محترم اے حمید صاحب اللہ پاک انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے نے دل خوش کر دیا سطر سطر سسپنس کہ اب آگے کیا ہوگا اور اس طرح باقی آئندہ ماہ کا بورڈ تو جناب والا بشرط زندگی اگلی قسط کا انتظار کریں گے۔ فقیر کی دعائیں آپ کے اور ادارے کے نام ہیں۔ خورشید پیرزادہ صاحب کا ناول ''بلاوا'' مافوق الفطرت واقعات کو سطر سطر موتیوں کی طرح پرو کر رونگٹے کھڑے کر دینے اور سسپنس میں مبتلا کر دینے کا اعزاز حاصل کیا گیا ہے۔ محبت ونفرت اور قانون کے اس کھیل کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار کریں گے۔ عبداللہ شاہد کا ناول ''شب خون'' سبق آموز رہا۔ مبارک باد شاہد صاحب اور دعائیں ہر ماہ محفل کو سجایا کریں۔ باقی آپ کا گلہ حق بجانب نہ تھا فقیر تو یاد کرتا ہے جبکہ آپ خود بھول گئے ہیں آپ کی اگلی تحریر کا انتظار کیا جائے گا۔ سچ بیانیوں میں ''پچھتاوا'' طاہرہ جبیں تارا صاحبہ ''نفرت'' محمد اعظم خان ''اصول پسند'' ریاض بٹ صاحب ''تقدیر'' نوشاد عادل دل کی گہرائیوں سے پڑھا گیا۔ محبت، نفرت، قانون ولاقانونیت، سیاسی جوڑ توڑ پر مبنی ان سچ بیانیوں میں سبق در سبق موجود ہے اور دل کی آنکھوں سے پڑھنے والوں کے آنسو تک نکل آتے ہیں سب عزیز دوستوں کو فقیر کی طرف سے مبارک باد ودعائیں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت اللہ حافظ۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ اچھے عمران جی السلام علیکم! عید الاضحی کے موقع پر نئے افق کا تحفہ بھی مزہ دے گیا۔ ٹائٹل بے حد شاندار، سادہ بامعنی اور دل کو اچھا لگنے والا تھا۔ فہرست پر نظر ڈالی اور بے حد خوشی ہوئی کہ ایک عدد سچی کہانی کا بھی اضافہ ہوا شکریہ عمران صاحب۔ دستک حسب معمول انتہائی گہرائی لیے ہوئے تھی اور سوچنے کے لیے مواد تو ان حکمرانوں کے لیے ہے مگر ان کو اپنے اللوں تللوں سے فرصت ملے تو نا۔ جو کچھ بھی ہے نیچے تک عوام کو بھی اپنے آپ کو سدھارنے کے لیے دل سے کوشش کرنی پڑے گی۔ بات یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کا درمیانہ طبقہ حیثیت ریڑھ کی ہڈی جیسی ہوتی ہے اور ان حالات میں پس کر لوگ غربت کی لکیر سے نیچے چلے گئے ہیں۔ یعنی 13 فیصد مزید اور مڈل کلاس ہیں معاشرے کا توازن اور حسن برقرار رکھتی ہے اور معاشرہ واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم ہوتا دکھائی دیتا ہے اور لوئر کلاس اور دوسری اور کلاس اور یہی وجہ ہے کہ خوشیوں کی ریل پیل ختم ہوتی جا رہی ہے کہ مڈل کلاس تو سر دھڑ کی بازی لگا کر صبح سے رات تک روزی روٹی کمانے میں لگا ہے۔ بہر حال پروردگار ضرور اچھے سکون والے دن بھی لائے گا آمین ثم آمین۔ گفتگو میں عذاب قبر کی حدیث پڑھ کر ہمیں اور توبہ، تائب کرنی چاہیے اداریہ میں آخری پیرا آپ کی خواہش لگتی ہے مگر یہ ہر محب وطن کی دلی دعا ہے۔ خطوط میں سب سے پہلے سید عبداللہ شاہد کو جواب دوں گا اور نام بگاڑنے والی گھٹیا ترین حرکت نہیں کروں گا۔ تنقید صرف اصلاح کے لیے ہوتی ہے اور ادیب کے لیے ایک انمول تحفہ کہ بہتر سے بہتر لکھ سکے اگر کھوپڑی میں کچھ ہے تو نصیحت لے لو اور واضح کر دوں کہ ہماری عزیزہ بہن شہناز بانو حج پر جاتے جاتے تبصرہ لکھ کر آپ کے لیے بہترین عقل والی بات لکھ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہیں اور آگے چار لائنیں میرا ہی موقف واضح کر رہی ہیں۔ شہناز بانو بہن اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور حج بھی قبول فرمائے آمین۔ محترمہ شہناز بانو بہن جی بے حد شکریہ کہ ان الفاظ میں یاد رکھا۔ جی ہاں بیٹی جو بنی ہے میں کچھ کچھ تو سمجھ گیا مگر نام غائب کیا ہونا ہے تھوڑا مصروف ہو گیا ہوں مگر نئے افق سے رابطہ تو کبھی بھی نہیں ٹوٹے گا۔ حج کی بے حد مبارک باد میں پوچھ سکتا ہوں کہ ہم جیسے بھائی کو بھی دعائیں حج کے دوران۔ شہنی ارشاد بہن یاد رکھنے کا شکریہ مگر فہرست سے غائب کیوں؟ تبصرہ خوب تھا۔ ریاض بٹ جی یاد کرنے کا بے حد شکریہ اور آپ نے خلوص دل سے شعر بھی لکھ دیا مگر جانے دیں یہ عقل کے اندھے حاسد بن جاتے ہیں۔ آپ کی جاسوسی کہانی بے حد شاندار، گہرائی والی، خوب تحقیق لیے ہوئے اور پرانی ایسی کہانیوں کی یاد لیے ہوئے تھی کہ مزہ پر مزہ آ گیا۔ ہر ماہ آپ کی تازہ تحریر کا عادی ہو گیا ہوں۔ تبصرہ بے حد شاندار تھا۔ ارے ارے مجاہد عباسی آپ کراچی کیا لٹنے کے لیے گئے تھے۔ چلیے نئے افق کے دفتر کا دیدار تو ہوا مبارک باد۔ بشیر احمد بھٹی، ریاض قمر، محمد اسلم جاوید، عصمت اقبال اور عالیہ انعام صاحبہ کے تبصرے خوب تھے اور عالیہ صاحبہ تو حسب معمول زیادہ ہی گہرائی میں چلی گئیں۔ بہر حال خوب تبصرہ تھا۔ دوسرے محترم صابر لنگاہ کا طویل تبصرہ بھی مزہ دے گیا اور یاد رکھنے کا بے حد شکریہ۔ سچی کہانیوں میں اس دفعہ سب ہی معیاری اور ادبی قسم کی روداد لیے ہوئے تھیں۔ طاہرہ جبیں تارا بھی پچھتاوا کی صورت میں اہم ترین مسئلہ کو موضوع بنا کر لائی ہیں اور رشتوں کا تقدس بھی پامال ہونا شروع ہو گیا تو معاشرے کی اقدار کا کیا بنے گا؟ کہانی کو بڑے اچھے طریقے سے ٹریٹ کیا گیا۔ ویری گڈ قرابت میں انمٹ رشتہ بھی خالہ جیسی ہستیوں کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جب ایسے مقدس رشتوں کو اس

طرح پاؤں تلے روندے......؟ بے حد اچھی کہانی اور لقمان علی نے تحریر بھی زبردست کیا ہے معاشرے کے چہرے کے پیچھے نفرت جیسی ان گنت کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ نفسیاتی سلوک' بے گناہ کو پھنسانے' غلط لوگوں کی صحبت وغیرہ وغیرہ دہشتگردی کو ہی جنم دے گی نا۔ پھر عمر نے بہترین انتقام لیا۔ محمد اعظم خوب کہانی لائے ہیں اور بہتوں کے لیے ایک نصیحت اور اگر کوئی غلط راہ پر چل نکلا ہے تو ایک قسم کی وارننگ ہے کہ سنبھل کر زندگی کو گزارو۔ طویل کہانی کہیں بھی بور نہیں کرتی۔ خلیل جبار کا مقدمہ ایک ایسا مقدمہ ثابت ہوا جس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کے غضب اور انتقام سے نہ ڈرنے والوں کا انجام اتنا ہی جلدی اور بھیانک ہوا کرتا ہے یہاں تک کہ اللہ پھر اس وقت توبہ اور معافی کی بھی توفیق نہیں دیتا۔ بوڑھی عورت کے ساتھ اس قسم کے فراڈ اور پھر انتہائی ذلیل قسم کا سلوک ہونے پر اس عورت کی آہ و بکا بھی نہ ان کے دل پسیج سکی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے آمین۔ تقدیر (نوشاد عادل) انسانی رشتوں کی یہ بدنصیبی کو معاشرے کی ایک عام کہانی اور پھر انجام بھی زبردست اور سچے بندوں کی اللہ سنتا بھی ہے۔ لکھنے میں بھی نوشاد خوب لکھتے ہیں اور خوب کہانی کو نبھاتے ہیں۔ صورت سیرت' محمد سلیم اختر کی بڑی ہی پر درد اور قدم قدم پر دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی کہانی تھی۔ انجام پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی مبارک باد لیجیے' ہمارے جاسوس بھائی سوری جناب ریاض بٹ اصول پسند لے کر آئے ہیں اور خوب آئے ہیں۔ زبردست کہانی اور مزہ آ گیا جناب۔ بٹ صاحب آپ کی ایسی ہی کہانیاں قطار در قطار عمران جی کے پاس ہونا چاہیں تاکہ ہمیں ہر ماہ یہ پڑھنے کو مستقل ملتی رہیں۔ سلسلوں میں گردش' زبردست جا رہی ہے اور پہلے سے بھی بہتر ہو رہی ہے۔ اے حمید کی کہانی میں پڑھتا ہی نہیں۔ شہناز بانو بہن زبردست لکھاری ہیں۔ حج کے بعد بھی یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے۔ بدیسی کہانیوں میں راحیلہ تاج منصوبہ کی شکل میں اس معاشرے کی خوب صورت کہانی لائی ہیں۔ پڑھنے میں مزہ آیا۔ انجم فاروق ساحلی کی انتخاب (جس کا تذکرہ فہرست میں نہ ہو سکا) بھئی سیٹھ صاحب کو ٹھوکر لگی تو ہوش آیا مگر کیا یہ بدیسی کہانی ہے؟ آخر میں خورشید پیرزادہ کا بلاوا زیر مطالعہ ہے اور شب خون طویل کہانی عجیب تھی۔ شروع میں جب اصل معاملہ بہت بعد میں لکھا جانا تھا اس وقت تک چار پانچ افراد کا انتقال کروا دیا گیا۔ پھر اصل کہانی جب شروع ہوئی تو اتنے صفحے کہانی کو دادا' پردادا سے کیوں طویل کر دیا گیا۔ اس بیک گراؤنڈ میں جو وارداتیں اور کریکٹر سامنے آئے اس سے کیا واسطہ؟ کیا پھر اعجاز اکرم سے ہی یہ معاملہ غلط تھا پھر اچانک ان کے سگے پوتوں کو کیوں کریکٹر بتایا گیا؟ اور کیا لکھوں؟ اچھی کہانیوں کے شائق قارئین اس معاملہ کو سمجھنے کے بعد لکھ رہے ہیں تبصرہ۔ اقرأ تو جزاک اللہ خوب خدمت کر رہا ہے اور ہم سب کو نصیحتیں دل میں اتار لینی چاہیں۔ روحانی علاج خدمت خلق کر رہا ہے جزاک اللہ۔ خوش بو سخن میں آزاد نظموں میں شہنی ارشاد کی کاوش ٹاپ پر تھی۔ پھر ناز سلوش ذشے بہترین نظم لائیں اور ریحانہ سعیدہ خوب تھیں۔ غزلوں میں قدیر رانا ٹاپ پر تھے۔ ویری گڈ۔ میثم علی آغا خوب صورت جہیز لائے۔ باقی بھی نظمیں خوب تھیں۔ عمر اسرار بڑی محنت سے چناؤ کرتے ہیں۔ ہاں اس دفعہ اسرار احمد غائب ہیں اور ہمارے مدیر معاون اقبال بھٹی صاحب کی بھی کہانی غائب۔ صفحہ 51 پر ایم عثمانی کی کہانی بہت ہی بہتر رہی باقی آئندہ۔ اللہ حافظ۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! نومبر 2012ء کا نئے افق عیدالاضحیٰ کی خوشیاں دوبالا کرتا ہوا نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوا۔ کیا خوب صورت اور موقع کی مناسبت سے سرورق ہے' ڈیل

ڈن۔ اشتہار کو بغور اور محبت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ تو فہرست میں اپنی کہانی موجود پا کر عید کی خوشیوں اور مسرتوں کو چار چاند لگ گئے بہت شکریہ اور مہربانی۔ ''دستک'' میں مشتاق احمد قریشی صاحب امریکا اور یہودیوں کے چنگل سے رہائی کے متعلق بتا رہے تھے کیا کیا جائے ہمارے حکمران بے حس ہو گئے ہیں۔ ہمارا پیارا پاکستان قدرتی نعمتوں سے مالا مال ہے لیکن ہم دشمنوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اب بڑھتے ہیں اپنی پسندیدہ محفل کی طرف۔ عمران بھائی کے خیالات بہت ارفع اور اعلیٰ ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلا خط بہن شہناز بانو کا ہے۔ آپ کے خیالات اور سوچ اچھی ہے لیکن یہاں ان پر سوچنے والا کوئی نہیں ہے۔ صرف ہم جیسے لوگ ان باتوں پر کڑھ سکتے ہیں۔ صاحب اختیار اور دشمنوں کے آلہ کاروں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ اپنے گھر کو خود آگ لگا رہے ہیں۔ آپ کو حج مبارک ہو۔ یقیناً آپ نے ہمارے لیے بھی دعا کی ہوگی۔ باری تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے آمین ثم آمین۔ بہن شہناز بانو آپ کی کہانی ''گردش'' کی اس بار کی قسط جاندار ہے۔ بہن شہنی ارشاد آپ دل چھوٹا نہ کریں ہمیں تو آپ کی کہانیاں پسند آتی ہیں اور یہ احساس بھی ہے کہ عمران بھائی ہر کہانی میرٹ پر شائع کرتے ہیں۔ عصمت اقبال عین آپ نے بچپن کا جو واقعہ سنایا تھا اس کی وجہ سے ایک کہانی مجھے ادھوری چھوڑنی پڑی۔ مجاہد ناز عباسی اللہ آپ کی اور دوسرے سیلاب زدگان کی مشکلیں آسان کرے آمین ثم آمین۔ محمد فہد یاد کرنے کا شکریہ۔ عالیہ انعام بہن کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد حسب سابق لفظوں کی ایک حسین مالا سے مزین تبصرے کے ساتھ آئیں اور چھا گئیں۔ مجھے بھی اے حمید کی تحریریں بہت پسند ہیں۔ ''گنگا کا پجاری'' کے کیا کہنے۔ ریاض حسین قمر میرا تبصرہ اور شعر پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کیسے ہیں؟ میرا شعر پسند کرنے کا بہت شکریہ خدا آپ کو اور آپ کی فیملی کو سدا خوش و خرم رکھے آمین۔ جناب ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب واقعی پڑوسیوں کا حق بہت ہے لیکن آپ کو تو مجھ سے شکوہ ہی رہتا ہے میں اکثر راولپنڈی آتا رہتا ہوں لیکن آپ کا میرے پاس کوئی اتا پتا ہی نہیں ہے۔ اب بات ہو جائے باقی کہانیوں اور سلسلوں کی۔ ناول ''بلاوا'' اچھا جا رہا ہے۔ آخری صفحات پر عبداللہ شاہد کا ''شب خون'' ایک اصلاحی ناول ہے۔ انداز تحریر خوب صورت ہے۔ سچ بیانیاں سب اچھی ہیں۔ مغرب سے انتخاب میں ''منصوبہ'' اور ''قاتل خطوط'' پسند آئیں بہت خوب۔ خوش بو سخن میں شہنی ارشاد کی نظم' سید عبداللہ شاہد کی غزل' قدیر رانا' محمد فہد اور ارشد بخاری نمبر لے گئے۔ باقی انتخاب بھی اچھا ہے۔ ''ذوق آگہی'' میں آنکھوں والے اندھے اور احسان کی ترغیب پسند آئیں۔ صفحہ بہ صفحہ بکھری کترنیں بھی پرچے کی شان بڑھا رہی ہیں۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ خدا کرے ہمارا پیارا پرچہ یونہی دن دگنی رات چگنی ترقی کرے آمین۔ والسلام

اِقْرَأ

ترتیب: طاہر قریشی

توکل اور رضا بالقضا:۔

پس اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ جنت میں بے حساب جانے والے یہ بندگان خدا وہ ہوں گے جنہوں نے اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کر کے منتر اور شگون بد کے ان غلط طریقوں کو چھوڑ دیا۔

بعض لوگوں نے اس حدیث سے یہ سمجھا ہے کہ یہ لوگ اسباب کا استعمال مطلقاً ترک کر کے توکل کرنے والے ہوں گے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے اگر یہ مقصد ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی صراحت فرماتے، اس موقع پر اسباب میں سے صرف ان ہی دو چیزوں (منتر اور شگون بد) کے ذکر کرنے سے (جو کہ شریعت میں خود ہی ممنوع ہیں) صاف معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کا مطلب یہی ہے کہ یہ بندے وہ ہوں گے جو اپنے مقاصد اور ضروریات میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کی وجہ سے اور اسی کی مشیت اور اسی کے حکم کو اصل کارفرما اور موثر سمجھنے کے سبب سے ان اسباب کو استعمال نہیں کرتے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں

...... پس یہ حدیث خود ہی اس کی دلیل ہے کہ جو اسباب اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لیے اپنی حکمت سے مقرر فرمائے ہیں اور شریعت نے ان کی اجازت دی ہے ان کا ترک کر دینا توکل کا مقتضی نہیں ہے بلکہ صرف ان اسباب اور تدابیر کا ترک کرنا توکل کا اقتضا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور شریعت نے جن کو غلط قرار دیا ہے۔

البتہ توکل کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسباب کو بس ایک راستہ اور اللہ کی نعمت کا پردہ سمجھے اور دل کا تعلق بس اللہ ہی سے ہو اور یہی چیز متوکل اور غیر متوکل کے طرز عمل میں ایک محسوس فرق بھی پیدا کر دیتی ہے۔

اس حدیث میں جنت میں بے حساب داخل ہونے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کی تعداد ستر ہزار بتلائی گئی ہے، یہ تعداد صرف ان کی ہے جو اس فضیلت کے درجہ اول میں مستحق ہوں گے، ورنہ ایک دوسری حدیث میں یہ اضافہ بھی آیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ستر ہزار اور بھی بے حساب ہی جنت میں داخل کیے جائیں گے...... علاوہ ازیں یہ بات کئی دفعہ ذکر کی جا چکی ہے کہ عربی زبان اور محاورات میں یہ صرف کثرت اور غیر معمولی بہتات کے اظہار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس حدیث میں بھی غالباً ایسا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ حدیث صرف ایک پیشن گوئی اور آخرت میں پیش آنے والے ایک واقعہ کی صرف خبر ہی نہیں ہے بلکہ حدیث کا اصل منشاء یہ ہے کہ آپ کے جن امتیوں کو یہ حدیث پہنچے وہ اپنی زندگی کو توکل والی زندگی بنانے کی کوشش کریں تاکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت میں بے حساب داخل ہونے والوں کی فہرست میں ان کا نام بھی چڑھ جائے۔

ان تمہیدی سطروں کے بعد توکل اور رضا بالقضاء کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چند حدیثیں پڑھیے:۔

(۲۴۳)

(ترجمہ) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا، آپ ارشاد فرماتے تھے، کہ اگر تم لوگ اللہ پر ایسا توکل اور اعتماد کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو تم کو وہ اس طرح روزی دے جس طرح کہ پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح کو بھوکے اپنے آشیانوں سے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس آتے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ اگر بنی آدم روزی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر ایسا اعتماد اور بھروسہ کریں، جیسا کہ انہیں کرنا چاہیے تو اللہ کا معاملہ ان کے ساتھ یہ ہو کہ جس طرح وہ چڑیوں کو سہولت سے رزق دیتا ہے کہ انہیں آدمیوں کی سی محنت و مشقت کے بغیر معمولی نقل و حرکت سے روزی مل جاتی ہے، صبح کو وہ خالی پیٹ نکلتی ہیں اور شام کو پیٹ بھری اپنے آشیانوں میں واپس آتی ہیں، اسی طرح پھر اللہ تعالیٰ آدمیوں کو بھی سہولت سے رزق پہنچائے اور انہیں زیادہ کدو کاوش نہ اٹھانی پڑے جیسا کہ اب اٹھانی پڑتی ہے۔

(۲۴۴)

(ترجمہ) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہو سلم نے فرمایا کہ: آدمی کے دل کے لیے ہر میدان میں ایک شاخ ہے (یعنی ہر میدان میں آدمی کے دل کی خواہشیں پھیلی ہوئی ہیں) پس جو آدمی اپنے دل کو ان سب شاخوں اور خواہشوں میں لگا دے گا اور فکر کے گھوڑے ہر طرف دوڑائے گا تو اللہ کو پروا نہیں ہوگی، کہ کس وادی اور کس میدان میں اس کی ہلاکت ہو اور جو آدمی اللہ پر بھروسہ کرے (اور اپنی حاجتیں اس کے سپرد کر دے اور اپنی زندگی کو اس کا تابع فرمان بنا دے) تو اللہ تعالیٰ اس کی ساری ضرورتوں کے لیے کفایت کرے گا (اور اس کو دل کے اطمینان و سکون کی وہ دولت نصیب ہوگی جو اس دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے)

(تشریح) حدیث کا نفس مطلب ترجمہ کے ساتھ واضح کیا جا چکا ہے، حاصل اور اصل پیغام اس حدیث کا یہ ہے کہ بندہ اپنی ساری ضروریات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اس پر توکل اور اعتماد کرے اور اس کے احکام کا پابند ہو کر زندگی گزارے اور دنیوی ضرورتوں کے سلسلہ میں اپنی جدوجہد کو بھی اس کے احکام کے تحت کر دے پھر اللہ اس کے لیے کافی ہوگا اور وہی اس کی ضرورتیں پوری کرتا رہے گا۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)



قسط نمبر 4

بُلاوا

خورشید پیرزادہ

مافوق الفطرت واقعات، قصے کہانیاں اور ان پر بنائی جانے والی فلمیں تاریخ کے ہر دور میں انسانی ذہنوں پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر کہانی ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر کئی نئے موڑ لے کر آپ کو حیران کرے گی۔

نئے اُفق کے تجسس پسند قارئین کے لیے بطور خاص ایک سنسنی خیز ناول

"نیرو کو نظر بھر دیکھنے سے ہی میری تھکن اتر گئی یار۔" روہن نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے رویندر سے کہا۔

"تم تھکن اتارنے آئے تھے یا بات کرنے۔ اگر تو یونہی پچاس گز دور کھڑے ہو کر اس کے خود تیرے پاس چل کر آنے کا انتظار کرتا رہا نا تو اس جنم میں بھی بیچاری یونہی چلی جائے گی۔ میں نے کہا تھا نا کالج کے گیٹ پر کھڑا ہونے کے لیے تب تو تم ڈر گئے تھے۔" رویندر اس کو کھینچتے ہوئے گیٹ کی طرف لے گیا۔

"مگر یار یہ اچھا نہیں لگتا۔ سمجھا کر۔ اماں نے بولا ہے نا گوری کو وہ بات کرلے گی۔" روہن نے اسے واپس کھینچ لیا۔ "چل واپس چلتے ہیں۔"

......☆☆☆......

"ارے شینو تم اب آئی ہو۔ تمہیں کوئی پوچھ رہا تھا۔" ان کو دیکھ کر ایک لڑکی پاس آتے ہوئے بولی۔

"کون......؟ اور تم کلاس سے باہر کیا کر رہی ہو۔ کلاس میں نہیں گئیں کیا۔" نیرو نے سامنے سے آتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر پوچھا۔

"گئی تھی یار۔ صرف ایک منٹ لیٹ تھی۔ مس نے نکال دیا۔ تم بھی مت جانا۔ کوئی فائدہ نہیں ہے اب۔" لڑکی نے جواب دیا۔

نیرو اور ریتو کا منہ لٹک گیا۔ ساتھ والے پارک میں بیٹھتے ہی نیرو نے پوچھا۔ "کون پوچھ رہا تھا مجھے؟"

"پتہ نہیں یار۔ کوئی انجان لڑکی تھی۔ پہلے نیرو کر کے پوچھا۔ پھر شینو کر کے۔ نیرو بھی تمہارا ہی نام ہے کیا؟" لڑکی نے جواب دے کر سوال کیا۔

"نہیں۔ میرا نام شینو ہی ہے۔" نیرو نے کہتے ہوئے پوچھا۔ "کالج کی نہیں تھی کیا؟"

"کالج کی ہوتی تو میں پہچان نہ لیتی۔ کوئی باہر سے آئی تھی۔ تمہارا گھر بھی پوچھ رہی تھی۔ میں نے بتا دیا۔ شاید اس شہر کی ہی نہیں تھی وہ۔"

"کون ہو سکتی ہے؟" نیرو دماغ پر زور دے کر سوچنے ہی لگی تھی کہ ایک اور لڑکی سامنے سے ان کی طرف آ رہی تھی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو سونا۔ کیا حال ہیں؟" ریتو اور نیرو نے لگ بھگ ایک ساتھ ہی پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ وہ ملی کیا۔" سونا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون؟" ریتو نے پوچھا۔

"پتہ نہیں ایک خوب صورت سی لڑکی صبح صبح شینو کو پوچھتی پھر رہی تھی۔" سونا نے جواب دیا۔

نیرو اپنی انگلی کو دانتوں تلے دبا کر ناخن کترنے لگی اور اپنی آنکھوں کو سوچنے کے انداز میں سکیڑ لیا۔

"حد ہے یار۔ کون ہو سکتی ہے؟"

"تم چھوڑو نا۔ جو کوئی بھی ہوگی۔ گھر کا پتا چل گیا ہے نا اسے۔" ریتو نے نیرو کے سر پر ہاتھ مارا۔

"شینو ذرا ادھر تو آنا۔" کالج کے اندر کی طرف سے آتی ہوئی شلپا نے ان سے تھوڑا دور کھڑے ہو کر نیرو کو پکارا۔

"آ رہی ہوں۔" نیرو نے کاپی کتاب اٹھائی اور شلپا کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ "اب تم بھی یہ مت کہنا کہ مجھے کوئی ڈھونڈ رہی تھی۔"

"ہاں۔ مگر تمہیں کیسے پتا؟" شلپا نے پلٹ کر کہا۔

"بس پتا لگ گیا۔ ہر کسی سے اس نے یہ بات پوچھی ہے شاید۔ چلو چھوڑو۔ کوئی اور بھی کام تھا کیا؟"

"ہاں۔ تمہارے پاس وقت تو ہے نا۔" شلپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ہاں بول۔ یہ پیریڈ تو خالی ہی سمجھ۔" نیرو نے کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"تمہارا نام نیرو بھی ہے نا۔" شلپا نے یہیں سے بات شروع کی۔

"کتنی بار کہوں یار کہ کوئی مجھے نیرو نہ کہا کرو۔ میرا نام شینو ہے شینو۔" نیرو چڑ سی گئی۔

"غصہ کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں پسند نہیں ہے تو اپنی کاپی پر کیوں لکھا ہوا ہے۔" شلپا نے کاپی پر لکھے نام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ...... یہ کس نے لکھ دیا؟" نیرو نے جھٹ سے پین نکالا اور نام کو مٹانے لگی۔ "میرے ساتھ ایسا مذاق مت کیا کرو یار۔"

"میں نے کیا کیا ہے شینو۔ میں نے تو صرف لکھا ہوا دکھایا ہے۔ لڑکی بھی پہلے نیرو ہی پوچھ رہی تھی۔ جب میری سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے شینو کہا۔ تمہارا گھر پوچھ رہی تھی۔ مگر مجھے پتا ہی نہیں تھا۔ خیر مجھے تم سے کوئی اور بات کرنی ہے۔" شلپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے ایک کونے میں ایک ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بولو۔" نیرو کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

"دیکھو مجھے پتہ ہے تمہیں یہ سب پسند نہیں ہے۔ پھر بھی سن لینا پوری بات۔ بیچ میں اٹھ کر مت بھاگنا۔" شلپا نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ بولو نا۔" نیرو نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ...... وہ...... بات یہ ہے کہ کوئی صرف تمہارے لیے سینکڑوں میل دور سے آیا ہے۔ صرف تمہارے لیے۔ پوری بات سن لوگی نا؟"

"کون آیا ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم۔ اب پہیلیاں مت بجھواؤ، جو بولنا ہے ایک ساتھ بول دو۔" نیرو بات جاننے کے لیے بے چین سی ہو گئی۔

"روہن! وہ بہت پیار کرتا ہے تم سے...... سن تو لو......" نیرو یہ بات سن کر اٹھ کے بھاگنے ہی والی تھی کہ شلپا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تم پوری بات سن لینا ایک بار۔ پھر جو تمہاری مرضی۔"

"کوئی اور بات کرو۔ مگر یہ بکواس باتیں مجھے پسند نہیں۔ کیا ہوتا ہے یہ پیار و یار۔ سیکڑوں میل دور سے کسی کو مجھ سے پیار ہو گیا۔ اس کو کوئی خواب آیا تھا کیا میرے بارے میں۔" نیرو نے تنک کر پوچھا۔

"ہاں۔ اسے تمہارے خواب ہی آتے ہیں۔ تبھی تو آیا ہے وہ یہاں پر۔ پتا ہے کہ تمہیں یہ سب اچھا کیوں نہیں لگتا۔ اس لیے کہ تمہارے سینے میں دل نہیں ہے۔ اس لیے۔" شلپا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میرے سینے میں دل نہیں ہے۔ کیا مذاق ہے یار۔ پھر میں زندہ کیسے ہوں۔ یہ کیا دھڑک رہا ہے میرے سینے میں۔" نیرو نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر

اپنی دھڑکن کو محسوس کیا۔ "آج تو فرسٹ اپریل بھی نہیں ہے۔ پھر کیا ارادے ہیں تمہارے۔" نیرو اب تک ہنس رہی تھی۔

"تم میری بات کو سیریس کیوں نہیں لے رہی ہو؟" شلپا نے نیرو کے دونوں شانے پکڑتے ہوئے کہا۔

"یار کیا سیریس لوں تیری باتوں کو۔ کون سی صدی میں جی رہی ہو تم۔ اب بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ میرے سینے میں دل نہیں ہے۔ سینکڑوں میل دور بیٹھے کسی آدمی کو میرے بارے میں خواب آتے ہیں۔ اس کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ ہونہہ۔" نیرو اس کی باتوں سے چڑتی ہوئی بولی۔

"یار میرا مطلب احساسات سے ہے۔ تم ایک بار اس سے مل لو بس۔ تمہیں سب سمجھ میں آجائے گا۔" شلپا نے زور دے کر کہا۔

"کس سے مل لوں۔ کہاں مل لوں۔" نیرو نے بے بسی سے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ ایک بار کالج کے گیٹ تک آؤ۔" شلپا نیرو کو اٹھا کر تقریباً زبردستی کھینچتی ہوئی کالج کے گیٹ پر لے آئی۔ نیرو نے جیسے ہی روہن اور رویندر کو اپنی طرف آتے دیکھا وہ سن سی ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر واپس بھاگتی ہوئی اندر آئی اور زور زور سے ہنسنے لگی۔

"کیا ہوا۔ تم بھاگ کیوں آئیں۔" شلپا اس کے پیچھے پیچھے آئی اور غصے سے اس کو دیکھنے لگی۔

"یہ۔" نیرو اب بھی زور زور سے ہنس رہی تھی۔ "ان کو آتے ہیں میرے خواب۔ ارے تمہیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔ ان کو ہم بس میں ملے تھے۔ کراچی سے آتے ہوئے۔ تب سے پیچھے پڑے ہیں۔"

.......☆☆☆.......

"کیا ہوا۔ اس سے بات ہوئی کیا؟" امان گھر پر جیسے روہن اور رویندر کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ "بات بنی یا نہیں۔"

روہن نے صوفے پر لیٹتے ہوئے نا میں سر ہلا دیا۔

"گیٹ تک آئی تھی۔ واپس بھاگ گئی۔ ایک اور لڑکی تھی اس کے ساتھ۔" روہن نے سیدھا لیٹتے ہوئے کشن پر سر ٹکا دیا۔

"میں نے تو بولا اس کو۔ سیدھی بات کرنی چاہیے تھی۔ جناب تو گیٹ کے پاس کھڑے ہونے سے بھی ڈر رہے تھے۔ ایسے بات تھوڑے ہی بنتی ہے یار۔" رویندر غصے سے بولا۔

امان رویندر کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "بن جائے گی۔ مگر صبر تو کرنا پڑے گا نا۔ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہونے والا۔ ایک منٹ۔ میں گوری سے بات کرتا ہوں۔" امان نے فون نکالتے ہوئے کہا۔ "ہیلو۔"

"ہاں امان بولو۔" دوسری طرف سے گوری کی آواز آئی۔

کیا رہا؟ کیا بات ہوئی شینو سے۔" امان سیدھے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔

"وہ میں آج کل کالج نہیں جا رہی۔ میں نے شلپا کو بولا تھا بات کرنے کے لیے۔ سب سمجھا بھی دیا تھا اس کو۔ اس کا نمبر دیتی ہوں تم ابھی اس سے بات کرلو۔" گوری نے جواباً کہا۔

"ہوں۔ لاؤ دو نمبر۔" امان نے کہتے ہوئے نمبر نوٹ کرنے کے لیے روہن کا فون اٹھا لیا۔ گوری نے امان کو شلپا کا نمبر لکھوا دیا۔

"ایک منٹ امان! سنو اس بات کے لیے سمیر فون نہیں کرسکتا کیا شلپا کو۔"

"ہاں اس سے بھی کروا سکتا ہوں۔ مگر کوئی خاص وجہ ہے کیا۔" امان نے پوچھا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔ وہ۔ وہ اس سے بات بھی کرنا چاہتی ہے۔" گوری نے ٹالتے ٹالتے بھی بات کہہ ہی دی۔

"ٹھیک ہے میں ابھی اس کو بول دیتا ہوں۔ وہ بات کر لے گا شلپا سے۔" امان مسکرایا اور فون کاٹ دیا۔

"میں سمیر کو لے کر آتا ہوں۔ شلپا نے بات کی ہے نیرو کے ساتھ۔ وہی بتائے گی کیا پوزیشن ہے۔" امان یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

.......☆☆☆.......

"کیا بات ہے بے۔ تم سیٹنگ کر بھی آئے اور مجھے بتایا تک نہیں۔" امان نے دوسرے کمرے میں گھستے ہی بستر پر سوئے ہوئے سمیر کو پکڑ کر زور سے ہلایا۔

سمیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ "کیا...... کیا ہوا؟"

"لو۔ یہ لو تمہاری شلپا کا نمبر اس کو تم سے بات کرنی ہے۔ اور ہاں۔ یہ پوچھنا مت بھولنا کہ نیرو کا کیا رسپونس رہا۔" امان نے سمیر کا فون اٹھا کر شلپا کا نمبر ڈائل کیا اور فون سمیر کو پکڑا دیا۔ سمیر نے فون کاٹا اور امان کو گھورنے لگا۔

"جا رہا ہوں بھئی۔ کرلو اکیلے اکیلے میں باتیں۔" امان ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

شلپا کے بارے میں سوچتے ہی سمیر کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ آخر کیا بات کرنی ہے اس کو۔ سوچتے ہوئے سمیر نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ری ڈائل کر کے فون کان سے لگا لیا۔

"ہیلو۔" شلپا کی میٹھی سی آواز فون پر ابھری۔

"ہائے شلپا۔" سمیر نے شلپا کا لفظ لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں سمیر۔"

"اوہ۔ ہائے۔ آپ کے پاس میرا نمبر کہاں سے آیا۔" شلپا کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"مجھے تو یہی بتایا گیا ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی خاص باتیں کرنی ہیں۔ اس لیے میں تو سمجھا کہ آپ نے ہی دیا ہوگا۔" سمیر نے آرام سے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو' میں نے تو کوئی' مطلب؟ مجھے تو۔" شلپا نے کئی طرح سے اپنی بات پوری کرنے کی کوشش کی۔ مگر کر نہیں پائی۔ کینٹین کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو یوں دیکھنے لگی جیسے سمیر اسے دیکھنے ہی آ رہا ہو۔

"پھر تو سوری کہ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گا۔" سمیر نے اس کی نا سن کر روٹھ جانے کا ناٹک کیا۔

"نہیں...... نہیں...... میرا مطلب تھا...... ہاں...... مجھے...... مجھے کرنی تھی بات...... وہ۔" شلپا کے منہ سے بے تکے جملے نکل رہے تھے۔

"وہ کیا۔" سمیر مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ۔ تم واپس کب جا رہے ہو؟" شلپا کو اور کچھ سوجھا ہی نہیں۔

"کہو تو آج ہی واپس چلا جاتا ہوں۔" سمیر نے آنکھیں بند کر کے شلپا کا سلونا چہرہ یاد کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ۔" شلپا پھر رک گئی۔

"بولو بھی اب۔ بول بھی دو یار۔" سمیر کے دماغ پر مستی سوار ہو رہی تھی۔

"کک کیا۔" شلپا ہڑبڑاہٹ کے ساتھ بولی۔

"اور کچھ نہیں تو آئی لو یو ہی بول دو۔" یہ کہتے ہوئے سمیر ہنسنے لگا۔

"کیسے...... مطلب۔" شلپا کی حالت فون پر ہی خراب ہو گئی۔

"مطلب میں ہی الجھی رہو گی یا کوئی کام کی بات بھی کرو گی۔" سمیر نے پھر اس کو چھیڑا۔

"کیا بات...... کرنی ہے؟ میری سمجھ میں نہیں

آ رہا۔" شلپا کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے اور کیا نہیں۔

"ارے وہی یار۔ وہ نیرو نے کیا جواب دیا۔ روہن کے بارے میں۔" سمیر کے اس سوال کو سنتے ہی شلپا کا دھیان خود پر سے ہٹ کر نیرو پر چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ سنبھل بھی گئی۔

"اوہ۔ بہت مشکل ہے سمیر۔ میں نے اس کو سمجھانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا مگر اس سے اس بارے میں بات کرنا ہی بیکار ہے۔ پہلی بات تو وہ مانتی ہی نہیں کہ پیار محبت جیسی کوئی چیز بھی موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ روہن کے بارے میں وہ سمجھتی ہے کہ وہ بس میں ملنے کے بعد سے ہی اس کے پیچھے پڑا ہے۔ خواب والی بات اس کو ڈرامے سے زیادہ کچھ نہیں لگی۔"

"تمہاری طرف سے کچھ امید ہے بھی یا نہیں؟" سمیر نے بھی سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ اس پر کوئی اثر ہوگا۔ مگر تم کہو تو میں ایک بار اور کوشش کروں۔" شلپا نے سمیر کی بات کو توجہ سے سنتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ابھی رہنے دو۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں بتا دوں گا۔ بائی دی وے شکریہ اس بات کے لیے۔"

"یہ کیسی بات کر رہے ہو۔" شلپا نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ سمیر نے جان بوجھ کر فون کاٹ دیا۔

اس کو یقین تھا کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو ریٹرن کال ضرور آئے گی اور اس کا یقین صحیح نکلا۔

"فون کیوں کاٹ دیا تھا۔" شلپا نے شکایتاً کہا۔

"میں سمجھا بات پوری ہوگئی ہے۔ سوری۔" سمیر نے کہا۔

"نہیں...... ہاں...... میرا مطلب تھا کہ۔" شلپا پھر اٹکنے لگی۔

"کیا بات ہے۔ بولو بھی۔"

"وہ ایک بار مل سکتے ہو کیا؟" شلپا نے گھبراہٹ میں جلدی سے کہا اور جواب کو دل کی گہرائی تک اتارنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"ہاں کیوں نہیں۔ مگر کہاں؟" سمیر کا دل مچل اٹھا۔

"کہیں بھی۔ جہاں تم کہو۔" شلپا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

"اوکے ٹھیک ہے میں بعد میں فون کر کے بتاتا ہوں اور کچھ۔" سمیر نے فون کو چومتے ہوئے کہا۔ شلپا کو بھی اپنے کان میں چومنے کی آواز سنائی دی۔

"آئی لو یو۔" شلپا نے جھٹ سے کہا اور جواب سننے سے پہلے ہی فون کاٹ دیا۔

......☆☆☆......

"امی کوئی لڑکی آئی تھی کیا۔" نیرو نے گھر کے اندر گھستے ہی دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔ کسی کو آنا تھا کیا۔" امی نے پلٹ کر پوچھا۔

"نہیں۔ مگر کالج میں کوئی مجھے پوچھ رہی تھی۔ اس لیے۔" نیرو نے روانی میں جواب دیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"ارے کھانا تو کھا لو بیٹی۔ تم صبح بھی ایسے ہی نکل گئی تھیں۔" امی نے نیچے سے آواز لگائی۔

"آ رہی ہوں امی۔ ذرا کپڑے بدل لوں۔" نیرو نے جواب دیا اور اوپر کمرے میں گھس گئی۔

اندر گھستے ہی اس کی نگاہ میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذ پر جا کر جم گئی۔ اس نے جلدی سے کاغذ اٹھایا اور یونہی پڑھنے لگی۔ مگر جیسے جیسے وہ پہلی لائن سے دوسری اور دوسری سے تیسری لائن پر پہنچی۔ اس کے ہاتھ پیر جمنے لگے اور وہ اس میں لکھے الفاظ کے جال میں الجھتی چلی گئی۔

"نام بدل لینے سے تقدیر نہیں بدل جاتی نیرو اور خاص طور پر تب' جب تقدیر کی وہ گھڑی صدیوں پرانی محبت کا گلا گھونٹ کر ایک دوسرے کے لیے پیاسی دو روحوں کے ایک ہو چکے لہو میں ڈبو کر ساتویں آسمان سے بھی اوپر لکھی گئی ہو۔" نیرو اچنبھے سے کاغذ کے اس ٹکڑے کو دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے نیچے کی طرف بھاگی۔

"امی کون گیا تھا اوپر۔ کون آیا تھا گھر میں۔" نیرو کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

"بتا تو رہی ہوں۔ کوئی نہیں آیا۔ میں تو صبح سے ہی یہاں ہوں۔ کیا ہو گیا۔" امی نے بے فکری والے انداز میں بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔

بنا کچھ بولے ہی نیرو باہر نکلی اور دوسری گلی پر لگے گیٹ کی کنڈی دیکھی۔ مگر وہاں تو تالا لگا ہوا تھا۔

"ان کی اتنی ہمت ہو گئی کہ دیوار پھلانگ کر چوروں کی طرح گھر میں گھسنے لگے ہیں۔" بڑبڑاتی ہوئی نیرو نے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور ڈسٹ بن میں پھینک دیئے پھر واپس اوپر چلی گئی۔

......☆☆☆......

"کک کون ہے۔ کون ہے؟" نیرو باتھ روم کے دروازے کے سامنے کھڑی ڈر کے مارے سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگی۔ دروازے کو دوبارہ چھو کر دیکھنے کی اس کی ہمت تک نہیں ہوئی۔ "امی ی ی ی ی۔" اچانک نیرو کی چیخ سے پورا گھر دہل گیا۔

نیرو کی چیخ سن کر امی بدحواسی میں دوڑی دوڑی اوپر آئی تو دیکھا کہ نیرو باتھ روم کے دروازے کے ساتھ کھڑی کانپ رہی ہے۔

"کیا ہوا شینو! کیا ہوا بیٹی؟" کسی انہونی کے خیال سے اوپر دوڑی آنے والی امی کو جب نیرو صحیح سلامت کھڑی نظر آئی تو ان کو تھوڑی تسلی ہوئی۔ پاس آتے ہی انہوں نے نیرو کو بانہوں میں لے کر خود سے چپکا لیا۔

"وہ...... وہ...... باتھ روم میں کوئی ہے۔" نیرو امی سے چپکی ہوئی بولی۔

"چپ کر۔ ڈرپوک کہیں کی۔ کون ہوگا۔" کہتے ہوئے امی نے زور سے دروازے کو اندر دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔

"دیکھو۔ کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

"مگر کوئی تھا امی۔ یہاں ضرور کوئی آیا تھا۔ دروازہ بھی نہیں کھلا تھا ابھی۔" نیرو نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر باتھ روم کے اندر جھانکا۔

"پاگل۔ تمہیں پتا تو ہے کہ دروازہ تھوڑا جام ہے۔ کچھ زور لگانے سے کھلتا ہے۔ چلو جاؤ۔ کپڑے بدل لو۔ میں تمہارے ساتھ ہی نیچے چلوں گی۔" امی نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں نیچے ہی بدل لوں گی۔ چلو۔" اپنے کپڑے اٹھا کر نیرو امی کے ساتھ نیچے چلی گئی۔

......☆☆☆......

"امی۔" نیرو نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ بولو۔"

"میرا نام پہلے نیرو تھا نا۔"

"بلاوجہ پرانی باتیں کیوں دوہرا رہی ہو۔ تمہیں منع کیا ہے نا کسی کو بھی وہ نام بتانے سے۔" امی نے تھوڑا نروس ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کسی کو نہیں بتایا امی۔ لیکن پھر بھی۔ بتائیے نا۔ آپ سب کو کیوں اس نام سے الرجی ہے۔" نیرو کے دل میں رہ رہ کر کاغذ پر لکھے الفاظ کوند رہے تھے۔

"کہہ دیا نا کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیں وہ نام پسند نہیں تھا بس۔ تمہارا نام شینو ہی ہے۔ اور کچھ نہیں۔ اب بے سروپا باتیں چھوڑو اور کھانا کھا کر پڑھائی کر لو

۔"امی نے کہا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ مگر اس سے نیرو کی بے چینی کم نہیں ہوئی۔ الٹا نام کے پیچھے چھپی سچائی جاننے کے لیے اس کی جستجو اور بڑھ گئی۔ ریتو کے آنے کے بعد دونوں پڑھنے کے لیے اوپر چلی گئیں۔

......☆☆☆......

رات کے تقریباً بارہ بجے ریتو نے کتابیں بستر کے ساتھ لگی میز پر رکھ کر لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹے اسے مشکل سے آدھا گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اچانک کمرے میں کسی کی موجودی کا احساس کر کے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی کے سامنے کمرے میں ایک سایہ ابھر آیا تھا اور اس کے پیچھے روشنی کا ایک ہالہ سا تھا اس لیے وہ سائے کے لہراتے ہوئے کپڑوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں دیکھ پائی۔ نیرو ڈر کے مارے اتنی سہم گئی تھی کہ اس کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ بستر پر بیٹھ کر نیرو پیچھے دیوار سے چپک گئی۔ وہ کچھ سمجھ پاتی اس سے پہلے ہی سائے نے بولنا شروع کر دیا۔

"گھبراؤ مت نیرو۔ تمہیں کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔ نا ہی میرا مقصد تمہیں ڈرانا ہے۔ تمہیں لگ رہا ہوگا کہ تم جاگ رہی ہو۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ درا صل میں تمہارے خواب میں ہوں۔ ہاں۔ تم خواب ہی دیکھ رہی ہو۔ اب میری باتیں دھیان سے سننا۔ میرا مقصد صرف تمہیں تمہاری حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔ ایسی حقیقت جس کو سن کر تمہاری آنکھیں بھر آئیں گی۔ تم چاہو تو مجھ سے سوال بھی کر سکتی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟"

"آں...... ہاں۔" نیرو کے ماتھے پر پسینہ چھلک آیا۔ اس کے پاس ہاں بولنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"ایک لڑکی تھی پریا درشنی اور ایک لڑکا تھا دیو...... دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے محبت بھی ایسی کہ مر کر بھی ان کی روحیں ایک دوسرے کے لیے تڑپتی رہیں...... جنم جنم...... پریا کا پیار آج بھی اپنے دیو کا انتظار کر رہا ہے اور دیو کو اپنی پریا کی تلاش میں در در بھٹکنا پڑ رہا ہے دیو کی تلاش آخر کار پوری ہوئی اس کو پتا چل چکا ہے کہ اس کی پریا اس جنم میں کون ہے مگر پریا کا دل اس جنم میں اس کی روح کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے پیار کو نہیں پہچان پا رہی تم سن رہی ہو نا؟"

"ہاں ہاں۔" بڑی مشکل سے نیرو کے گلے سے آواز نکل پائی۔

"تمہیں پتا ہے وہ دونوں کون ہیں؟" سائے نے پھر سوال کیا۔

"نن...... نہیں۔" نیرو ایک دم سمٹتی ہوئی بولی۔

"جاننا نہیں چاہو گی؟"

"نہیں...... م م م...... ہاں۔" نیرو کی دھڑکنیں دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔

"تو سنو! اس جنم میں اس لڑکے کا نام روہن ہے اور لڑکی کا نام ہے نیرو۔ یعنی تم۔" کہہ کر سایہ نیرو کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

نیرو کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل پایا۔ ساتھ رکھی میز پر اس کا ہاتھ کچھ ڈھونڈنے لگا۔

"تم سن رہی ہو نا۔" سائے کی آواز کمرے میں گونج اٹھی۔

نیرو نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ پیپر ویٹ ہاتھ میں آتے ہی اس نے زور سے اس کو سائے کی طرف دے مارا۔ نشانہ ایک دم ٹھیک تھا مگر سایہ نیرو کے ہاتھ کی حرکت دیکھ کر سنبھلتے ہوئے ایک طرف کو جھک گیا۔ اور آواز اس کے پیچھے سے آئی۔

"اوئے ماں...... مار ڈالا رے۔" ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری اور وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا۔ شاید یہ نیرو کے گھوم کر اپنا سر پکڑ کر بیٹھے آدمی پر جھکا اور زبردستی اس کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"جلدی بھاگ یار! ورنہ پھنس گئے سمجھو۔"

"ابے تجھے بھاگنے کی پڑی ہے۔ یہاں سر پھٹ گیا ہے میرا۔ رک ایک منٹ۔ بیچ میں پردہ نہ ہوتا تو میں تو گیا تھا کام سے۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

نیرو کو آواز جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ اس نے ہمت دکھاتے ہوئے جھٹ سے لائٹ آن کر دی۔

"تم......" نیرو نے اپنی آواز کو بڑی مشکل سے دباتے ہوئے کہا۔

روہن اور رویندر دونوں اس کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ حیران پریشان نیرو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے اور کیا نہیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے بستر کے پاس کھڑی انہیں گھورتی رہی۔

آخر کار یہ خاموشی روہن نے ہی توڑی۔

"تمہارا ہی پلان تھا نا یہ۔ اب بھگتو۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے نیرو کو پل بھر کے لیے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

نیرو بس خاموشی سے کھڑی انہیں گھورتی رہی۔ پیپر ویٹ اگرچہ سیدھا رویندر کے سر پر نہیں لگا تھا۔ پھر بھی پیپر ویٹ کے آدھے سائز کا گومڑ اس کے سر پر ابھر آیا تھا۔

رویندر اپنا گومڑ سہلاتا ہوا روہن پر برس پڑا۔ "ابے ایسے کرتے ہیں کیا بھوتوں کی ایکٹنگ تم تو ایسے بول رہے تھے جیسے کسی اسٹیج پر ڈرامے کے ڈائیلاگ بول رہے ہو۔ دو گھنٹے کی ریہرسل کی ایسی کی تیسی کروا دی تم نے۔ پھر پلان میں کیا کمی تھی۔ تم نے ہی تو کہا تھا کہ آخر میں نیرو کے پیچھے میں آ...... ان کی بات بن گئی ہے۔

"چل چھوڑ۔ اب کھسک لے یہاں سے۔" روہن نے نیرو کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا اور رویندر کو کھڑکی کی طرف گھما دیا۔

رویندر نے جیسے ہی کھڑکی سے باہر پیر رکھا۔ نیرو لگ بھگ چلاتے ہوئے بولی۔

"اے۔" اور رویندر نے اپنا باہر نکلا ہوا پیر واپس کھینچ لیا۔

"سوری بھا...... بھا...... نیرو جی۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میں کان پکڑتا ہوں۔"

"مرنا ہے کیا...... زینے سے اتر کر جاؤ۔" نیرو نے غراتے ہوئے کہا۔

"جی...... مگر۔" رویندر نیرو کی طرف دیکھنے لگا۔

"آج کے بعد گھر میں اس طرح قدم رکھے تو بچ کر نہیں جانے دوں گی۔ شور مچا دوں گی میں۔ چلو اب ۔میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ آواز مت کرنا۔" نیرو نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے روہن نے مڑ کر نیرو کی جانب دیکھا۔ دل میں ایک کسک سی اٹھی۔ جیسے واپس اندر چلا جائے۔ نیرو کو اس کی اور اپنی کہانی سنانے کے لیے۔ اس کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے کے لیے۔ مگر نیرو کی آنکھوں میں جھلک رہا ہلکا سا غصہ اس کو احساس دلا رہا تھا کہ نیرو نے انہیں صرف وقتی طور پر بخشا ہے معاف نہیں کیا۔ نیرو نے بنا آواز کیے دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس اوپر آ کر اپنا پیٹ پکڑ کر بری طرح ہنسنے لگی اور ہنستی ہی رہی۔ جانے کتنی دیر تک۔

......☆☆☆......

"ہاہاہاہا...... پھر......؟" صبح سمیر اور امان کبھی رویندر کے سر پر ابھرے گومڑ اور کبھی اس کے چہرے پر ابھرے شکایتی انداز کو دیکھ دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو

رہے تھے۔

”پھر کیا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کو ہم پر رحم آ گیا۔ اگر چلا دیتی تو وہاں ہمارا کیا ہوتا۔ خود ہی سوچ لو۔ مروا دیا تھا مجھے گدھا کہنے والے نے۔“ رویندر نے روہن کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ لو...... پلان اس کا خود کا تھا۔ مجھے زبردستی لے گیا تھا۔ اور اب مجھے ہی کوس رہا ہے۔ میں نے کہا تھا کیا یہ سب کرنے کو۔“ بولتے بولتے روہن کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔

”پلان میں کیا کمی تھی بول۔ یہاں دماغ خراب کرکے تمہیں ریہرسل کروائی۔ آدھے گھنٹے کی بات کو تم نے دو منٹ میں بول دیا۔ میں کیا کرتا؟“ رویندر نے امان اور سمیر سے اپنے لیے تائید مانگی۔

”پتا نہیں یار۔ اس کے سامنے جاتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ کیا کیا نکلنے لگا منہ سے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔“ روہن نے اپنی غلطی خود تسلیم کرلی۔

”ہوتا ہے...... ہوتا ہے باس! پیار میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ امان بیچ میں بول پڑا۔ ”مگر یہ بات تو صاف ہے کہ نیرو کو تمہاری اس حرکت پر زیادہ غصہ نہیں آیا۔ اس کا مطلب چانس تو ہے۔“ کہتے ہوئے امان نے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سمیر کو ٹوک دیا۔

”تم کہاں کی تیاری میں ہو بھائی۔“

”مجھے کسی سے ملنے جانا ہے۔“ سمیر کے چہرے پر خوشی صاف جھلک رہی تھی۔

”کون سی...... کس سے ملنے جارہا ہے بے۔ تم تو کچھ بتاتے بھی نہیں۔ ہم سے بھی شیئر کرلیا کرو یار۔“ امان نے اس کے چہرے کے تاثر کو بھانپتے ہوئے اس کو چھیڑا۔

”بات بن گئی تو ضرور بتاؤں گا۔ شام کو لوٹ کر۔“

سمیر مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

”واہ بھئی واہ۔ سب سیٹ ہوتے جارہے ہیں بھائی رویندر۔ کہو تو کوشل کو بلالوں آج۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں۔“ امان نے رویندر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

رویندر اچانک سنجیدہ ہوگیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

”نہیں یار۔ خالی جسمانی تعلقات سے زیادہ مزا تو ایسے پتھر کھانے میں ہی آجاتا ہے۔“ رویندر نے اپنے گومڑ کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اس کی جگہ ہوتا تو بھابھی جی کو زبردستی اٹھا کر ٹیلے پر لے جاتا اس کے بعد تو اس کو یاد آ ہی جاتا نا۔“

”فکر مت کرو۔ میرے دماغ میں ایک اور پلان ہے۔“ امان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”مگر اب کی بار میں ساتھ نہیں جاؤں گا۔ پہلے سے بتا دیتا ہوں۔“ رویندر نے سر پر بنے گومڑ کو سہلایا۔

”ٹھیک ہے۔ تم گھر پر آرام کرنا۔ میں جاؤں گا روہن کے ساتھ۔“ امان ہنسنے لگا۔ ”آخر مجھے بھی تو بھابھی جی کو دیکھنا ہے۔“

......☆☆☆......

”تم نے ان کو ایسے ہی نکل جانے دیا' پکڑوا کیوں نہیں دیا۔ ان کی تو دھنائی ہونی چاہیے تھی۔ ایسے کیسے گھس آئے گھر میں۔ عجیب آدمی ہیں۔“ کالج کے بعد نیرو کے گھر بیٹھی ریتو نے اس کی داستان سننے کے بعد رائے دی۔

”پتا نہیں یار! میں نے بھی پہلے ایسا ہی سوچا تھا۔ پھر جانے کیوں ان پر ترس سا آ گیا۔ شریف ہی لگتے ہیں بیچارے۔ ورنہ کمرے میں گھسنے کے بعد تو وہ میرا منہ بھی دبا سکتے تھے۔ کچھ بھی کرسکتے تھے۔ میں کیا کر لیتی میرے لائٹ جلاتے ہی ان کے چہرے ایسے سفید پڑ گئے تھے کہ کوئی اور ہوتا تو انہیں چور سمجھ لیتا۔“

نیرو ہنسنے لگی۔

”یہ بات تو ہے شینو۔ مگر ہیں دونوں عجیب۔ بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے لڑکی پٹانے کا' شرافت سے دن میں سیدھے آ کر بات کرنی چاہیے تھی۔ خوابوں میں آنے کا ڈرامہ کیوں کیا۔“ ریتو نے بات آگے بڑھائی۔

”ہوں۔ یہ آئیڈیا اب تم ان کو دے دینا کہ سیدھے آ کر بات کرنی چاہیے تھی۔“ نیرو نے منہ بنا کر ریتو کی نقل کی۔ ”جیسے میں ان کا انتظار ہی کر رہی ہوں یہاں۔“

”ارے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنی ہی ہے تمہیں' پھر اس میں کیا کمی ہے' اسمارٹ ہے۔ شریف ہے۔ مجھے کہتا تو میں تو جھٹ سے تیار ہوجاتی۔ مگر قدرت دیتی ہی اس کو ہے۔ جس کو اس کی ضرورت نہیں ہو۔ تم ساری عمر ایسے ہی بیٹھی رہو گی کیا؟“ ریتو نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”ہاں۔ بیٹھی رہوں گی ایسے ہی۔ مجھے تو شادی کے نام سے ہی نفرت ہے۔“ نیرو نے جواب دیا۔

”مگر کیوں یار تم ایسی کیوں ہو؟“ ریتو نے پوچھا۔

”پتا نہیں ریتو۔ مگر میرا یہ پکا ارادہ ہے کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ اب اس موضوع کو بند کرو اور کتاب کھولو۔ آئندہ اگر انہوں نے کوئی حرکت کی تو میں انہیں چھوڑوں گی نہیں۔“ نیرو نے کہتے ہوئے اپنی کتاب نکال لی۔

......☆☆☆......

”ہائے شلپا۔“ سمیر نے کالج سے تھوڑی دور ہٹ کر کھڑی اس کا انتظار کرتی شلپا کے پاس گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

شلپا نظریں تک نہیں اٹھا سکی۔ ہاتھ میں پکڑی کاپی کو یونہی سینے سے چپکائے کھڑی رہی۔

”ہائے۔“ سمیر نے دوسری طرف جھک کر دروازہ کھول دیا۔ ”آؤ بیٹھو نا۔“

شلپا نے نظریں اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر جھٹ سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سمیر نے گاڑی گھمائی اور شہر سے باہر نکال کر سرپٹ دوڑا دی۔

”کہاں جارہے ہو۔“ شلپا نے اپنے چہرے پر لٹکنے والی بالوں کی لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے نظریں

ہلکی سی سمیر کی طرف اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں چلنا چاہئے۔" سمیر نے گاڑی کی رفتار دھیمی کی اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

شلپا سہمی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ "مجھے کیا پتا کہیں بھی چلو۔" شلپا نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مگر بلایا تو تم ہی نے تھا اور اب کس کو پتا ہوگا؟" سمیر شرارت سے مسکرانے لگا۔ "مطلب یہ کہ تم آنا نہیں چاہتی تھیں، ہے نا۔"

شلپا نے شکایتی نظروں سے سمیر کی آنکھوں میں جھانکا۔

"یہ کس نے کہا؟"

سمیر ہنسنے لگا۔

"ایسے کیوں ہنس رہے ہو؟ میں نے بلا کر کوئی غلطی کردی کیا۔" شلپا کا چہرہ اتر گیا۔

"تم تو اب بھی ویسی ہی ہو۔ بات بات پر چڑ جاتی ہو۔ میں تو سوچا کرتا تھا کہ تم بڑی ہو کر سمجھدار ہوگئی ہوگی۔ ہا ہا ہا۔" سمیر کی بات سن کر شلپا کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔

"کیا تم سچ میں میرے بارے میں سوچا کرتے تھے؟"

"اور نہیں تو کیا۔" سمیر نے کہا اور اچانک چپ ہوگیا۔

شلپا کے بدن میں چھپن چھپائی والی بات یاد کرتے ہی جھرجھری سی دوڑ گئی۔ پھر منہ پھیر کے اپنے جذبات کو سمیر سے چھپاتی ہوئی بولی۔

"کیا سوچا کرتے تھے؟"

سمیر نے روڈ سے گاڑی اتار کر ایک ٹیلے پر لے جا کر کھڑی کر دی اور شلپا کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ شلپا کو اس کی نظریں اپنے گورے بدن میں گھڑتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنا چہرہ پھر گھما لیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"بولو نا۔ کیا سوچا کرتے تھے؟"

"یہی کہ میں تجھے بھول کیوں نہیں پاتا۔" سمیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی کہ تو بھی مجھے یاد کرتی ہوگی یا نہیں؟"

شلپا نے اچانک اپنا چہرہ گھما کر اپنی نظریں اس کی نظروں سے ملا دیں۔ سمیر کا اس کو "تو" کہہ کر بولنا اسے بہت پیارا اور اپنا سا لگا۔ وہ یونہی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔

"تم سچ میں بڑی نہیں ہوئی ہو شلپا۔" سمیر بھی اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈوبتا ہوا بولا۔

شلپا کی نظریں شرم کے مارے جھک گئیں اور گورے گالوں پر حیا کی لالی نظر آنے لگی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔"

"اور نہیں تو کیا؟ بڑی ہوگئی ہوتیں تو مجھ سے پیار ہونے کے باوجود اتنے دن بعد یوں ملنے پر اب تک چپ نہ بیٹھی رہتیں مجھ سے لپٹ گئی ہوتیں اب تک۔" سمیر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے گالوں کو چھو لیا۔ اس کا چھونا ہی تھا کہ شلپا اس کی بانہوں میں ڈھیر ہوگئی۔ بانہیں سمیر کے گلے میں ڈال کر اس سے چپک کر سسکنے لگی۔

"تم نہیں جانتے سمیر۔ ایک ایک پل میں تمہیں کتنی بار یاد کیا ہے میں نے...... کتنی تڑپی ہوں میں، تمہارے لیے۔ اب تو میں نے امید ہی چھوڑ دی تھی کہ تم میری زندگی میں دوبارہ لوٹ آؤ گے۔" شلپا کے بدن میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ "اب واپس تو نہیں جاؤ گے نا۔" شلپا کے منہ سے آہ سی نکلی۔

"جاؤں گا۔" سمیر پھر مسکرانے لگا۔ "مگر تمہیں ساتھ لے کر۔"

شلپا چونک کر پیچھے ہٹی اور پیار سے ایک گھونسا اس

کے سینے پر مار کر واپس سینے سے چپک گئی، دوگنے جوش کے ساتھ۔

"میں نے ممی پاپا سے بات کرلی ہے۔ وہ شام کو تمہارے گھر پر فون کریں گے۔" سمیر اب بھی مسکرا رہا تھا۔

شلپا اتنی بڑی خوشی کو دل میں دبا کر نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔ جذبات میں بہکتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ سمیر کے گال پر رکھ دیئے۔

"آئی لو سمیر۔"

......☆☆☆......

رات کو اپنے کمرے میں اسٹڈی کرتے ہوئے نیرو کو رہ رہ کر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ جانے ایسا کیوں تھا مگر وہ بار بار سامنے والی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پردے کی ہلکی سی ہلچل بھی اس کا دھیان اپنی طرف کھینچ لیتی۔ کل رات کو روہن اور رویندر اسی کھڑکی سے اندر آئے تھے۔ اچانک کچھ یاد کر کے نیرو اٹھی اور کھڑکی کے پاس گئی۔ اس نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔ کھڑکی آج بند تھی۔ اس نے چٹخنی کھولی اور باہر جھانکنے لگی۔ کھڑکی کے ساتھ ساتھ پانی کا ایک پائپ اوپر کی ٹنکی تک جا رہا تھا وہ ضرور اسی پائپ کے سہارے اوپر چڑھے ہوں گے۔ اچانک نیرو کو ہنسی آ گئی۔ وہ مڑی اور ہنستے ہوئے ہی بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

"ایڈیٹ۔" نیرو کے منہ سے نکلا۔ لائٹ جلتی ہی چھوڑ کر اس نے کتابیں میز پر رکھیں اور کمبل میں گھس گئی۔ کل رات کے خیالوں میں کھوئے کھوئے ہی اس کو کب نیند آ گئی پتا ہی نہیں چلا۔

"کون ہے؟" اچانک کمرے میں ہوئی آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی اور چونکتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

آج اس کے دل میں ڈر کم اور غصہ زیادہ تھا۔ وہ سیدھی پردے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کون ہے وہاں؟ بولو...... ورنہ میں شور مچا دوں گی۔" مگر ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ پردے کی ہلچل نیرو کو عام طرح کی نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے جھٹ سے ایک بار پھر پیپر ویٹ ہاتھ میں تھام لیا۔

"لگتا ہے آج پھر تمہارا سر پھوٹے گا چپ چاپ واپس جاؤ۔" نیرو نے مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کچھ سوچ کر واپس نیچے کرلیا۔

"تمہاری پرابلم کیا ہے۔ اندر آ جاؤ۔" کوئی جواب نہ ملنے پر نیرو چپکے سے اٹھی اور احتیاط سے کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ پردے کے پاس جا کر وہ کچھ دیر کھڑی رہی اور اچانک پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"اف۔" نیرو نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مگر پوری سڑک سنسان تھی۔ اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر نیرو نے لمبی سانس لی اور کھڑکی اندر سے بند کردی۔ مگر واپس مڑتے ہی اس کی سانس اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

بستر پر جہاں سے وہ ابھی اٹھ کر آئی تھی۔ پیپر ویٹ کے نیچے دبا ایک کاغذ کا ٹکڑا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شدید حیرت کے مارے نیرو لرز کر رہ گئی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" نیرو اپنے آپ ہی بڑبڑائی اور کمرے میں چاروں طرف کسی کی موجودگی کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر کوئی ہوتا تو ملتا۔ بھاری اور تھکے ہوئے قدموں سے نیرو بستر کی طرف بڑھی اور کاغذ کا ٹکڑا پیپر ویٹ کے نیچے سے نکال کر پڑھنے لگی۔

"پیار امر ہوتا ہے نیرو۔ وہ کبھی نہیں مرتا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے تھے۔ آج خود روہن کو بھی احساس نہیں ہے کہ

تم اس کے لیے کیا تھیں۔ اور وہ تمہارے لیے کیا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔ مگر قدرت تم دونوں کو پھر سے ملانا چاہتی ہے۔ اس بات کو نظر انداز مت کرو۔ اپنی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو۔ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہارے گھر والے تمہارا نام نیرو سے بدل کر شینو رکھنے پر کیوں مجبور ہوئے۔ روہن سے ملو۔ اس کے دل میں تمہارے لیے اس کے جذبات اور عظیم پیار کو محسوس کرنے کی کوشش کرو۔"

نیرو کا دماغ چکرا گیا۔ اس نے ڈر کے باوجود کمرے کا کونا کونا چھان مارا۔ مگر کوئی نہیں ملا۔ مشکل سے ایک منٹ کے اندر یہ سب ہو گیا تھا۔ کوئی اندر آیا اور خط رکھ کر واپس چلا گیا۔ ہلکی سی آہٹ کیے بنا۔ کون ایسا کر سکتا ہے؟" اچانک باتھ روم میں شروع ہوئی پانی کی ٹپ ٹپ نے تو اس کی جان ہی نکال کر رکھ دی۔ زور سے چیختے ہوئے وہ بدحواس سی ہو کر باہر نکلی اور نیچے کی طرف بھاگی۔ چیخ سن کر پہلے ہی امی اور ابا اپنے کمرے سے باہر نکل کر آ چکے تھے۔

"کیا ہوا بیٹی۔" دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔

نیرو نیچے جاتے ہی اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"اوپر...... اوپر کوئی ہے امی۔" نیرو کی اوپر دیکھنے کی ہمت تک نہیں ہو رہی تھی۔

نیرو کی بات سنتے ہی ابا اوپر کی طرف بھاگے۔ کمرے میں جا کر انہوں نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ بستر پر رکھے اس کاغذ کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں ملا۔ اچھی طرح دیکھ بھال کر نیچے واپس آئے اور نیرو سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے شینو؟"

"پتا نہیں۔ میں بس ایک منٹ کے لیے بستر سے اٹھی تھی۔ واپس آئی تو وہاں یہ رکھا ہوا ملا۔ پتا نہیں کس نے اور کیسے رکھ دیا۔" یہ کہہ کر نیرو رونے لگی۔

"رو کیوں رہی ہو بیٹی؟ تمہیں کوئی پریشان کر رہا ہے کیا۔" امی نے نیرو کو باپ سے الگ لے جاتے ہوئے پوچھا۔

سوال سنتے ہی نیرو کے ذہن میں روہن اور رویندر کی تصویر ابھر آئی۔ پھر کچھ دیر رک کر بولی۔

"نہیں امی۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے تمہاری کتاب میں یہ خط رکھ دیا ہو۔ اور کھولتے ہوئے بستر پر گر گیا ہو۔" ابا نے پاس آتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ابا۔ بستر پر یہ پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ کسی نے ابھی رکھا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے۔" نیرو نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ابا کا چہرہ لٹک گیا اور پیشانی پر فکر اور غصے کی لکیریں ابھر آئیں۔ اچانک کچھ سوچ کر انہوں نے فون نکالا اور انسپکٹر آنند کا نمبر ڈائل کیا۔

"نمستے چاچا۔ اتنی رات کو کیسے یاد کیا؟" آنند کسی گشت سے واپس آ رہا تھا۔

"کوئی شینو کو پریشان کر رہا ہے بیٹا۔ ٹائم ملے تو آ جانا ایک بار یہیں بیٹھ کر بات کر لیں گے۔"

"کیوں نہیں چاچا پرابلم زیادہ سیریس ہے تو میں ابھی آ جاتا ہوں۔" آنند نے ادب سے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم کل آ جانا میں تو صبح جلدی ہی نکل جاؤں گا تم اپنی چاچی سے بات کر لینا۔ وقت ضائع کیے بغیر مسئلے کا کوئی علاج ہو جائے تو بہتر ہوتا ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے چاچا۔ میں کل جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا۔ اب فون رکھتا ہوں۔" کہہ کر ابا نے فون کاٹ دیا۔

تینوں نیچے ہی لیٹ گئے تھے۔ نیرو اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ کل آنند کے سامنے روہن اور رویندر کا ذکر کرے یا نہ کرے۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ خط میں لکھی بات پر چلا گیا۔

"اپنی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو۔ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہارے گھر والے تمہارا نام نیرو سے بدل کر شینو رکھنے پر کیوں مجبور ہو گئے۔"

"امی۔" نیرو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹی کیا بات ہے؟" امی نے پیار سے پوچھا۔

"تم مجھے بتاتی کیوں نہیں ہو کہ میرا نام کیوں بدلا۔" نیرو نے کہا۔

"سو جاؤ بیٹی۔ صبح بات کریں گے۔" امی نے نیرو کا ہاتھ کھینچ کر اس کو زبردستی لٹانے کی کوشش کی۔

نیرو چڑ گئی۔ "مجھے نیند نہیں آ رہی ہے امی آخر ایسی کیا بات ہے جو آپ بار بار ٹال رہی ہیں۔" نیرو نے ابا سے سوال کیا جو اس کی باتیں سن کر اٹھ بیٹھے تھے۔

"شینو اب بڑی ہو گئی ہے۔ میرے خیال سے بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ابا نے امی سے رائے لی۔

"مگر بابا جی نے منع کیا تھا۔" امی نے ابا کی طرف انکاریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر چپ چاپ سوچتے رہنے کے بعد ابا حقیقت کی یادوں میں کھوتے چلے گئے۔

"تم اس وقت پانچ سال کی تھیں شینو۔ ایک دن اچانک مجھے تمہاری پرنسپل نے فون کر کے ہسپتال پہنچنے کو کہا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ بدحواس سا ہسپتال پہنچا تو جا کر پتا لگا کہ تم کوئی نام بار بار دوہرا کر چلاتے ہوئے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ نام یاد نہیں آ رہا۔" ابا نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا اور پھر آگے بتانے لگے۔

"ہسپتال سے چھٹی کے بعد میں تمہیں سیدھا گھر لے آیا۔ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی تم سہمی سہمی سی لگ رہی تھیں۔ پہلے پہل ہم نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ مگر تمہارا عجیب رویہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ تم زیادہ باتیں نہیں کرتی تھیں حالانکہ تم بہت باتونی تھیں اور اس دن کے بعد تم نے بچوں کے ساتھ کھیلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ تم یونہی گم صم سی رہنے لگیں اس بات کو بھی ہم نظر انداز کر دیتے۔ مگر جب تم نے سوتے میں چلانا شروع کر دیا تو ہمیں بڑی فکر ہونے لگی۔ کئی اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ کراچی تک لے گیا تمہیں۔ مگر کہیں بات نہیں بنی۔ کچھ ڈاکٹروں نے بتایا بھی کہ اس عمر کے بعض بچوں کو عجیب عجیب خواب آتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی کیس لگ رہا ہے اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رشتے داروں کے بار بار کہنے پر ہم تمہیں شاہ بابا کے پاس لے گئے۔ مجھے تو یقین تھا ہی نہیں کہ کچھ اثر ہو گا۔ مگر انہوں نے تو کرشمہ ہی کر دکھایا۔ ایک عمل کرنے کے بعد انہوں نے تمہارا نام نیرو سے شینو رکھنے کو کہا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ تمہارے بدن میں گھس کر کوئی روح تمہارے اندر گذشتہ صدیوں کی کوئی یاد جگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ صرف اتنا ہی کہا تھا کہ نام بدل کر یہاں سے لے جائیں۔ وہ روح دوبارہ اسے تنگ نہیں کرے گی۔ انہوں نے یہ بھی ہدایت دی کہ تمہیں اس بارے میں کبھی کچھ نہ بتایا جائے۔ تمہارے اس بارے میں زیادہ سوچنے سے پچھلی صدیوں کی وہ دردناک یادیں دوبارہ زندہ ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد ہم تمہیں گھر لے کر آ گئے۔ مجھے یہ سب مذاق جیسا لگ رہا تھا۔ مگر تمہارے چہرے پر دوبارہ لوٹ آنے والی مسکراہٹ نے میری سوچ بدل دی۔ پھر میں نے ہر ریکارڈ میں تمہارا نام بدلوا دیا۔ یہی

بات ہے جو ہم تمہیں بتا کر بلاوجہ پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔" ابا چپ ہو کر نیرو کی آنکھوں میں دیکھنے لگے۔

نیرو چپ چاپ سی روہن اور اس پراسرار خط کے بارے میں سوچنے لگی۔

.......☆☆☆.......

نیرو ریتو کے ساتھ کالج جانے کے لیے نکلی ہی تھی کہ گھر کے سامنے پولیس جیپ آ کر رکی۔ نیرو نظریں جھکائے گاڑی کے پاس سے گزرتی چلی گئی اور گاڑی کے اندر ہی بیٹھا آنند نیرو کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس دنیا میں ایک نیرو ہی تھی جو آنند کو پسند تھی۔ بے حد پسند۔ نیرو کے چہرے کی خوب صورتی اور نزاکت' اس کا سنجیدہ انداز اور نظریں ہمیشہ نیچی کر کے چلنا آنند کا دل موہ لیتی تھیں۔ مگر یہ بھی نیرو کا رکھ رکھاؤ ہی تھا جس نے آنند کو آج تک اپنے دل کی بات اس کے آگے ظاہر کرنے سے روک رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سوچتا تھا کہ اس کو پیار جتانا ہی نہیں آتا' اچانک اس نے ایک لمبی سانس لی اور گاڑی سے اتر کر دروازے پر دستک دی۔ چھ فٹ لمبے' گٹھیلے بدن پر چھبیس سال کی عمر میں ہی پولیس کی وردی خوب جچ رہی تھی۔ اور اس پر لگے تین اسٹار تو کسی بھی لڑکی کا سپنا ہو سکتے تھے۔

"آ گئے بیٹا۔ شینو بھی ابھی ابھی کالج کے لیے نکلی ہے۔" امی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"ہاں چاچی۔ میں نے اس کو راستے میں دیکھا تھا۔" آنند اندر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

امی کچن میں چلی گئیں۔

"ارے اس کو واپس کیوں نہیں لے کر آئے۔ اسی کے بارے میں تو بات کرنی ہے۔" امی نے افسوس سا جتایا۔ "میں اس کی سہیلی کے فون پر کال کر کے اس کو واپس بلاتی ہوں۔" امی نے باہر آ کر ایک فون کیا اور واپس اندر چلی گئیں۔

"مجھے تو اس سے بات کرتے ہوئے ڈر سا لگتا ہے چاچی۔ وہ تو کبھی دیکھتی تک نہیں میری طرف۔ جانے کتنی ہی بار آمنا سامنا ہو جاتا ہے ہمارا۔ مگر انجان ہستی کی طرح سائیڈ سے نکل جاتی ہے۔ اب بتاؤ بھلا میں راستے میں اس کو کیسے ٹوکتا۔" آنند یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔

"ارے نہیں بیٹا۔ تم تو جانتے ہو۔ اس کا انداز ہی ایسا ہے۔ مجھے تو ڈر لگا رہتا ہے۔ پرائے گھر کی امانت ہے۔ شادی کے بعد بھی اس کا رویہ نہیں بدلا تو۔" امی نے چائے کا کپ بنا کر آنند کو دیا اور اس کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کک کیا اس کی شادی پکی کر دی؟" آنند تڑپ کر بولا۔

"ابھی کہاں کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہو تو بتانا اس کے ابو تو بے چین ہو رہے ہیں اس کی شادی کے لیے۔ تم تو سب جانتے ہی ہو۔" امی نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ۔ ضرور۔" آنند کے کلیجے کو ٹھنڈک ملی۔ "وہ چاچا کچھ ذکر کر رہے تھے۔ کیا معاملہ ہے؟" امی اٹھیں اور دراز میں سے خط نکال کر آنند کو دیا۔

آنند کھول کر پڑھنے لگا۔

"پیار امر ہوتا ہے نیرو۔ وہ کبھی نہیں مرتا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتے تھے۔ آج خود روہن کو بھی احساس نہیں ہے کہ تم اس کے لیے کیا تھیں۔ اور وہ تمہارے لیے کیا تھا۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔ مگر قدرت تم دونوں کو پھر سے ملانا چاہتی ہے۔ اس بات کو نظر انداز مت کرو۔ اپنی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو۔ جاننے کی کوشش کرو کہ تمہارے گھر والے تمہارا نام

نیرو سے بدل کر شینو رکھنے پر کیوں مجبور ہوئے روہن سے ملو اس کے دل میں تمہارے لیے اس کے جذبات اور عظیم پیار کو محسوس کرنے کی کوشش کرو۔"

"یہ روہن کون ہے؟ میں نے یہ نام کہیں سنا ہے۔" آنند نے دماغ پر زور ڈالا۔ مگر روہن کا نام اور اس کی طرف سے لیا گیا نیرو کا نام اس کے ذہن سے اتر گیا تھا۔

"پتا نہیں بیٹا اگر شینو کو بھی پتا ہوتا تو وہ ضرور بتا دیتی۔ اس کو بھی معلوم نہیں ہے کچھ۔ کل رات کو بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی۔ بہت ڈری ہوئی تھی۔ کسی نے اس کے کمرے میں یہ خط رکھ دیا تھا۔ اسی سے اتنی پریشان ہو گئی بیچاری۔ پھر معاملہ بڑھانے سے پہلے ہی نمٹ لیں تو بہتر ہوتا ہے۔ لڑکی ذات ہے۔ بات باہر نکل گئی تو لوگ جانے کیسی کیسی باتیں کرنے لگتے ہیں۔" امی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر یہ خط تو نیرو کے نام پر لکھا گیا ہے۔" کہتے ہوئے آنند پھر سے پہلی لائن سے پڑھنے لگا۔

"یہی بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے بیٹا۔ دراصل پہلے شینو کا نام یہی تھا۔ مگر بہت چھوٹی تھی تبھی بدل دیا تھا یہ نام۔ جانے کس موئے کو یہ بات پتا چل گئی اور اب اس کو پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے بھی سنا تھا ایک بار کہ شینو کا نام پہلے نیرو تھا۔"

امی سے باتیں کرتے ہوئے آنند خط پڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ رک کر اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور کچھ سوچ کر وہ اچھل پڑا۔

"اوہ۔"

"کیا ہوا بیٹا؟" امی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ایک منٹ۔" آنند باہر گیا اور جیپ سے کیس ڈائری نکال کر لایا۔ واپس آ کر اس نے کچھ صفحات پلٹے اور کاغذ کا ایک ٹکڑا اس میں سے نکال کر دونوں کو میز پر ساتھ ساتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے بیٹا؟" امی کو اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"کچھ نہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا مسئلہ تو سمجھیں کہ حل ہو ہی گیا۔ اب میں چلتا ہوں۔" کہہ کر آنند تیزی سے کھڑا ہو گیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔ اپنے چاچا سے اگر کوئی بات کرنی ہو تو فون کر لینا۔" امی بھی ساتھ کھڑی ہوتے ہوئے بولیں۔

"ایک بات کہوں چاچی۔ اگر برا نہ مانیں تو۔" آنند نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں بولو نا بیٹا۔ کیا بات ہے؟" امی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"ویسے تو یہ بات گھر کے بڑوں کو ہی کرنی چاہیے' مگر مجھے شینو بہت پسند ہے۔ آپ اور چاچا اگر۔" آنند چپ ہو گیا۔

آگے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بات پوری کرے۔ بات سمجھ میں آتے ہی امی کا چہرہ کھل اٹھا۔

"یہ تو اس کے لیے بڑی خوشی کی بات ہو گی بیٹا۔ میں اس کے ابا کے آتے ہی بات کرتی ہوں۔ وہ تمہارے گھر فون کر دیں گے۔" امی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ آنند کے سر پر رکھ کر اسے دعا دی۔ آنند کا بھی یہی حال تھا۔ جانے کتنے دنوں کے بعد وہ کسی سے اپنے دل کی بات کہہ پایا تھا۔ جیسے ہی آنند باہر نکلا اس کو سامنے سے نیرو واپس آتی دکھائی دی۔ اس نے لاکھ کوشش کی اس کو روکنے کی۔ مگر اس کے منہ سے ہائے تک نہیں نکلا۔ نیرو سر جھکائے ہوئے ہی سائیڈ میں کھڑی ہو کر

آنند کے راستہ چھوڑنے کا انتظار کرنے لگی۔ آنند سر کھجاتا ہوا اس کے سامنے سے ہٹ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ اور نیرو اس کی طرف دیکھے بغیر ہی اندر چلی گئی۔

......☆☆☆......

''اوہ آپ ایک بار بات تو کرلیں اس سے۔ اتنا اچھا رشتہ خود چل کر آیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ بات بن جائے تو چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کردیں گے شینو کا۔'' آنند کے نکلتے ہی امی نے نیرو کے ابا کو فون لگالیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں ابھی بات کرکے بتاتا ہوں۔ مگر ان کو بولوں کیا؟'' ابا نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

''اب یہ بات بھی کیا میں ہی سمجھاؤں۔ بول دینا کہ آنند کو پسند ہے اور ہم بھی بہت خوش ہیں اس رشتے سے۔'' امی نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ نیرو دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

''کس کے رشتے کی بات ہورہی ہے امی۔'' نیرو اندر آتے ہوئے بولی۔

''اچھا فون رکھتی ہوں۔ آپ بتا دینا مجھے بھی۔'' امی نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔

''کیا ہوا امی آنند آیا تھا۔ کچھ پتا چلا۔'' نیرو نے امی کے فون رکھنے کے بعد پوچھا۔

''آنند آیا تھا۔'' امی نے منہ ٹیڑھا کرکے مذاق مذاق میں اس کی نقل اتاری۔ تم تو جیسے گھر والوں کے علاوہ کسی کو جانتی ہی نہیں ہو۔ اس سے بات نہیں کر سکتی تھیں کیا؟''

''میں کیوں بولوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا یوں سر راہ کسی سے بات کرنا۔ بتاؤ۔ آپ نے اس خط کی بات کی یا نہیں۔ اور مجھے کیوں بلایا ہے۔'' نیرو نے جواب دیتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں کہہ رہا تھا کہ اب میں سب سنبھال لوں گا۔ اور کچھ ہو نہ ہو ہمیں بہت اچھا دولہا مل گیا۔ اپنی گڑیا رانی کے لیے۔'' امی نے نیرو کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر گالوں کو چومتے ہوئے کہا۔

یہ بات سن کر نیرو بھڑک گئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی میں نے کہہ دیا ہے کہ میں نے نہیں کرنی شادی وادی۔ آپ بار بار یہ ذکر نہ کیا کریں۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''اری۔ سن تو لے ایک بار کہ رشتہ کس کا ہے۔ اپنے آنند کا۔ کتنا خوب صورت اور چھیل چھبیلا ہے۔ اور تھانیدار بھی ہے۔ تم موج کروگی اس کے ساتھ۔'' امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تھانیدار ہوگا اپنے گھر کا۔ مجھے نہیں کرنی کسی سے بھی شادی۔ دیکھ لینا اگر بات آگے بڑھائی تو۔'' غصے سے بھری نیرو نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور پیر پٹختی ہوئی واپس کالج جانے کے لیے باہر نکل گئی۔

''یہ لڑکی بھی نا۔'' امی نے بڑبڑاتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ مارا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ امی نے لپک کے جھٹ سے ریسیور اٹھایا۔ ''ہاں جی۔''

''سچ میں آج کا دن تو بہت ہی مبارک ہے۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے یہ بات سن کر۔ جھٹ سے تیار ہوگئے۔'' ابا کی آواز آئی۔

''اچھا۔'' امی چہکتی ہوئی بولیں اور پھر اچانک نیرو کی بات یاد آتے ہی مایوس ہوگئیں۔ ''مگر نیرو کا کیا کریں وہ تو کسی سے بھی شادی کرنے سے انکار کررہی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا۔'' ابا نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''کہہ رہی تھی اس کو شادی وادی نہیں کرنی۔ مجھ سے لڑ کر واپس کالج چلی گئی۔'' امی کا چہرہ اتر گیا۔

''اوہ۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ لڑکی ہے آخر اور کیا شادی کی بات سن کر ناچنے لگ جائے گی' لڑکیاں تو ایسا ہی کرتی ہیں۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ وہ تو اس اتوار کو دیکھنے آنے کی بات کہہ رہے ہیں۔'' ابا نے بات کو آگے بڑھایا۔

''اوہ! مگر اتوار میں صرف تین ہی دن رہ گئے ہیں۔'' امی سوچ کر بولیں۔

''تو تمہیں کیا کرنا ہے ان کی دیکھی بھالی تو ہے ہی۔ بس آجائیں گے اور پھول مٹھائی کی رسم کر جائیں گے تم کسی بات کی فکر مت کرو۔ ٹھیک ہے نا۔'' فون کٹنے کی آواز سن کر امی نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھیں۔

......☆☆☆......

''ایکسکیوزمی مس نیرو۔'' نیرو کالج کے اندر قدم رکھنے ہی والی تھی کہ اپنا نام سن کر چونک کر پلٹی۔ ''میں امان ہوں۔ روہن کا دوست۔'' امان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پہلے سے ہی غصے میں بھری ہوئی نیرو کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''تو؟''

نیرو کے تیور دیکھ کر امان سہم سا گیا۔ اس بات کو جانتے ہوئے کہ نیرو نے اس رات روہن اور رویندر کو ایسے ہی نکل جانے دیا تھا' اسے کافی امید بندھی تھی۔ کچھ دیر رک کر سنبھلتے ہوئے بولا۔

''تو۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ اس بارے میں۔ آپ چاہیں تو اپنی کسی سہیلی کو بھی ساتھ لے سکتی ہیں۔''

''نہیں۔ مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' وہ پلٹی ہی تھی کہ ریتو اور شلپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سن تو لو نیرو۔ آخر سننے میں کیا حرج ہے؟'' ریتو نے کہا۔ ''مجھے روہن کی باتوں میں سچائی محسوس ہوتی ہے۔''

''اب تم بھی۔'' نیرو نے ریتو کو گھورا۔

''تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے کیا۔'' ریتو نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''یار اس میں یقین کی کیا بات ہے۔ بس مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔'' نیرو اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔

''دیکھو میں تمہیں روہن کی باتوں کی سچائی کے بہت سے ثبوت دے سکتی ہوں۔ مگر تم ایک بار ہمارے ساتھ چلو تو۔ بس ایک بار۔'' ریتو نے زور دے کر کہا۔

''ساتھ چلوں؟ مگر کہاں۔'' نیرو نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''چلو تم آؤ تو سہی۔'' ریتو نے تقریباً زبردستی کرتے ہوئے اس کو امان کی گاڑی میں بٹھا دیا۔ ساتھ ہی شلپا بھی بیٹھ گئی۔

......☆☆☆......

امان کے گھر پر سب لوگ ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ شلپا اور سمیر ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ امان' روہن کے ساتھ۔ اور ان کے سامنے ریتو کے ساتھ بیٹھی ہوئی نیرو خود کو عجیب صورت حال میں الجھی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ اگر ریتو اس کے ساتھ نہ ہوتی تو ایک پل کے لیے بھی اس کا وہاں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ اس نے ریتو کا ہاتھ کس کر پکڑا ہوا تھا۔ اچانک رویندر جو شراب کی بوتل چھپانے گیا تھا ان کے سامنے آیا تو اس کے سر پر گومڑ بنا دیکھ کر ریتو کی ہنسی چھوٹ گئی۔ نیرو نے بھی جیسے ہی اپنا چہرہ اوپر اٹھایا' اپنا منہ دبا کر ہنسنے سے خود کو نہ روک پائی۔

''نمستے بھابھی جی۔'' رویندر نے پہلی بار نیرو کے چہروں پر ستاروں کی جھلملاہٹ جیسی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے نیرو کو بھابھی کہہ دیا۔

نیرو نے اس کی بات کو ان سنا کردیا اور ریتو سے بولی۔ ''ہاں اب بتاؤ۔ کیا بات کرنی ہے۔ جلدی بولو۔ مجھے جانا بھی ہے۔''

روہن نے بولنے کے لیے جیسے ہی منہ کھولا سب چپ ہو کر اس کی بات سننے لگے۔

اپنے خوابوں سے شروع کر کے آج تک کی ساری کہانی روہن نے ایک تسلسل میں بیان کر دی۔ صرف اس میں سے شروتی کے ساتھ ہوئے دردناک حادثے کو وہ گول کر گیا۔ اس دوران شروتی کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور یکایک وہ سب غمزدہ ہو گئے جن کو شروتی کے بارے میں پتا تھا' وہ شروتی کو یاد کر کے اور جنہیں پتا نہیں تھا وہ یہ سمجھ کر کہ روہن نیرو کو کہانی سناتے ہوئے بہک گیا ہے۔

''آئی بات سمجھ میں۔'' ریتو نے روہن کی بات ختم ہوتے ہی نیرو سے پوچھا۔

یہ کہانی سنتے ہی نیرو کا دماغ سن ہو کر اپنے نام بدلے جانے والی کہانی سے جوڑ رہا تھا۔ مگر جواب میں اس نے صرف اتنا ہی کہا ''چلیں۔''

''اب یہ کیا بات ہوئی' کچھ بولو تو سہی۔ آخر سب تمہارے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ریتو نے غصے میں بھر کر کہا۔

نیرو کچھ بولنے کے لیے سوچ ہی رہی تھی کہ اگلے ہی لمحے اس کو بجلی کا سا جھٹکا لگا۔

''مجھے امید ہے کہ میں نے آپ سب کو ڈسٹرب نہیں کیا ہو گا۔'' بغیر اجازت اندر آنے کے بعد ایک ایک کے چہرے کو گھورنے کے بعد آنند کی آنکھیں نیرو پر آ کر ٹک گئیں۔ ''اوہ۔ اتنی شرافت اور نزاکت بھری شرارت۔ میں واقعی امپریس ہوا۔'' آنند کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''آئیے نا انسپکٹر صاحب۔ بیٹھیں نا۔ ہم اس دن انہی نیرو کی بات کر رہے تھے۔'' امان انسپکٹر کے استقبال کے لیے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

نیرو کچھ بول سکنے کی حالت میں ہی نہ تھی۔ وہ اٹھ کر باہر جانے ہی لگی تھی کہ آنند نے اس کو روک لیا۔

''ارے نہیں نہیں۔ پلیز رک جائیں۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ آپ یہیں مل گئیں۔ روہن کو ہتھکڑی لگانے سے پہلے مجھے آپ کے بیان کی بھی ضرورت پڑے گی۔'' آنند کی بات سن کر سبھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ کیا بات کر رہے ہیں آپ۔ روہن کو ہتھکڑی۔'' امان نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ ثابت کر کے ہی اس کو یہاں سے لے جاؤں گا۔'' آنند کرسی پر بیٹھ گیا۔

روہن کبھی آنند کو اور کبھی نیرو کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''تو روہن صاحب۔ آپ رات کو شینو کے گھر میں دراندازی کرتے ہیں۔'' آنند نے سب کے چہروں کو اپنی طرف تکتا چھوڑ کر اپنی انٹروگیشن شروع کی۔

سوال سنتے ہی رویندر نے اپنے سر کے گومڑ کو ہاتھ سے ڈھک لیا۔ جیسے ثبوت چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ روہن نے مایوس ہو کر شکایتی نظروں سے نیرو کی طرف دیکھا۔ اس کو یہی اندازہ ہوا کہ نیرو نے اس کے گھر میں گھسنے کی رپورٹ کروا دی ہے۔ سر جھکا کر وہ اپنا جرم قبول کرنے کے لیے بولنے ہی والا تھا کہ چونک کر اس نے نیرو کی جانب دیکھا۔

''نہیں۔ یہ ہمارے گھر میں کبھی نہیں آئے۔'' نیرو کے جواب نے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

آنند نیرو کے بولنے سے جھلا کر اٹھا۔ اس کو نیرو کی آواز سے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ روہن کو بچانے کے لیے ایسا بول رہی ہے۔

''کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟ شینو عرف نیرو۔'' آنند نے ترچھی نظروں سے نیرو کو گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ یہ کبھی ہمارے گھر نہیں آئے۔'' نیرو نے نظریں جھکائے ہوئے ہی جواب دیا۔

یہ بات سن کر رویندر بھی اچھل پڑا۔ ''ہاں ہاں ہم بھلا رات کو کیا کرنے جائیں گے۔ ہیں نا روہن۔''

روہن نے نظریں اٹھا کر اس کے گومڑ کو دیکھا اور اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اب روہن کافی ریلیکس محسوس کر رہا تھا۔ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

''واہ واہ۔ روہن کو بچانے کی آپ کی کوشش قابل تعریف ہے نیرو جی۔ مگر افسوس۔ اس کو ہتھکڑی لگانے کے لیے جو وجہ میرے پاس ہے۔ اس میں آپ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں اس جرم کے لیے تو میں اس کو سجھا کر ہی رہوں گا' آخر تمہیں بھی اس کے ساتھ کورٹ کچہری کے چکر لگانے پڑتے۔ اور میری طرح کوئی بھی عزت دار آدمی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کی ہونے والی بیوی اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کورٹ کے جھمیلے میں پڑے۔'' آنند نے اپنی آخری بات کو چبا چبا کر کہا اور نیرو کے گھر سے ملا خط اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''اب یہ مت کہنا کہ یہ خط بھی آپ کو نہیں ملا تھا۔ چاچی نے مجھے دیا ہے یہ خط۔''

نیرو نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''ہاں۔''

آنند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''ویری گڈ پڑھنا ذرا اس کو۔'' آنند نے خط روہن کی طرف بڑھا دیا۔

روہن' رویندر' سمیر اور امان حیرت سے خط کو پڑھنے کے بعد ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خط والا چکر کیا ہے۔ سب ایک دوسرے سے اشاروں ہی اشاروں میں سوال کر رہے تھے۔

''پڑھ لیا؟'' آنند نے آرام سے پیچھے کی طرف سر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔ مگر اس خط سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' روہن نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مان لیا' چلو اب اس کو پڑھو ذرا۔'' آنند نے ایک اور خط روہن کے سامنے میز پر پھیلا دیا۔

''یہ...... یہ تو شروتی کا ہے۔'' روہن نے خط اٹھا کر دیکھا اور پہلی سطر پڑھتے ہی بول پڑا۔

آنند مسکرایا۔ ''نا۔ یہ شروتی نے نہیں لکھا۔ پہلے میں مان چکا تھا کہ شروتی نے خودکشی کی ہے اور خودکشی سے پہلے یہ خط اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے۔ مگر اب نہیں مانوں گا' شروتی کا قتل ہوا ہے۔''

''کک کیا؟'' سبھی اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

بیچاری نیرو کو تو اب تک یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شروتی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ سب حیرت سے آنند کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دونوں خط ایک ساتھ رکھ کر دیکھو۔ صاف پتا چل رہا ہے کہ دونوں خط ایک ہی آدمی نے لکھے ہیں۔'' آنند کے چہرے پر کامیابی کی چمک ابھر آئی۔

سب نے باری باری خط اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ آنند کی بات سو فیصد سچ تھی کہ دونوں خطوں کی تحریر یکساں تھی۔ مگر کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' امان نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائیڈ نوٹ شروتی نے نہیں لکھا۔ کسی اور نے لکھا ہے۔ اور جس نے بھی لکھا ہے۔ اسی نے شروتی کا قتل کیا ہے۔'' آنند تیر چھوڑ کر چپ ہو گیا۔ اس کو کسی کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا تو مجبوراً اس کو خود ہی ساری بات سمجھانی پڑی۔

''دیکھو شروتی مر چکی ہے۔ اس لیے نیرو کے گھر ملنے والا یہ خط شروتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہو سکتا۔ اب چونکہ دونوں خطوط کی تحریر یکساں ہے' اس کا

مطلب یہ ہوا کہ شروتی کا سوسائیڈ نوٹ بھی اس شخص نے لکھا ہے جس نے یہ دوسرا خط لکھا ہے۔ صاف بات کہ اسی شخص نے شروتی کا خون بھی کیا ہے۔ اب اگر اس دن کے واقعے پر نظریں ڈالیں تو روہن نے خود کہا ہے کہ آخر میں وہ کنڈی لگا کر شروتی کو اندر چھوڑ آیا تھا۔ اس کے بعد پرکاش نے تسلیم کیا ہے کہ جب وہ شروتی کے پاس اندر گیا تو شروتی مر چکی تھی۔ اگر پرکاش باہر ہوتا تو میں ایک پل کو مان بھی لیتا کہ ہوسکتا ہے قتل پرکاش نے کیا ہو۔ مگر اس کی ضمانت تو کل ہوگی۔ پھر وہ کیسے نیرو کے گھر خط بھیج سکتا ہے۔ نہیں نا؟ اس کا مطلب ہے کہانی شیشے کی طرح بالکل صاف ہوگئی ہے۔ پرکاش نے جبراً شروتی کو روہن کے پاس بھیجا اور روہن نے شروتی کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ نہیں مانی تو زبردستی کے چکر میں ہی اس نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور اس کو پنکھے سے لٹکا کر باہر سے کنڈی بند کرکے آ گیا۔ سمجھے پرکاش پر صرف بلیک میلنگ کا الزام رہے گا باقی سارا کام تو جناب نے اپنے ہاتھوں سے ہی کیا ہے۔" آنند نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے اپنی کہانی پوری کی۔

"آپ بلاوجہ روہن پر شک کر رہے ہیں انسپکٹر صاحب۔ یہ خواب میں بھی ایسا نہیں کرسکتا۔" امان نے کہا۔

"تو کس پر شک کروں پروفیسر لو صاحب۔" آنند ہنسا۔ "کیا آپ پر کروں۔ یا باقی لوگوں پر۔ اس رات کوئی اور موجود تھا ہی نہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی قبول کر رہا ہے کہ یہ قتل اور دونوں خط آپ میں سے کسی نے لکھے ہیں تو ٹھیک ہے میں اس بات پر سوچ سکتا ہوں۔ ورنہ سارے ثبوت تو روہن کی طرف ہی اشارہ کر رہے ہیں۔" آنند نے کہا۔

"ہم جائیں۔" نیرو کے لہجے میں کڑواہٹ صاف جھلک رہی تھی۔

"جی کیوں نہیں، ویسے اب بھی کوئی مغالطہ بچا ہو تو آپ بھی سوال کرسکتی ہیں۔" آنند نے تیکھی نظروں سے نیرو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نیرو، ریتو اور شلپا بغیر کچھ کہے باہر نکل گئیں۔

"ہم بھی چلتے ہیں پروفیسر لو۔ تم سے ٹپس لینے پھر کبھی آؤں گا۔" آنند نے سلام کرنے کے انداز اپنا ہاتھ امان کی طرف اٹھایا اور روہن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ "روہن کو میں کل صبح عدالت میں پیش کروں گا۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ چار پانچ مہینے سے پہلے بیل اپلیکیشن لگانے سے کوئی فائدہ ہوگا۔

......☆☆☆......

رات کو تقریباً بارہ بجے جا کر آنند کو بستر نصیب ہوا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے اس کو تھکن ہو رہی تھی۔ روہن سے اس نے شروتی والے کیس سے زیادہ نیرو کے بارے میں پوچھ تاچھ کی تھی۔ یہ جان کر اس کو سکون ملا تھا کہ ابھی تک روہن اس کے دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہا ہے۔ اس کو خود احساس ہو رہا تھا کہ روہن کا نام نیرو کے ساتھ جڑا ہونے کی وجہ سے وہ اس کیس میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے۔ دوپہر کو نیرو کے سامنے ہی سارا خلاصہ بیان کرنے کے پیچھے بھی اس کا یہی مقصد تھا۔ مگر دکھاوے کے لیے اس نے روہن کو اپنے ساتھ ہی کھانا کھلایا اور اسٹاف کے ہی آدمی کے بستر پر سو جانے کو کہہ دیا۔ وہ خود بھی تھانے میں بنے اپنے ریٹائرنگ روم میں ہی لیٹ گیا۔

اچانک دروازے پر ہوئی دستک سے اس کی نیند ٹوٹی۔ "کون ہے؟" مگر اس کو اپنے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا اور وہ کروٹ بدل کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ لگاتار دو بار جلدی جلدی کھٹکھٹایا گیا۔ وہ جھلا کر اٹھ بیٹھا اور پینٹ پہن کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے؟" دروازہ کھول کر آنند نے پاس ہی کھڑے سپاہی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں صاحب۔ کیا ہوگیا۔" سپاہی بھاگ کر دروازے کے پاس آیا۔

"دروازہ کیوں کھٹکھٹا رہے تھے۔" آنند نے ہلکے سے غصے سے کہا۔

نہیں تو جناب۔ میں تو آدھے گھنٹے سے یہیں کھڑا ہوں۔ دروازہ تو کسی نے نہیں کھٹکھٹایا۔"

آنند نے عجیب سی نظروں سے اس کو گھورا اور باہر گیٹ کی طرف ٹہلنے چلا گیا۔ واپس لوٹتے ہوئے وہ روہن کے کمرے میں گھس گیا۔ روہن ابھی بھی جاگ رہا تھا۔

"کوئی دقت تو نہیں ہے نا۔" آنند نے پوچھا۔

"آپ کے ہوتے ہوئے اور کیا دقت ہوسکتی ہے۔" روہن نے طنزیہ کہا۔

آنند نے کچھ بولنا ضروری نہیں سمجھا اور باہر نکل کر اپنے کمرے میں جا کر بتی بجھا کے پھر سے لیٹ گیا۔ اس کو لیٹے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ اچانک کمرے میں لائٹ جل گئی۔ ہڑبڑا کر آنند ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"کون ہے؟" مگر ایک بار پھر کسی سے کوئی جواب نہیں ملا۔ آنند کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ جو کچھ ہو رہا تھا بے حد پراسرار تھا۔ وہ بستر سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا الماریوں کے بیچ میں لگے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ وہاں کسی چوہے تک کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"کیا مصیبت ہے؟" اس نے جھلا کر لائٹ بند کردی۔ پھر جانے کیا سوچ کر وہ پلٹا اور لائٹ دوبارہ آن کردی۔ واپس بستر کی طرف آتے ہی جیسے کہ اس کو بجلی کا تیز جھٹکا سا لگا۔ حیرت اور خوف کے مارے اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ دھیمے قدموں سے بڑھ کر اس نے بستر پر رکھے کاغذ کے ٹکڑے کو اٹھایا۔ لال رنگ سے کاغذ پر صرف اتنا ہی لکھا ہوا۔

"مردے جھوٹ نہیں بولتے۔"

آنند کو شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں کوئی ہے۔ مگر کون ہے۔ یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ یہ تو طے تھا کہ کسی نہ کسی نے کچھ منٹ پہلے وہ کاغذ وہاں رکھا تھا۔ آنند حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بستر کے نیچے دیکھا۔ دوبارہ الماریوں کے پیچھے دیکھا مگر وہاں کسی کا سایہ تک نہ تھا۔

"کون ہے بھائی۔ یہ آنکھ مچولی کیوں کھیل رہے ہو۔ سامنے آ کر بات کرو۔" آنند ایک جگہ کھڑے کھڑے ہی چاروں طرف گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ "اگر تم روہن یا پرکاش کو بچانے کے ارادے سے آئے ہو تو سامنے آ جاؤ۔ میں بھی سچ جاننا چاہتا ہوں۔ سامنے آ جاؤ یار۔" آنند ایسے بول رہا تھا جیسے کسی سے فون پر بات کر رہا ہو۔ بولتے ہوئے اس کی آنکھیں سامنے دیوار پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

اس کی باتوں اور چہرے سے لگ رہا تھا کہ اس کو بھوتوں کے تصور پر کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے بڑی مشکل سے خود کو بے ہوش ہونے سے روکا۔

اس کی میز پر رکھا ہوا پین پہلے سرکا اور پھر ہوا میں بلند ہوا۔ پھر پین میز پر اس طرح سے جا کر کھڑا ہوگیا جیسے کسی نے پین ہاتھ میں لے کر میز پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ حیرت کے مارے آنند پلکیں تک جھپکنا بھول گیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور الماری سے ٹک گیا۔ اس کے

دیدے باہر آنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ گلا سوکھ چکا تھا۔ کچھ بولنے کی اس میں طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ کمرے میں اس کے سانسوں کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی با آسانی سنی جا سکتی تھیں۔ کچھ دیر پین ہوا میں ہی لہراتا رہا پھر اچانک اس کی سی ڈی (کیس ڈائری) کے صفحات پلٹنے لگے۔ جب صفحے پلٹنا بند ہو گئے تو پین ڈائری کے ایک سادہ صفحے پر ٹک گیا۔ اور اس طرح حرکت کرنے لگا جیسے صفحے پر کچھ لکھ رہا ہو۔ آنند سانس روکے ڈائری پر پین کو چلتا ہوا دیکھتا رہا۔ آج سے پہلے اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی کبھی دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ حالانکہ ابھی تک اس کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ پچھتا رہا تھا کہ ریوالور اس نے میز کی دراز میں کیوں چھوڑ دیا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ جو پین اٹھا سکتا ہے وہ ریوالور بھی تو اٹھا سکتا تھا۔ اچانک ڈائری پین کو اپنے اندر سمیٹے بند ہو گئی۔ پھر دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی اور دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔

آنند ابھی تک بے سدھ سا دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

سپاہی بھاگا بھاگا آیا۔ ''جی صاحب۔ آپ نے بلایا۔''

اب آنند سپاہی کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ''نن، نہیں تو۔''

''جی۔ وہ آپ نے دروازہ کھولا۔ اس لیے مجھے لگا۔'' سپاہی سر جھکا کر باہر نکلنے لگا۔

''ارے سنو۔'' آنند نے اسے آواز دی۔

سپاہی جھٹ سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

''وہ روہن کو یہیں بھیج دو۔ میرے پاس۔''

......☆☆☆......

تھوڑی دیر بعد روہن اس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

''جی آپ نے بلایا۔'' روہن اندر آ کر بولا۔

''ہاں یار۔ مرتا کیا نہ کرتا آؤ۔''

کیس ڈائری اب آنند کے ہاتھ میں تھی۔ ''آؤ بیٹھ جاؤ آرام سے۔ یہیں سو جاؤ۔ کل صبح اٹھ کر گھر چلے جانا۔'' آنند نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر پہلے ہوئے واقعے کا اثر اب بھی اس کی آنکھوں میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔

روہن نے حیرت سے آنند کی طرف دیکھا۔

''اس مہربانی کی وجہ جان سکتا ہوں کیا؟''

''لو یہ پڑھو۔'' آنند نے وہ صفحہ کھول کر ڈائری روہن کے ہاتھ میں دے دی۔

''یہ کیا ہے؟'' روہن نے بنا ڈائری میں دیکھے ہی پوچھا۔

''ارے یار پڑھو تو سہی۔ بعد میں سب بتاتا ہوں۔'' آنند نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

روہن نے ڈائری کو سامنے رکھا اور پڑھنے لگا۔

''آپ کی دنیا کے اس پار کی دنیا بہت عجیب ہے انسپکٹر صاحب۔ ہم زندہ نہیں ہوتے۔ مگر کئی بار مرتے بھی نہیں۔ آپ مجھے محسوس کر کے بے چین ہو گئے ہو۔ مگر سچ کہوں تو ہم روحیں زمین کے زندہ انسانوں سے ڈرتی ہیں۔ لالچ، ہوس، سازش، دھوکہ، فریب، کیا کیا نہیں ہوتا یہاں۔ ہماری دنیا آپ کی دنیا سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر آپ کی دنیا سے دور ہی چین سے رہنا چاہتے ہیں۔ میں بھی شاید واپس لوٹ کر آنے کی کبھی سوچتی بھی نہیں۔ مگر ادھورا پیار۔ ہم میں سے کچھ کو مرنے کے بعد بھی اپنے محبوب سے باندھے رکھتا ہے۔ اور ہم آپ کی اور ہماری دنیا کے بیچ میں ہی لٹک کر رہ جاتے ہیں، یہ پیار چیز ہی ایسی ہے انسپکٹر صاحب۔ یہ پانی کی طرح مائع بھی ہے اور برف کی طرح ٹھوس بھی۔ یہ نازک بھی ہے اور انتہائی طاقتور بھی۔ طاقتور اتنا کہ ہر چیز کو اپنے سامنے جھکا لیتا ہے۔ پیار کے کچے دھاگے سے بندھے لوگوں کو مرنے کے بعد بھی پوری طرح سے اس دنیا سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ ہم جہاں رہنا چاہتے ہیں وہیں رہتے ہیں۔ اور اکثر اپنے محبوب کے ساتھ ساتھ نیرو کو بھی میں نے خط لکھا تھا۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ابھی آپ کے سامنے لکھ رہی ہوں۔ میرا مقصد آپ کو ڈرانا نہیں ہے۔ مگر آپ کو اپنی موجودگی کا ثبوت دینا بھی ضروری تھا۔ معاف کرنا۔ اگر ضرورت ہوئی تو اپنے ادھورے پیار کی خاطر دوبارہ آؤں گی۔''

روہن کافی دیر تک حیرت سے ڈائری کو ہی دیکھتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔

''یہ کس نے لکھا ہے۔''

''شروتی آئی تھی۔'' آنند نے لمبی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

......☆☆☆......

''ابھی تک تمہارا موڈ آف ہے؟ اب بھول بھی جا یار۔'' ریتو نے اگلے دن بھی نیرو کو اسی طرح منہ لٹکائے دیکھا تو اس کو سمجھانے لگی۔ ''میری ہی غلطی تھی۔ میں ہی تمہیں وہاں لے گئی تھی۔''

''ارے وہ بات نہیں ہے یار۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیے کی سزا تو ملے گی ہی۔'' نیرو نے منہ لٹکائے ہوئے کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے۔ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔'' ریتو نے پوچھا۔

''گھر والے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکے والے پرسوں مجھے دیکھنے آ رہے ہیں۔'' نیرو نے اپنا موڈ آف ہونے کی اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''ارے واہ، مبار......'' ریتو مبارک کہنا ہی چاہتی تھی کہ نیرو کو غصے سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے رک گئی۔ ''اوہ، سوری، یہ تو بہت برا ہوا۔ سچ میں یار، اب تم کیا کرو گی؟'' ریتو نے اپنے چہرے پر بناوٹی دکھ کا تاثر لاتے ہوئے کہا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ابو نے تو صاف کہہ دیا ہے۔ اس بارے میں میری نہیں چلے گی۔'' نیرو بے بسی سے بولی۔

''کیوں؟ اس بار کیا ہو گیا۔ پہلے بھی تو تمہاری ہر بات مان جاتے تھے وہ۔'' ریتو نے بات کو کریدتے ہوئے کہا۔

''کہہ رہے ہیں کہ یہ رشتہ ہمیں قسمت سے ملا ہے۔ اس کو کسی بھی حالت میں وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے۔''

''اچھا۔ ایسا کس کا رشتہ آ گیا ہے؟'' ریتو نے تجسس سے پوچھا۔

''انسپکٹر نہیں ہے۔ کل جو وہاں آیا تھا۔ آنند۔'' نیرو نے منہ بنا کر کہا۔

''او......واؤ......'' ریتو نے اتنا ہی کہا کہ نیرو نے اس کو مارنے کے لیے اپنی کتاب اٹھا لی۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا یار۔ مگر گھر والوں کی بات سے میں متفق ہوں۔'' ریتو کہے بنا نہیں رہ سکی۔

''تو تم کر لو نا شادی۔ اگر وہ تمہیں اتنا ہی پسند ہے تو مجھے شادی نہیں کرنی ہے تو نہیں کرنی ہے۔ بس۔'' نیرو کے ایک ایک لفظ سے اس کا غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔

''ہائے۔ کاش میرے لیے ایسا رشتہ آیا ہوتا۔ میں تو فٹ سے ہاں کر دیتی۔'' ریتو نے بتیسی نکال کر کہا اور پھر سنجیدہ ہو گئی۔ ''مگر تم ٹالو گی کیسے۔ پرسوں آ کر وہ تمہیں اپنا بنا لیں گے بعد میں انکار کرنے پر تو دونوں گھروں کی بے عزتی ہو گی ایسا مت کرنا پلیز تمہیں شادی نہیں کرنی ہے تو پہلے ہی منع کر دینا۔''

''وہی تو میں سوچ رہی ہوں یار کیسے ٹالوں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''ایک بات اور ہو سکتی ہے؟'' ریتو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' نیرو نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آنند نے کل ہمیں روہن کے پاس دیکھا تھا' کیا پتا ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی اس رشتے سے منع کر دے۔'' ریتو نے دماغ لڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ اس کو کوئی فرق نہیں پڑا شاید۔ کل شام کو پھر آیا تھا گھر پر۔ یہ بتانے کہ اب کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ امی سے بڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا میرے تو دل میں آ رہا تھا کہ کرسی اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔'' نیرو نے اپنا دکھڑا رویا۔

''ہی ہی ہی۔ آج کل تمہیں دوسروں کے سر پھوڑنے میں بہت مزا آنے لگا ہے۔ کل اس کا سر دیکھا تھا سچ مجھے تو بڑا مزا آیا۔ ہی ہی ہی۔'' ریتو نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم میری بات کو سیریس کیوں نہیں لے رہی ہو۔'' نیرو غصے سے بولی۔

''لے تو رہی ہوں یار۔ تم ہی بتاؤ کیا کر سکتے ہیں ہم؟'' ریتو نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بھاگ جاؤں گھر سے؟'' نیرو نے اتنی آسانی سے کہہ دیا جیسے یہ بچوں کا کھیل ہو۔

''پاگل ہو گئی ہو کیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم' بھاگنے کا مطلب پتا ہے تمہیں؟'' ریتو نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''ہاں پتا ہے۔ میں بدنام ہو جاؤں گی کوئی مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ ہمیشہ کے لیے مسئلہ حل۔'' نیرو یقین کے ساتھ بولی۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو یار۔ چاچا۔ چاچی پر کیا گزرے گی' سوچا بھی ہے؟ وہ کیسے رہیں گے' ذرا سوچ اتنی بھی عقل نہیں ہے کیا؟'' ریتو جھلا اٹھی۔

''اوہ۔ مذاق کر رہی ہوں یار۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ شادی تو مجھے کسی بھی صورت نہیں کرنی ہے پرسوں تک گھر والے نہیں مانے تو میں دو چار ہفتوں کے لیے کہیں کھسک جاؤں گی۔'' نیرو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ریتو اس بات پر کچھ کہتی اس سے پہلے ہی شلپا تقریباً دوڑتی ہوئی ان کی طرف آئی۔

''مبارک۔ مبارک۔''

نیرو اور ریتو نے چونک کر اس کو دیکھا۔

''تمہیں کیسے پتا لگا؟'' ریتو نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے مجھے تو سب پتا لگ گیا ہے تمہیں ہی نہیں پتا۔'' شلپا نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''کیا؟'' دونوں ایک ساتھ بول پڑیں۔

''روہن واپس آ گیا ہے۔ وہ بالکل بے قصور تھا۔ کل رات ہی اس انسپکٹر کو ساری بات پتا چل گئی۔'' شلپا نے بتایا۔

ریتو کا دل کر رہا تھا کہ شلپا کو بتا دے کہ نیرو کے لیے اسی انسپکٹر کا رشتہ آیا ہے۔ مگر نیرو کے سامنے اس کی ہمت نہیں ہوئی۔

''اچھا۔ مگر کیسے۔'' ریتو نے پوچھا۔

''ساری بات آ کر بتاؤں گی ابھی مجھے کہیں جانا ہے۔ میری پراکسی لگوا دو گی نا پلیز۔'' شلپا نے منت سی کی۔

''جا۔ جا۔ عیش کر۔ آج کل تم غائب بہت رہنے لگی ہو۔ بعد میں پوچھوں گی کہ آخر راز کیا ہے۔'' ریتو نے ہنستے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

''آج تو بڑی پارٹی ہونی چاہئے۔ کیوں؟'' امان' روہن اور رویندر کے ساتھ آج سارا دن گھر پر رہا تھا جبکہ سمیر گھنٹہ بھر پہلے ہی کہیں باہر نکلا تھا۔ روہن کو آزاد دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ حالانکہ سب کو یقین تھا کہ روہن بے قصور ہے اور جلد ہی واپس آ جائے گا۔ مگر صبح ان کے تھانے میں جانے سے پہلے ہی روہن کو واپس آتا دیکھ کر تینوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔ تب صبح سے ہی سب کے چہروں پر خوشی اور اطمینان صاف جھلک رہا تھا۔

''کس بات کی پارٹی یار۔ بلاوجہ نیرو کے سامنے ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ پتا نہیں کیا سمجھ رہی ہوگی۔ میں تو شروتی والا حادثہ اس کو بتانا ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ خواہ مخواہ کرکری ہو گئی۔'' روہن نے کہا۔

''ارے کچھ نہیں ہوتا۔ سمیر نے شلپا کو فون کر کے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اب تک تو نیرو کو پتا لگ ہی گیا ہوگا کہ تم بے قصور ہو۔ مگر یار یہ تو کمال ہی ہو گیا' شروتی کی روح خود تمہیں بچانے کے لیے آ گئی۔ حیرت ہے یار۔'' امان نے روہن کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بچایا ہی نہیں۔ وہ تو روہن اور نیرو کو ملوانا بھی چاہتی ہے۔ اس کے گھر پر بھی تو خط ملا تھا۔ کمال ہی کمال ہو رہا ہے یار۔ کیا فلمی کہانی چل رہی ہے۔'' رویندر نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔ مجھے شاہ رخ خان کی اس فلم کا ڈائیلاگ یاد آ رہا۔ وہ کیا ہے۔ ہاں۔ ''اتنی شدت سے میں نے تمہیں پانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ذرے ذرے نے ہمیں ملانے کی سازش کی ہے۔'' سچ میں یار۔ تمہیں ملانے کے لیے تو جیسے پوری کائنات نے اپنی طاقت جھونک دی ہے۔ تمہیں ملنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔ بے فکر رہو۔'' امان گہری سانس لیتے ہوئے روہن کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

یہ بات سن کر روہن کا دل خوش ہو گیا اور وہ بھی مسکرانے لگا۔

''اب تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ کوشش تم نے نہیں۔ ٹیلے پر تمہارے انتظار میں تڑپ رہی بھابھی جی کے دل نے کی ہے۔ ہم میں سے کسی نے تھوڑی بہت کی ہے تو وہ بھی میں نے۔ یہ دیکھو میرا اس کا ثبوت ہے' مجھے تو لگتا ہے کہ بھابھی جی نے مستقل نشانی دے دی ہے مجھے۔ کم ہی نہیں ہو رہا یہ گومڑا۔'' رویندر نے کہا اور تینوں ہنسنے لگے۔

......☆☆☆......

''ریتو۔'' شام کو نیرو نے سنجیدہ ہو کر ریتو سے بات کرنی شروع کی۔ اگلے دن شام کو دونوں نیرو کے گھر پر ہی تھیں۔

''ہوں۔ بولو۔'' ریتو نے کہا۔

''اب کیا کروں یار؟' میرا تو دماغ خراب ہو رہا ہے سوچ سوچ کر۔'' نیرو نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھو۔ میں تو یہی کہوں گی کہ گھر والوں کی مان لینے میں ہی تمہاری بھلائی ہے' کیا فائدہ بیکار میں الجھ کر۔ جب کچھ ہو ہی نہیں سکتا' اور پھر شادی کرنے میں برائی ہی کیا ہے' میری یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم شادی سے انکار کیوں کر رہی ہو کوئی اور پسند ہے کیا؟'' ریتو نے سیریس ہوتے ہوئے کہا۔

''تم بکواس کیوں کر رہی ہو۔ کوئی آئیڈیا ہے تو بولو۔'' نیرو غصے سے بولی۔ ''''وہ کل رات آ رہے ہیں اور تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔''

''مذاق نہیں کر رہی یار۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی

ہوں۔ آخر برائی کیا ہے شادی کرنے میں۔ وہ تو سبھی کرتے ہی ہیں۔" ریتو نے اپنی بات پر زور دیا۔

"مجھے نہیں پتا۔ مگر مجھے پکا پتا ہے کہ شادی کرتے ہی میں مر جاؤں گی۔" نیرو اداس ہو کر بولی۔

"اچھا۔ آج تک تو کوئی مرا نہیں۔ تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے۔" ریتو مسلسل جرح کر رہی تھی۔

"میرا دل کہہ رہا ہے اس لیے اور مجھے پتا ہے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ مرنا ہی ہے تو کیوں نہ شادی سے پہلے ہی مر جاؤں۔" نیرو کے چہرے پر گھمبیرتا کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ "اپنے گھر میں تو مروں گی۔"

"دیکھو۔ اب تم بکواس کر رہی ہو۔ پلیز۔ ایسا مت بولو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ چاچا۔ چاچی تمہارا برا تو نہیں چاہتے۔" مرنے کی بات پر ریتو کو غصہ آ گیا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ تم بھی انہی کی طرفداری کرلو۔ مجھے جو کرنا ہوگا میں کرلوں گی۔" نیرو نے کہا اور لیٹ کر تکیے کے نیچے اپنا چہرہ دبالیا۔

ریتو نے نیرو کے پاس سرک کر اس سے تکیہ چھین لیا۔

"اچھا بولو۔ کیا کرنا ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں پاگل۔" ریتو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

ریتو کی بات سنتے ہی نیرو خوش ہو کر اٹھ بیٹھی۔

"دیکھو! میں کل سے ہی امی ابو کے پیچھے پڑی ہوں۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ اب تو بس ایک ہی علاج ہے۔" اتنا کہہ کر نیرو چپ ہو گئی۔

"وہ کیا؟" ریتو نے توجہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"کریمہ کے پاس ہاسٹل میں چلی جاؤں دو چار دن کے لیے۔ اس کو کچھ پتا بھی نہیں ہے اس شادی کے چکر کے بارے میں، میں جا کر امی کو فون بھی کر دوں گی کہ شادی نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں آ جاؤں گی، پھر تو ظاہر ہے کہ انہیں میری شادی کرنے کی ضد سے باز آنا ہی پڑے گا۔" نیرو بولی۔

"تم نے اپنی تو سوچ لی۔ ان کی جو بے عزتی ہوگی وہ۔" نیرو نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو میں اور کیا کر سکتی ہوں یار۔ میں نے امی سے آنند کا نمبر لینے کی بھی کوشش کی۔ مگر وہ مانی نہیں۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔" نیرو نے مایوس لہجے میں کہا۔

"ہوں، دیکھو میں تو صاف بتا رہی ہوں۔ مجھے تو تمہارا ایسا کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کل جو ہوتا ہے ہونے دے۔ بعد میں سوچ لیں گے۔" ریتو نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ارے تمہیں پتا نہیں ہے۔ وہ کل منگنی کے لیے آ رہے ہیں۔ خالی دیکھ کر جانے کی بات ہوتی تو میں مان لیتی۔ مگر گھر والوں کا جلدی شادی کرنے کا پروگرام بن گیا ہے انہی کے کہنے پر۔ اب تم خود سوچو۔ اب زیادہ بے عزتی ہوگی یا بعد میں؟" نیرو نے پوچھا۔

"دیکھو میں کچھ نہیں کہتی۔ تم کو جو کرنا ہے کرلو۔" ریتو گم صم سی بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی۔

"کہیں تم میرا یہ منصوبہ گھر والوں کو تو نہیں بتا دو گی؟" نیرو نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں کرتی میں۔ جو کرنا ہے کرلو میں جا رہی ہوں۔" ریتو کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

ریتو کو پوری رات نیند نہیں آئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے ہوئے وہ نیرو کے اس اقدام سے ہونے والے اثرات کے بارے میں ہی سوچتی رہی۔ کئی بار اس کے دل میں آیا کہ وہ فون کر کے چاچی کو سب کچھ بتا دے۔ مگر اس کے لیے وہ اپنے اندر ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔

صبح اس کی ماں اٹھانے آئی تو آتے ہی بولی۔

"کیا بات ہے بیٹی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" یہ کہہ کر ماں نے ریتو کے ماتھے پر ہاتھ لگا کر دیکھا۔

وہ تیز بخار سے تپ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں لال اور چہرہ بوجھل لگ رہا تھا۔

"اوہ۔ تمہیں بھی آج ہی بیمار ہونا تھا۔ آج تو لڑکے والے شینو کو دیکھنے آ رہے ہیں، چلو ناشتہ کر کے کوئی گولی کھالو۔ ٹھیک ہو جاؤ گی۔" ماں نے اس کو پچکارتے ہوئے کہا۔

ریتو کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دبالیا اور سسکنے لگی۔ اب تک تو سارے محلے کو ہی پتا لگ چکا ہوگا کہ آج شینو کی منگنی ہے۔ اب کیا ہوگا۔ اچانک اس کو اس طرح سے سسکتے دیکھ کر ماں بھی پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا بیٹی! ایسے کیوں رو رہی ہو۔ کوئی بات ہے کیا؟" ماں نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا اور اس کا چہرہ اپنی چھاتی سے لگالیا۔

"کچھ نہیں ماں۔" ریتو اور زیادہ تیزی سے رونے لگی۔

"ارے۔ میری لاڈلی۔ کیا ہو گیا ہے کچھ بتاؤ تو کوئی بات ہے تو بتاؤ۔ تم نے مجھ سے کبھی کچھ چھپایا نہیں ہے۔" ماں اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"ماں۔ وہ شینو۔" ریتو لگاتار موٹے موٹے آنسو گراتے ہوئے سسک رہی تھی۔

"کیا ہو...... پھر سے لڑائی ہو گئی کیا؟ لو چائے تو لو۔" ماں نے میز سے ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے اٹھا کر دیتے ہوئے کہا۔

"وہ شادی نہیں کرنا چاہتی ماں۔ اس لیے گھر سے جا رہی ہے۔" اپنے دل کا غبار نکالتے ہی ریتو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائے بھگوان۔ یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ گھر والے سمجھتے کیوں نہیں۔ اب کیا ہوگا؟" ماں کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"ان کو پتا ہی نہیں ہے ماں۔ وہ بنا بتائے جائے گی۔" ریتو نے کہا۔

"میں ابھی ان کے گھر جاتی ہوں۔ ایسے کیسے چلی جائے گی۔" ماں نے ایک پل گنوائے بغیر چپل پہنی اور تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"ان کو یہ مت بتانا ماں کہ میں نے تمہیں بتایا ہے۔ پھر وہ کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گی۔" جب تک ریتو اپنی بات پوری کرتی ماں باہر نکل چکی تھی۔ پتا نہیں سنا یا نہیں سنا۔

......☆☆☆......

ریتو کی ماں نے نیرو کے گھر پر دستک دی۔ دروازہ نیرو کی امی نے ہی کھولا۔

"آؤ بہن۔ ہم تو آج بڑی دیر سے اٹھے ہیں۔" نیرو کی امی نے مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔

"شینو کہاں ہے۔" ریتو کی ماں کا پہلا سوال ہی یہی تھا۔

"اوپر۔ سو رہی ہے۔ کیوں؟"

"ذرا اسے بلاؤ۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ ٹھہرو رہنے دو۔ میں اوپر ہی چلی جاتی ہوں۔" ریتو کی ماں ان کو بات بتائے بغیر ہی نیرو کو سمجھانا چاہتی تھی۔

"ارے کیوں پریشان ہوتی ہو۔ آؤ چائے پی لو تب تک میں بلا کر لاتی ہوں۔" کہتے ہوئے نیرو کی امی اوپر چلی گئیں۔

......☆☆☆......

دن نکلنے سے پہلے ہی نیرو گھر سے باہر نکل چکی تھی۔ جانے کیا بات تھی۔ مگر اس کا شادی نہ کرنے کا

ارادہ مزید مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس کے دل میں اتنی گھبراہٹ نہیں تھی، جتنا وہ گھر سے باہر قدم رکھنے کے بعد محسوس کر رہی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ اس کے سامنے ایک منزل تھی۔ میرپور خاص کا گرلز ہاسٹل۔ ورنہ اس کا کیا حال ہوتا۔

کبھی گھر والوں کا خیال اور کبھی ان کی عزت کا۔ اس کا دل کہیں نہ کہیں اس کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ مگر اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ بس اسٹینڈ پر جا کر اس نے بجھے ہوئے دل سے میرپور خاص کا ٹکٹ لیا اور بس میں سوار ہوگئی۔

......☆☆☆......

"یہ کیا ہوگیا؟ ہم کیا جواب دیں گے ان کو؟ اس سے تو اچھا کہ ہم اس کی بات مان لیتے۔"

ساری بات کا پتا لگتے ہی امی اور ابو کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ ریتو کے ابا بھی وہیں آچکے تھے۔ سب کے ماتھے پر فکر کی لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔

"میں گاڑی لے کر دیکھ آتا ہوں۔" نیرو کے ابو پریشانی میں مزید کسی کوئی بات کیے باہر نکل گئے۔

......☆☆☆......

"چاچا بس کتنی دیر میں چلے گی۔" نیرو نے بس میں بیٹھ کر کنڈیکٹر سے پوچھا۔

"پانچ سات منٹ اور لگیں گے بیٹی۔ ایک بار مستری کلچ ٹھیک کر دے۔ پھر تو یہاں سے سیدھی پانچویں گیئر میں ہی چلنی ہے۔" کنڈیکٹر نے کہا اور چلا گیا۔

......☆☆☆......

نیرو کے ابو سیدھے بس اسٹینڈ ہی پہنچے اور میرپور خاص جانے والی بس کے پاس جا کر کھڑے ہوگئے۔ اچانک ان کو گھر سے فون آیا۔ وہ واپس پلٹے اور تھوڑی دور کھڑے ہو کر فون ریسیو کیا۔

"ہاں جی۔"

"ریتو کہہ رہی ہے کہ وہ میرپور خاص جانے کا بول رہی تھی اپنی سہیلی کریمہ کے پاس۔" امی نے بتایا۔

ریتو بھی اب تک وہاں آچکی تھی۔

"شکر ہے وہی نا جو ہاسٹل میں رہتی ہے۔"

ہاں جی، وہی۔" امی نے تصدیق کی۔

"ٹھیک ہے۔ تم وہاں فون مت کرنا۔ میں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔ او کے۔" ابو نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا اور جیب میں رکھ کر میرپور خاص جانے والی بس میں چڑھ گئے۔

انہوں نے تمام سواریوں پر نظر ڈالی مگر نیرو وہاں نہیں تھی۔ وہ سیدھے کنڈیکٹر کے پاس پہنچے۔

"اس سے پہلے کوئی بس میرپور خاص کے لیے روانہ ہوئی ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ ایک بس پندرہ منٹ پہلے ہی نکلی ہے، کیوں؟" کنڈیکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" ابو نے کہا اور تیزی سے اترتے ہوئے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر میرپور خاص جانے والی سڑک پر آ گئے۔

......☆☆☆......

پانچ سات منٹ کا وقت ملنے پر نیرو بس سے اتر کے بس اسٹینڈ کے پی سی او میں چلی گئی تھی۔ وہیں سے اس نے کریمہ کے ہاسٹل میں فون ملایا۔ مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ باہر نکلنے ہی والی تھی کہ اس نے ابو کو بس سے باہر کھڑے دیکھ لیا۔ نیرو ایک دم سہم گئی اور واپس پی سی او میں گھس گئی۔

"آپ نے فون کر لیا ہو تو باہر آ جائیے۔ مجھے بھی فون کرنا ہے۔" بوتھ کے باہر کھڑے آدمی نے کہا۔

"ایک منٹ پلیز۔" کہہ کر نیرو نے مجبوری میں ریسیور اٹھا کر نمبر ری ڈائل کیا، مگر اب بھی فون نہیں اٹھایا گیا۔

نیرو نے باہر دیکھا۔ ابو بس سے اتر رہے تھے۔

نیرو نے ایک بار اور فون ملایا۔

"ہیلو۔" اس بار کسی نے فون اٹھا لیا تھا۔

"روم نمبر بارہ سے کریمہ کو بلا دیں گے پلیز۔" نیرو نے درخواست کی۔

"کالج میں تین دن کی چھٹیاں ہیں۔ سب اسٹوڈنٹس اپنے اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔ آپ کون؟" ادھر سے آواز آئی۔ سنتے ہی بری طرح سے گھبرا کر نیرو نے فون رکھ دیا۔ ابو جا چکے تھے اور اسی وقت بس بھی چل پڑی۔ وہ باہر نکلی اور بس اسٹینڈ کے پیچھے چلی گئی۔

"اب کیا کروں۔" مایوسی اور بے بسی سے نیرو کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

......☆☆☆......

ابو نے بس پکڑنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا۔ بس کو رکوا کر وہ اوپر چڑھے مگر اس میں بھی نیرو کو نہ پا کر تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ بس سے اتر کر انہوں نے گاڑی میرپور خاص کی طرف دوڑا دی۔ ہاسٹل جا کر نیرو کا انتظار کرنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ادھر نیرو کے پاس بھی کوئی چارہ نہیں بچا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ اسی شش و پنج میں مبتلا رہی کہ گھر واپس جاؤں یا نہیں۔ پھر جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ وہ باہر نکلی اور ایک تانگے میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ امان کی کوٹھی کے باہر موجود تھی۔

"وہ گھر پر ہیں؟"

"جی ایک منٹ۔" راجو اندر جاتے ہوئے بولا۔

اندر اس کو سب سے پہلے رویندر ملا۔ ”صاحب۔ باہر ایک صاحبہ آئی ہیں۔ آپ لوگوں کو پوچھ رہی ہیں۔ کیا بولوں؟“

”دیکھیں تو سہی کون ہے؟“ کہتے ہوئے رویندر باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی ایک پل کے لیے تو وہ ٹھٹک گیا۔ وہ کچھ دیر تک پاگلوں کی طرح اس کو دور سے ہی دیکھتا رہا۔ پھر اپنے سر کو پکڑ کر تیزی سے اندر بھاگا۔

”بھائی...... بھائی۔“

”کیا ہوگیا چلا کیوں رہے ہو۔“ روہن نے پوچھا۔

”وہ...... وہ...... آپ خود ہی دیکھ لیں۔ میں نہیں بتاتا۔“ رویندر کے چہرے کی چمک بتا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ اچھا ہی ہوا ہے۔

”کہاں دیکھ لوں۔ بتاؤ تو سہی۔ تم اتنے بے تاب کیوں ہو رہے ہو۔“ روہن نے حیرت سے کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ تم مت دیکھو۔ تم کپڑے بدل لو۔ میں لے کر آتا ہوں اندر۔“ رویندر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کپڑے بدل لوں؟“ روہن کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رویندر کو گھور کر دیکھتے ہوئے روہن باہر نکل آیا۔

”آ...... آ...... آپ۔“ روہن کی نیرو کو دیکھتے ہی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ تیزی سے گیٹ کی طرف گیا اور بولا۔ ”آپ یہاں......؟“

”اندر آ جاؤں؟“ نیرو نے مرجھائے لہجے میں کہا۔

”ہا...... ہاں...... آئیے نا آپ...... کیا ہوگیا ہے۔“ روہن نیرو کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بول رہا تھا۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا۔“

نیرو کے چہرے سے لگ نہیں رہا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ اس لیے وہ گہری فکر میں تھا۔

”ہوں...... وہ...... تم کیا کہہ رہے تھے پرانے ٹیلے کے بارے میں۔“ نیرو نے آہستہ سے پوچھا۔

”وہ مجھے سچ میں آپ کے خواب آتے ہیں۔ رویندر کی قسم۔ میں کچھ بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔“ روہن بات کو سمجھ نہیں پایا تھا۔

تب تک امان اور رویندر بھی وہاں آ چکے تھے۔

”آپ بیٹھیں نا۔“ امان نے احترام سے کہا۔

”میرا وہ مطلب نہیں ہے۔“ نیرو نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کہہ رہے تھے نا کہ ٹیلے پر جا کر مجھے سب یاد آ جائے گا۔“

”جی ہاں۔ وہ کہہ رہی تھی نیرو! خواب میں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ روہن اب تک کھڑا ہی تھا۔

”تو چلو۔“ نیرو نے کہا۔

”کہاں؟“ روہن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”پرانے ٹیلے پر۔“ نیرو نے جواب دیا۔

”کیا! سچ؟“ روہن خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ مایوس ہوتے ہوئے بولا۔ ”مگر وہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ وہاں جا کر آج کے آج واپس نہیں آ سکتے۔“

”کتنے دن لگ جائیں گے۔ تین دن، چار دن، ہفتہ۔“ نیرو نے پوچھا۔

”ہاں ایک ہفتے میں تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مطلب یہ کہ ہم آرام سے جا سکتے ہیں، مگر؟“ روہن پوچھنا چاہتا تھا کہ گھر والے کیا کہیں گے۔

لیکن نیرو نے بیچ میں ٹوک دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ چلو۔“ نیرو نے اداس لہجے میں کہا۔

......☆☆☆......

”پتا نہیں کہاں چلی گئی وہ پاگل۔ یہی کرنا تھا تو بتا تو دیتی۔ ہم شادی کینسل کر دیتے۔“ گھر واپس آ کر نیرو کے ابو سب کے ساتھ گہری سوچ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

”اگر ہاسٹل بند ہے تو کہاں گئی ہوگی میری بچی۔ کہیں کچھ ہوگیا اس کو تو؟ وہ تو اکیلی کہیں جاتی بھی نہیں تھی۔“ امی لگاتار آنسو بہائے جا رہی تھیں۔

”بھائی صاحب لڑکے والوں کو تو منع کر دیں۔ کم سے کم وہاں تو کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوگی۔“ ریتو کے ابا نے کہا۔

”کیا کہوں...... کیسے کہوں...... میں میرپور خاص جا رہا تھا تو ان کا فون آیا تھا۔ میں نے تب تو کچھ کہا بھی نہیں ان سے۔ اب تو ان کے رشتے دار بھی آ چکے ہوں گے۔ یہ کیسا دن دکھایا ہے قسمت نے۔“ ابو کی آنکھیں بھی بھیگ چکی تھیں۔

اچانک باہر دو گاڑیاں رکنے کی آواز سنائی دی۔ سب سہم گئے۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ آنند کے گھر والے ہی تھے۔

”اب کیا کیا جائے۔“ بڑبڑاتے ہوئے نیرو کے ابو آنند کے والد کی طرف بڑھے۔

آنند کے والد بڑی گرم جوشی سے ان کے گلے ملے۔

”ارے ایسے چہرہ کیوں لٹکا رکھا ہے یار! یہ لو سنبھالو میرا بیٹا اور شینو بیٹی کو مجھے سونپ دو۔“ انہوں نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

آنند نے انہیں ادب سے نمستے کہتے ہوئے چرن چھوئے۔ مگر حیران پریشان نیرو کے ابو انہیں نمستے کا جواب تک دینا بھول گئے۔

”میرے ساتھ آئیں، کچھ بات کرنی ہے۔“ نیرو کے ابو نے آہستگی سے کہا۔

”دیکھو بھائی جہیز کی بات مت کرنا۔“ آنند کے والد نے خوش مزاجی سے کہا۔

”آپ آئیں تو سہی۔ چلیں اوپر چلتے ہیں۔“ نیرو کے ابو نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اوپر جانے لگے۔

ریتو کے ابا بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ آنے والے مہمانوں کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ باقی لوگ نیچے بیٹھ کر میل ملاپ میں لگ گئے۔

......☆☆☆......

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب۔ آپ کو پہلے ہی پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب۔ یہ تو میری پگڑی اچھالنے والی بات ہوگئی۔“ سارا معاملہ سنتے ہی آنند کے والد کے ہوش اڑ گئے۔ وہ چہرہ جو خوشی سے چمک رہا تھا ایک دم پھیکا پڑ گیا۔

”بھائی صاحب۔ میں مانتا ہوں۔ مگر آپ کسی طرح سے آج کا پروگرام ٹال دیں۔ کچھ دن بعد تو وہ واپس آ ہی جائے گی۔ آپ کو تو پتا ہی ہے شینو کی فطرت کا۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہم کوشش کریں گے وہ مان جائے۔“ نیرو کے ابو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کمال کر رہے ہیں آپ، بھائی صاحب، میرے رشتے داروں کو میں کیا کہوں؟ یہی کہ میری بہو کہیں چلی گئی ہے بنا بتائے، اور پھر آنے کے بعد بھی اس کو زبردستی شادی کے لیے تیار کرنے کا کیا فائدہ، کل کو پھر چلی جائے گی ہمارے گھر سے، نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا بھائی صاحب۔“ آنند کے والد کے لہجے میں شدید غصہ تھا۔

”تو پھر آپ ہی بتائیں۔ میں کیا کروں یہ تو انہونی ہے۔“ نیرو کے ابو نے شرمندگی سے کہا۔

”نہیں، نہیں۔ یہ انہونی نہیں۔ یہ آپ کی نادانی ہے۔ زبردستی آپ کو اڑنا نہیں چاہیے رشتے کے لیے۔ وہ منع کر رہی تھی تو آپ کل تک بھی فون کر کے بات ٹال سکتے تھے، ہم کچھ بھی کہہ دیتے۔ مگر آج کی طرح

ذلت کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔" انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اب پچھلی باتوں کو دوہرانے سے کیا فائدہ بھائی صاحب۔ جو ہونا تا وہ تو ہو چکا یہ سوچیئے کہ اب کیا کر سکتے ہیں۔" ریتو کے ابا نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

"یار اب کرنے کو رہ کیا گیا ہے۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہا۔ مجھے تو بہو چاہیے تھی۔ وہ یہاں ہے ہی نہیں۔" انہیں بہت زیادہ غصہ آ رہا تھا۔

"ایک بات کہوں بھائی صاحب۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو۔" اتنا کہہ کر ریتو کے ابا رک گئے۔

بنا کچھ بولے ہی دونوں ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"اگر آپ کو میرا گھر بار پسند ہو تو میں اپنی بیٹی دینے کو تیار ہوں۔" ریتو کے ابا نے کہا۔

نیرو کے ابو چونک کر ان کا منہ تکنے لگے۔

"یہ تو لمبی کہانی ہے بھائی صاحب۔ آنند نے لڑکی کو دیکھ رکھا ہے۔ شینو اس کو بے حد پسند تھی۔ آپ تو سمجھتے ہوں گے آج کل کے بچوں کو۔ پھر کیا پتا آپ کی بیٹی کو بھی شینو کی طرح آنند پسند نہ آیا تو اور پھر یہ سب ایک ہی دن میں تو نہیں ہو سکتا نا۔" آنند کے والد کے چہرے پر اب بھی غصہ تھا اور ناراضگی بھی۔

"میری بیٹی نیچے ہے۔ میں اس کی ماں اور ریتو کو بلا لیتا ہوں۔ آپ آنند کو بلا لیں۔ دیکھ لیجیے اگر بات بنتی ہے تو۔" ریتو کے ابو نے کہا۔

اور کوئی چارہ اب بچا بھی تو نہیں تھا۔ وہ باہر نکلے اور آنند کو بلا لائے۔

......☆☆☆......

آنند بھی ساری بات سن کر سن رہ گیا اگلے ہی پل اس کو احساس ہوا کہ ہو نہ ہو نیرو دلہن کے پاس ہی ہے۔ مگر پھر وہی بات ہوتی۔ زبردستی کا رشتہ۔

آنند نے اپنے والد کے چہرے پر پھیلی فکر کی لکیروں کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے پاپا۔ جیسا آپ ٹھیک سمجھتے ہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی اس کے والد نے فوراً کھڑے ہو کر اپنے بیٹے کو بانہوں میں بھر لیا۔

"ایسی ہوتی ہے اولاد۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا۔" ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آپ ایسا مت سوچیں پاپا۔ میں نے ریتو کو دیکھا ہے۔ مجھے پسند ہے یہ رشتہ۔ میں ہی پاگل تھا۔ میں کبھی شینو کی آنکھوں کے تاثر کو پڑھ ہی نہیں پایا۔ آپ ریتو سے پوچھ لیں۔ اگر ان کو منظور ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہی ہوگی۔" آنند کا گلا رندھ سا گیا۔

"ہمیں معاف کر دینا بیٹا۔ ہم سے چوک ہو گئی۔" نیرو کے ابو کی آواز میں پچھتاوا تھا۔

"آپ بھی چاچا۔ اوپر والے کی مرضی کے بغیر کبھی کچھ ہوتا ہے کیا؟ کوئی غلطی نہیں ہوئی آپ سے۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔" آنند نے کہا تو نیرو کے ابو بھی خود کو اسے اپنی بانہوں میں بھرنے سے نہ روک سکے۔

باقی آئندہ



دمِ رخصت

طاہر رانا

پینٹا گون کو ریاست ہائے امریکا کا دماغ کہا جاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ عمارت ہے جہاں دنیا کی چھوٹی بڑی ریاستوں کے قسمت کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اس عمارت کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ لیکن اسی عمارت میں قتل کی ایک کامیاب واردات ہوگئی۔ قاتل اور مقتول دونوں اسی عمارت میں موجود تھے مگر تمام تر جدیدیت اور حساس آلات کے باوجود قانون کی نظروں سے روپوش تھے۔

جرم وسزا کے موضوع پر یاد رہ جانے والی ایک دلچسپ کہانی

لوگ کہتے ہیں کہ پینٹا گون میں کبھی کوئی قتل نہیں ہوا۔ درحقیقت یہ بات درست نہیں۔ جب میں نے کرنل سومولو کے ہاتھ میں آٹو میٹک پستول دیکھا تو مجھے موت اپنے سر پر منڈلاتی ہوئی محسوس ہوئی پستول کرنل سومولو کے ہاتھ میں ایک کھلونا سا لگ رہا تھا۔ کرنل بھاری کم جسم کا ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا پستول میری طرف تانتے ہوئے وہ حقارت سے مسکرا دیا۔ خوب جانتا تھا کہ گولی چلنے کی آواز باہر کوئی نہیں سن سکے گا کیونکہ وہ کمرہ ساؤنڈ پروف تھا۔

میں نے اس کی نیلگوں آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جہاں مجھے سنگدلی اور سفاکی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میری پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ ماضی میں میرے اور اس کے مابین سرد جنگ کا نقشہ فلم کی مانند میرے ذہن کے پردے پر لہرانے لگا۔

ہمارا ملک مونٹی بانیا ایک چھوٹا سا غریب ملک ہے۔ جب ہم نے نیٹو میں شمولیت اختیار کی تو ہماری حکومت نے کرنل سومولو اور مجھے واشنگٹن بھیجا۔ دوسرے ملکوں کی طرح ہمیں بھی پینٹا گون کے فارن سیکشن میں ایک دفتر فراہم کیا گیا۔

امریکی وار ہاؤس، وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں متعدد بس اور ٹیکسی گیراج ہیں۔ ایک بہت بڑا ہال ہے جس کے گرد دکانیں، کلینک اور کئی کیفے ٹیریا ہیں تقریباً سترہ ہزار مرد اور خواتین ہر روز یہاں کام کرنے آتے ہیں۔

یہاں دنیا کی ہر شے مل جاتی ہے۔ دانتوں کی بھرائی سے لے کر کپڑوں کی سلائی تک تمام سہولیات زندگی یہاں میسر ہیں۔ یہ کہنا کہ یہاں کوئی قتل نہیں ہوا اس طرح درست ہے کہ قتل کرنے کے بعد لاش کو ٹھکانے لگانا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن کرنل سومولو نے مجھے بتایا کہ وہ کس طرح مجھے قتل کرنے کے بعد میری لاش کو ٹھکانے لگائے گا۔ بلاشبہ اس کا منصوبہ انتہائی نفیس اور اچھوتا تھا۔

پینٹا گون میں ہمارے دفتر کو قائم ہوئے تین ماہ ہی گزرے تھے کہ اچانک یہ تلخ اور تکلیف دہ حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئی کہ میرا باس یعنی کرنل سومولو غدار وطن ہے۔ ہوا یوں کہ ہم ایک رات میسا چیوسٹس ایونیو سے گزر رہے تھے۔ میرا باس مجھ سے آگے چل رہا تھا۔ ایک گلی کے نکڑ پر اس نے توقف کیا اور ایک راہگیر سے سگریٹ جلانے کے لیے ماچس طلب کی۔ سگریٹ جلاتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا اخبار اجنبی شخص کے حوالے کیا اور آگے بڑھ گیا۔ اس اجنبی شخص کو میں نے پہچان لیا۔ وہ مونٹی بانیا کا ایک کمیونسٹ تھا۔ جسے ایک بار میں نے بلوئے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ کرنل سومولو کی اس سے خفیہ ملاقات کا ایک ہی سبب ہو سکتا تھا اور یہ کہ وہ روسیوں سے ساز باز کرنے میں مصروف تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اس امر کی اطلاع فوراً حکام اعلیٰ کو دیتا مگر میں کہتا تو کیا کہتا میرے پاس کرنل سومولو کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ لہٰذا میں ٹھوس ثبوت کا کھوج لگانے میں مصروف ہو گیا اور دس روز تک شکرے کی مانند اس پر نظریں جمائے رہا۔ اس کی فائلوں کی چھان بین کی اچانک اس کے دفتر میں جا گھسا اس امید پر کہ شاید وہ کسی خفیہ دستاویز کی نقل تیار کرتے ہوئے پکڑا جائے۔ اس کوشش میں وہ تو نہیں پکڑا گیا البتہ میں خود ہی اس کی نظروں میں آ گیا۔

ایک شب میں اس کی ڈیسک کی تلاشی لے رہا تھا کہ وہاں سے مجھے کچھ ایسے کاربن پیپر نظر آئے جن پر سیاہی کی لکیروں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے شیشہ نکال کر کاربن پیپر پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے وہ کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے گھبرا کر کاغذ کا پیڈ درست کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ میرا نہیں اس کی سیکریٹری کا کام تھا۔ وہ تاڑ گیا کہ میں کس چکر میں ہوں تاہم اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا یوں ہمارے مابین سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

وہ اس سے اگلے روز شام کا واقعہ تھا۔ میں گھر سے باہر ٹہلنے کی غرض سے نکلا تو ایک موڑ پر ایک کار نے مجھے کچلنے کی کوشش کی۔ قسمت اچھی تھی کہ بال بال بچا۔ میں اسے محض ایک حادثہ ہی سمجھتا اگر اس واقعہ کے دو روز بعد بذریعہ ڈاک مجھے ایک پارسل موصول نہ ہوتا قدرت کو میری عافیت مطلوب تھی کہ پارسل کے اندر رکھا ہوا چھوٹا سا بم پھٹنے سے محفوظ رہا ورنہ اس وقت میں یہ تحریر لکھنے کے لائق نہ رہتا۔ بہر طور ان دو واقعات سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ کرنل سومولو میری جان کے درپے تھا۔

شاید مجھے اس موقع پر امریکیوں سے رابطہ قائم کرنا چاہیے تھا مگر میں اس خیال کو عملی شکل دینے سے اس لیے باز رہا کہ مجھے اپنے ملک کی بدنامی مقصود نہ تھی۔ اس کے بجائے میں نے پینٹا گون کو اپنے لیے گوشہ عافیت جانا کہ کرنل سومولو کے لیے وہاں پر مجھے ٹھکانے لگانے کا کام اتنا آسان نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا بیشتر وقت پینٹا گون میں ہی گزرنے لگا۔ اس امید پر کہ جلد یا بدیر میرے ہاتھ کرنل سومولو کی شہ رگ تک پہنچ جائیں گے پندرہ دن تک میں پینٹا گون میں محصور رہا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اب خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

اس روز اس نے اپنی سیکریٹری کو کچھ مواد جمع کرنے کے لیے محکمہ شماریات روانہ کیا ساتھ ہی ہدایت کی کہ آج اسے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ ایک گھنٹے بعد دو دربان قدیم طرز کی موم سے بنی ہوئی ہوئی ڈمی لیے ہوئے کرنل سومولو کے دفتر پہنچے۔ ڈمی کے سر پر یونیفارم کیپ تھی اور بقیہ جسم پر بھی حربی لباس پہنایا گیا تھا۔

کرنل سومولو نے مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھا اور مجھ سے دریافت کیا۔ ”تمہارا اس یونیفارم کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیوں نہ اسے اپنے ملک کی فوج کے لیے منتخب کر لیا جائے؟ میں نے یہ ڈمی اس لیے مستعار لی ہے کہ اسے اپنے بین الاقوامی رفقائے کار کو دکھا کر ان کا مشورہ طلب کر لیا جائے۔“

اگرچہ مجھے اپنی حکومت کے اس قسم کے کسی منصوبے کا علم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس کی تائید کرنا ہی مناسب جانا۔

وہ بولا۔ ”میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ وردی اصل آدمی پر کیسی لگتی ہے تم ذرا مجھے پہن کر تو دکھاؤ۔“

میں نے بلا جھجک اپنا کوٹ اتارا اور ڈمی کی طرف بڑھا کرنل سومولو اپنے دروازے کے نزدیک گیا اور اسے بولٹ کر دیا۔ میں یہ سمجھا کہ وہ ایسا راز داری ملحوظ رکھنے کی خاطر کر رہا ہے۔ ہم دونوں نے مل کر ڈمی کو

اسٹینڈ سے نیچے اتارا اور میں اس پر چڑھی ہوئی وردی اتار کر پہننے لگا۔ جب میں ساری وردی پہن چکا تو کرنل سومولو اچانک گویا ہوا۔

”یہ ذرا شرٹ اتارنا۔“ میں نے شرٹ اتار دی۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ گولی لگنے کی وجہ سے نئی وردی خراب ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پستول نکال کر میرے سینے کا نشانہ لیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں میری حقیقت کی کیونکر خبر ہوئی۔ بہر طور تمہاری موت اب میری بقا کا واحد راستا ہے۔ لہٰذا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیپٹن ویڈور۔“

خوف اور دہشت کے مارے میرا جسم سرد پڑنے لگا۔ مایوسی کے عالم میں، میں نے کہا۔ ”مجھے قتل کر کے تم بھی زندہ نہیں بچ سکو گے کرنل، کیونکہ یہ پینٹا گون ہے۔“

”میں نے پہلے ہی تمام مسائل کا حل ڈھونڈ رکھا ہے۔“ اس نے انتہائی پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”صبح کے تین بجے تک تمہاری لاش اس ڈمی کی طرح اکڑ چکی ہوگی۔ پھر میں ڈمی کا اسٹینڈ تمہارے بوٹوں کے ساتھ نصب کر دوں گا۔ میرے اٹیچی کیس میں کانچ کی دو آنکھیں موجود ہیں جو تمہاری آنکھوں کی جگہ لے لیں گی۔ اس کے علاوہ تمہارے چہرے، گردن اور ہاتھ پر موم کا کوٹ کر دیا جائے گا۔ اس طرح تمہاری لاش کو ڈمی کا روپ دے کر ٹھکانے لگانا بہت آسان ہو جائے گا۔ میری بہترین کوشش ہوگی کہ دربانوں کو شبہ تک نہ گزرے کہ وہ ایک ڈمی کو واپس لیے جا رہے ہیں یا کسی لاش کو اٹھائے پھر رہے ہیں۔ اس طرح تمہاری لاش با آسانی میری کار میں منتقل ہو جائے گی۔ اب تم ہی بتاؤ کیسی منصوبہ بندی ہے یہ؟“

میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ابھی میں تیس سال کا نہیں ہوا۔ اگلے موسم بہار میں میری شادی ہونا تھی۔ اس دنیائے رنگ و بو میں ابھی میں نے دیکھا ہی کیا تھا۔ اس خیال کی دہشت نے میرے وجود کو سیماب گوں بنا دیا چند ساعتوں کی دوری پر موت کی دلہن باہیں وا کیے میری منتظر تھی۔

میرے ملک کے اکثر لوگ رومن کیتھولک ہیں۔ ہوش و حواس کو جمع کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”میری مالا اور صلیب میرے کوٹ کی جیب میں ہے اگر اجازت دو تو میں انہیں اپنے ہاتھ میں تھام لوں۔“

اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور بولا۔ ”اگر تم مرنے سے پہلے دعا پڑھنا چاہتے ہو تو مجھے اعتراض نہیں مگر یاد رکھو اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی دکھا رہے ہو تو میں فوراً گولی چلا دوں گا۔“

میرے ملک کے اکثر لوگ چاقو پھینک کر ہلاک کرنے میں کمال کی مہارت رکھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی فن آتا ہے برسوں سے ایک چاقو میری جیب میں پڑا رہتا ہے۔ جیسے میں نے چاقو نکال کر اس کی طرف پھینکا اس نے گولی چلا دی۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں دیوار میں دھنس گئی لیکن میرا چاقو کامیابی سے اس کے حلق میں ترازو ہو گیا۔

کانچ کی آنکھیں اس کے چہرے پر لگانا ایک ناخوشگوار فریضہ ثابت ہوا تاہم باقی کام آسان تھا۔ صبح چار بجے میں اس کی لاش کو بہت دور پوٹومیک کی دلدلوں میں پھینک آیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ پینٹا گون میں کبھی قتل نہیں ہوا لیکن اس واقعہ کے بعد حقیقت بدل گئی ہے۔

❀

قاتل خطوط

سلیم انور

عورت اس کائنات میں اک ایسے پھول کی مانند ہے جو اپنے رنگوں اپنی خوشبو سے مردوں کی زندگی کو جنت میں تبدیل کردیتی ہے۔ لیکن یہی عورت جب اپنی جبلت بدلتی ہے تو......

قانون پر بالادستی حاصل کرنے کی ایک نرالی جدوجہد ایک عجیب مجرم کہانی

جب پہلا خط آیا تو اس نے چنداں پروانہ کی۔ وہ کسی نا مانوس تحریر میں تھا اور اس پر کسی کا نام بھی نہیں تھا۔ کوئی پاگل ہوگا اس نے خط پڑھ کر دل میں کہا ہر چند کہ ایک ثانیے کے لیے اسے جھرجھری آ گئی تھی۔ خط میں صرف ایک سطر درج تھی۔ ”میں تمہیں قتل کردوں گا۔“

گیون گرانٹ جانتا تھا کہ اسے قتل کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی بے داغ گزاری تھی۔ پبلک اسکول سے ٹریننگ کالج میں جاتے ہوئے اور پھر وہاں سے اسکول میں جاتے ہوئے جہاں وہ کھیلوں کا انچارج ٹیچر تھا۔ وہ ان ہی اصولوں پر قائم رہا جو اس نے نوجوانی میں وضع کیے تھے اور ان ہی اصولوں کو اس نے موجودہ نسل میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے شاگرد کہا کرتے تھے۔

”گرانٹ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح سست ہے لیکن کھیلتا خوب ہے۔ نفیس آدمی ہے۔“

اب جبکہ وہ چالیس سال کا ہوچکا تھا تو ”نفیس آدمی“ کہلوانے سے اکتا گیا تھا وہ یہ محسوس کرتا تھا جیسے ایک ہی کردار مسلسل ادا کیے جا رہا ہو۔ اسے اپنے چھوٹے بھائی مائیک پر رشک آتا تھا جس نے اس سے کہیں زیادہ ہنگامہ خیز زندگی گزاری تھی اور نفسیات پڑھ کر اب اخبارات اور جرائد کے لیے نفسیات پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ صرف مائیک ہی تھا جس کے سامنے اس نے اپنے بے چین احساسات ظاہر کردیے تھے اور ان خیالات کا اظہار کیا تھا جو ابلنے کو تیار رہتے تھے۔ اس نے اپنے یہ احساسات اپنی سرخ بالوں والی خوب صورت بیوی ایستھر پر بھی کبھی ظاہر نہیں کیے تھے کیونکہ اسے علم تھا کہ عورتیں جس چیز کی سب سے زیادہ طلب رکھتی ہیں وہ تحفظ ہے اور انہیں شوہر کی بے یقینی کے احساسات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

گیون اپنی ڈگر سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا اور اگر اس کے آزاد منش رہنے کے خواب اسے کچوکے دیتے تو وہ اپنی خواہش کو صرف مائیک کے سامنے ظاہر کرتا تھا اور وہ بھی کبھی کبھار۔ وہ یقیناً اس قسم کا آدمی نہیں تھا جسے کوئی قتل کرنا چاہتا ہو۔

دوسرا خط آیا۔ ”میں تمہیں قتل کرنے والا ہوں۔“ یہ بھی گمنام خط تھا۔ اسے بھی گیون نے پہلے خط کی طرح پھاڑ دیا لیکن اس خط نے اسے حواس باختہ ضرور کردیا تھا۔ اس نے اپنے اسکول کے ساتھیوں کا بغور جائزہ لیا اور ایسے اشارے تلاش کرنا چاہے جن سے ان لوگوں کا اس سے حسد یا ناپسندیدگی ظاہر ہوتی اسے ایسا آدمی کوئی نہ ملا۔ دن گزرتے گئے اور وہ اس بات کو بھولتا گیا۔

پھر تیسرا خط ان ہی الفاظ کا آیا اور اب اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اسے اس خط کو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا لیکن بیشتر لوگوں کی طرح اس نے ایسا نہیں کیا کہ کون جھنجٹ میں پڑے اور اپنی تشہیر بھی کرائے اگر مائیک کو نفسیات پر عبور حاصل ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس گتھی کو سلجھا نہ سکے۔

مائیک گرانٹ نے خط کو بغور پڑھا۔

”کوئی سنکی ہے۔“ گیون نے کہا۔ ”یہ تیسرا خط ہے جو مجھے ملا۔“ اس نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”تمہارا کوئی دشمن ہے۔“ مائیک نے پوچھا۔

”میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔“ گیون بولا۔

”اپنے بدترین دشمن تم خود ہو۔“ مائیک نے کہا۔

”آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”تم کب تک ایک ابدی اسکول بوائے ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا رہوگے۔ تمہارے اندر کا بالغ مرد باہر آنے کو بے تاب ہے تم اسے نکلنے نہیں دیتے۔ اس لیے وہ اپنا راستا خود تلاش کرتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”تم نے اس تحریر کو بغور دیکھا ہے؟“

”ہاں میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس کی ایسی تحریر ہو۔“

”اس کی نقل کرو۔“ مائیک نے فاؤنٹین پین اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کس لیے۔“

”جو میں کہتا ہوں وہ کرو اور پھر دیکھو۔“

گیون نے وہ الفاظ نقل کیے۔ ”میں تمہیں قتل کرنے والا ہوں۔“

”اب ان دونوں تحریروں کا موازنہ کرو۔“ مائیک نے کہا۔

گیون نے ایسا ہی کیا۔ پہلے تو ان میں کوئی مماثلت نظر نہ آئی لیکن جب اس نے غور سے دیکھا تو چند حروف بالکل یکساں نظر آئے اس نے خوف زدہ نظروں سے مائیک کی طرف دیکھا۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”سیدھے سادے الفاظ میں تو یہ ہے کہ تمہارا ایک نصف نہیں جانتا کہ دوسرا نصف کیا کر رہا ہے۔“

”دیکھو میں نہیں جانتا کہ کون یہ احمقانہ خطوط لکھ رہا ہے۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں نہیں لکھ رہا ہوں۔ اگر تم یہی مدد کرسکتے تھے تو مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں بتایا ہی کیوں؟“

”میری بات پر غور ضرور کرنا۔“ مائیک نے مشورہ دیا۔

گیون بھنا کر وہاں سے چلا آیا لیکن مائیک کی بات پر غور کرتا رہا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اس رات جب اس نے گیس کا بل ادا کرنے کے لیے چیک کاٹنے کے ارادے سے میز کی دراز کھولی تو اس کی نظر سفید کاغذ کے ایک دستے پر پڑی یہ بالکل وہی کاغذ تھا جس پر اسے خط لکھے جاتے تھے۔

اس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ ”ایستھر کیا تم نے یہ کاغذ یہاں میز کی دراز میں رکھے ہیں۔“

”نہیں ڈارلنگ میں تو تمہاری دراز کے پاس بھی نہیں جاتی تم نے خود ہی وہاں رکھے ہوں گے۔“

”میں نے تو نہیں رکھے۔“

ایستھر نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”جانتے ہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”تم یہ کیوں کہہ رہی ہو؟“

”کچھ دنوں سے تم عجیب وغریب حرکتیں کر رہے ہو۔“

”کون سی عجیب وغریب حرکتیں ایستھر۔“

”یہی کہ تم نے کاغذ اس جگہ نہیں رکھے جبکہ ضرور رکھے ہوں گے۔ رات کو گھر سے نکل پڑتے ہو اور بتاتے نہیں ہو کہ کہاں گئے تھے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم ضرور بتاؤ ڈارلنگ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے لیکن جب کوئی شخص برسوں کی عادت یک لخت چھوڑ دیتا ہے تو دوسرا اسے فوراً محسوس کرلیتا ہے دراصل صرف تم خط لیٹر بکس میں ڈالنے جاتے ہو ایک بار میرا تجسس بڑھا تو میں نے تمہارا پیچھا کیا۔ معافی چاہتی ہوں ڈارلنگ میں تمہاری وجہ سے بے حد پریشان ہوں۔“

”میں نے ایسا کتنی مرتبہ کیا ہے؟“

”صرف تین بار میں اس پر اعتراض نہیں کر رہی ہوں یہ تمہارا گھر ہے کوئی جیل نہیں۔ تمہیں بھی تو اپنا اس طرح باہر جانا یاد ہوگا ہے نا؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور اس پر خوف سا طاری ہونے لگا۔

اگلا خط قدرے مختلف تھا اس میں لکھا تھا۔ ”میں تمہیں گولی ماردوں گا۔“

اس نے خط کو جلایا اور اسکول میں سارا دن الٹی سیدھی سوچوں میں غرق رہا۔ شام کو جب وہ گھر پہنچا تو پینسل نکالنے کے لیے دراز کھولی اس میں ریوالور موجود تھا۔

”ایستھر ادھر آؤ۔“ وہ چلایا۔

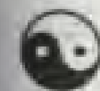
وہ آئی اور ریوالور پر نظر پڑتے ہی بولی۔ ”تم اس کا کیا کروگے؟“

”یہ یہاں آیا کیسے؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں کیا جانوں؟ لیکن تمہیں ملا کہاں؟“

”اس دراز میں۔“

"پھر تو، پھر تو...... پھر تم......!" وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔
"میں نے اسے یہاں نہیں رکھا قسم کھا کر کہتا ہوں۔"
"کیا تمہیں کسی ڈاکٹر سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔" ایستھر نے سرگوشی کی۔
"اوہ خدایا میں اب تھک چلا ہوں میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟"
"بستر پر چلو۔" ایستھر بولی۔ "میں تمہیں نیند لانے کی کوئی دوا دیتی ہوں۔ کوئی فکر نہ کرو ڈارلنگ کوئی فکر نہ کرو۔"
"مجھے خواہش ہونے لگی ہے کہ کاش میں مر جاتا۔"
اگلی صبح علاقے کے پولیس اسٹیشن میں ایستھر گرانٹ کا لرزتی آواز میں فون آیا کہ پولیس فوراً پہنچے اس کے شوہر نے خود کو گولی مار لی ہے۔"
گیون کے ہیڈ ماسٹر نے گواہی دی کہ اس کا اسپورٹس ٹیچر کچھ عرصے سے حواس باختہ سا دکھائی دیتا تھا۔ جیسے اسے خود علم نہ ہو وہ کیا کر رہا ہے۔ لڑکوں تک نے اس بات کو محسوس کیا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس سے کہا تھا تعطیلات بس ہونے ہی والی ہیں۔"
مائیک گرانٹ نے عدالت کو بتایا کہ کس طرح اس کے بھائی نے اسے پراسرار خطوط کے بارے میں بتایا تھا اور مائیک نے اسے بتایا تھا کہ خط کی تحریر اس کی اپنی تحریر سے ملتی جلتی ہے۔ گیون کو ملنے والے تین خطوط میں سے صرف ایک ٹیڑھا میڑھا ردی کی ٹوکری میں ملا۔ ایک ماہر تحریر نے معائنے کے بعد بتایا کہ یہ خود گیون کا ہی لکھا ہوا خط ہے۔ مائیک نے یہ بھی بتایا کہ اس کے خیال میں گیون کا ذہنی توازن بگڑتا جا رہا تھا۔
ایستھر نے اپنے بیان میں اس سفید کاغذ کا ذکر کیا جو میز کی دراز میں ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر خط پوسٹ کرنے جایا کرتا تھا۔ اس کی موت کی شب ایستھر نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھا چھوڑا تھا اور سونے چلی گئی تھی۔ گولی کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ نیچے دوڑی وہاں سب کچھ دیکھنے کے بعد اس نے پولیس کو فون کیا۔
"اوہ خدایا یہ تو نے کیا کیا۔" وہ بیان دیتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
عدالت نے فیصلہ سنایا۔ "خودکشی، ذہنی توازن بگڑ جانے کے باعث۔"
ایستھر نے اپنے غم پر بڑی تیزی سے قابو پا لیا۔ مائیک اکثر اسے تسلی تشفی دینے آتا تھا چھ ماہ کے اندر اندر وہ ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئے لیکن......!
انہیں ہنی مون کے دوران گیون کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ مائیک تو دم بخود رہ گیا لیکن ایستھر پھٹ پڑی اور اس نے پولیس افسر سے کہا۔ "جو تمہیں مطلوب ہے وہ میں نہیں ہوں۔ سچ مچ میں نہیں ہوں۔ اسے مائیک نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔ یہ مائیک تھا میں نہیں تھی۔"
تفتیشی پولیس انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں حکام بالا کو بتایا کہ مائیک اور ایستھر کا معاشقہ چل رہا تھا اور انہوں نے گیون سے چھٹکارا پانے کا منصوبہ بنایا۔ ایستھر اس سے طلاق لے کر دوسری شادی نہ کر سکتی تھی کیونکہ قانوناً وہ اپنے دیور سے اسی صورت میں شادی کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر مر چکا ہو۔ مشترکہ منصوبے سے مائیک خط لکھتا تھا اور ایستھر شوہر کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ اس کی حرکتیں عجیب و غریب ہیں۔ واردات کی رات کو ایستھر نے گیون کو خواب آور گولیاں کھلا دیں اور پھر مائیک کو مطلع کیا۔ مائیک پہنچ گیا اور اس نے گیون کا کام تمام کر دیا۔
پولیس افسر سے پوچھا گیا کہ اسے شبہ کیسے گزرا؟
اس نے بتایا "گیون کی جیکٹ کی وجہ سے ایستھر نے اسے خواب آور گولیاں کھلا کر بستر پر سلا دیا تھا جب مائیک پہنچا تو دونوں نے مل کر اسے اٹھایا اور اسے کپڑے پہنا کر ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر مائیک نے اس کی کنپٹی پر گولی مار کر ریوالور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لیکن کپڑے پہنا کر ایستھر نے اس کی جیکٹ کے سارے بٹن بند کیے جبکہ لوگ خاص کر اپنے گھر میں سارے بٹن بند نہیں کرتے ہیں۔ میرے شبہے کو تقویت اس بات سے ملی کہ بقول ایستھر، گیون سونے کے لیے بستر پر نہیں لیٹا تھا اور اس کے اسی جھوٹ نے سارا پول کھول دیا۔"



پڑتال

صابر حسین

انتہائی خفیہ دستاویزات چرانے والے ایک چور کا سنسنی خیز قصہ اس کا انجام پڑھ کر آپ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

دو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک بڑی کہانی، باذوق قارئین کے لیے بطور خاص

اس نے اگنیشن کا سوئچ آف کر دیا اور کار رینگتی ہوئی اونچی اونچی خودرو جھاڑیوں میں ایک جگہ رک گئی۔ اس نے کار کی عقبی روشنیاں بجھائیں اور چند لمحے خاموشی سے اندر ہی بیٹھا رہا۔ رات کے اس پہر سڑک بالکل ویران اور سنسان تھی اور چہار سُو گہرا سناٹا طاری تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کہ کار جھاڑیوں میں اچھی طرح پوشیدہ ہے، اس نے کار کا دروازہ کھولا اور اتر کر بے آہستگی بند کر دیا۔ کہیں دور سے ٹرین کے گزرنے کی آواز سکوت کا دامن تار تار کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ جیمز بانڈ کی کسی فلم کا کوئی سنسنی خیز منظر ہو۔ وہ بے حد احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا اس بڑے سے سائن بورڈ کے قریب سے گزرا جس پر صنعتی علاقہ تحریر تھا۔ کچھ اور فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دفاتر کی وسیع و عریض عمارت کے اس حصے میں پہنچا جہاں خاردار تاروں کا جنگلا تھا۔ اس کے پیروں میں ربر کے بے آواز جوتے تھے۔
"اب کٹر استعمال کرنے کی باری ہے۔" وہ بڑبڑایا اور چند ہی منٹ میں ان خاردار تاروں کے درمیان اتنا خلا پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جس سے وہ بآسانی گزر کر عمارت کے احاطے میں داخل ہو سکتا تھا۔ اسی دوران اس کی نگاہ ایک بورڈ پر پڑی، لکھا تھا۔
"خبردار! اس احاطے میں ہر وقت خوں خوار کتے اور مسلح محافظ گشت کرتے رہتے ہیں۔"
اس نے ان الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں ایک محافظ اور ایک کتا موجود ہے اور دونوں زیادہ تر عمارت کے دوسرے حصے میں اپنا وقت گزارتے ہیں۔ محافظ اور کتا ہر دو گھنٹے بعد اس بلاک کا ایک چکر لگاتے ہیں اور ان کا اگلا گشت تین بجے سے پہلے متوقع نہیں تھا۔ خاردار تار کاٹنے کے بعد وہ احاطے میں داخل ہو گیا۔ ایسے میں وہ بے حد چوکس نظر آ رہا تھا، اس نے ادھر اُدھر گردن گھما کر سن گن لینے کی کوشش کی لیکن ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ بے حد چوکنے انداز میں مرکزی دفتر کی جانب بڑھا اور اس کی ایک کھڑکی پر چڑھ گیا پھر اس نے اپنی جیب سے چپکنے والے کاغذ کی ایک سیٹ نکال کر کھڑکی کے فریم سے چپکا دی اور اپنی کہنی سے شیشے پر بھرپور ضرب لگائی۔ شیشہ چکنا چور ہو گیا لیکن اس کے ٹکڑے اس کاغذ سے چپکے رہے۔ اس نے کاغذ کو شیشے کے فریم سے چھلکے کی مانند اتار لیا اور کھڑکی کے ذریعے کمرے میں رینگ گیا۔ یہ سیکریٹری کا کمرہ تھا اس کی فضا میں فرنیچر اور پالش کی بُو رچی ہوئی تھی۔ وہ اس کمرے کی میز یا کیبنٹ کو چھیڑنے کی بجائے سیدھا دروازے کی جانب بڑھا، دروازہ غیر مقفل تھا۔ وہ چپکے سے راہداری میں نکل آیا، یہ ایک طویل راہداری تھی اور بالکل ویران تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا صرف دیوار گیر گھڑیوں کی ٹک ٹک، خاموشی کے در پر ہولے ہولے دستک دیتی محسوس ہو رہی تھی اس

نے راہداری کا جائزہ لیا اور بے حد محتاط قدموں سے اسے عبور کر کے سیڑھیاں طے کرتا ہوا بالائی منزل کے ایک کمرے کے سامنے جا رکا۔ جس کے باہر ایک تختی لگی ہوئی تھی اور اس پر "پرائیوٹ جوائنٹ مینجنگ ڈائریکٹر" لکھا تھا۔

اس نے دروازے کے ہینڈل پر طبع آزمائی کی لیکن توقع کے مطابق دروازہ بے حد مضبوطی سے مقفل تھا۔ دفعتہً کتے کے بھونکنے سے سکوت کے سینے میں آواز کا خنجر پیوست ہوگیا۔ وہ یکبارا اچھل پڑا اور دروازے سے چپک کر ساکت ہوگیا۔ کتا دوبارہ بھونکا اور اس کے بعد گہری خاموشی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک اٹھے تھے اور سانس بے ترتیب ہوگئی تھی۔ اس نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی اور ایک بار پھر دروازے کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اسے دروازہ کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ اپنے عقب میں خاموشی سے بند کر دیا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک انتہائی شان دار کمرہ تھا' اس کا فرنیچر بیش قیمت تھا۔ فرش پر سبز رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا' مخملی پردے لٹک رہے تھے اور باہر سے آتی ہوئی روشنی نے کمرے کو نیم روشن کر رکھا تھا۔ اس کی نگاہ ایک دیوار پر آویزاں لمبے چوڑے نقشے پر پڑی' کمرے کے ایک گوشے میں ایک عظیم الشان میز ترچھی رکھی ہوئی تھی اور اس کی بغل میں پانچ فٹ اونچی تجوری تھی' اس نے رک کر کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن فضا پہلے کی طرح پُرسکوت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ احتیاط سے کھینچ دیا اور کمرہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب گیا' میز پر ایک لیمپ رکھا تھا' اس نے لیمپ روشن کر دیا۔

لیمپ کا رخ تجوری کی جانب کرنے کے بعد وہ تجوری کے میکنزم پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ ایسے میں اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ اچانک ایک کھٹکا ہوا اور تجوری کھل گئی۔ اس کے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔

"میکنزم کو سمجھ لینے کے بعد اسے کھولنا کوئی مشکل کام نہیں۔" وہ بڑبڑایا اور اندر سے چمڑے کی ایک بے حد دیدہ زیب اور دبیز سیاہ فائل نکال لی۔ اس پر ابھرے ہوئے الفاظ میں "انتہائی خفیہ" تحریر تھا اور یہ الفاظ لیمپ کی روشنی میں یوں چمک رہے تھے گویا ان میں جان پڑ گئی ہو۔ اس نے فائل کھولی' فائل کے اندر جنگی طیاروں کے نقشے اور انتہائی اہم اور خفیہ معلومات کا خزانہ تھا۔ اس نے ایک نقشہ نکال کر میز پر پوری طرح پھیلا دیا پھر جیب سے ماچس جتنی جسامت کا ایک کیمرہ نکالا' اس نقشے کی دو تصویریں لیں' اسے دوبارہ تہ کر کے فائل میں رکھ کر فائل تجوری میں واپس رکھ دی پھر تجوری بند کر کے لیمپ بجھایا اور کھڑکی کا پردہ سمیٹ کر جتنی خاموشی سے آیا تھا اتنی ہی خاموشی سے چلا گیا۔

پانچ منٹ بعد وہ اپنی کار میں بیٹھا تو رات کے دو بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے' اس نے کار اسٹارٹ کر دی اور جب ایک عالی شان مکان کے سامنے روکی تو گھڑی دو بج کر پینتالیس منٹ بتا رہی تھی۔ اس نے کار سے اتر کر اطلاعی گھنٹی بجائی اور انتظار کرنے لگا۔



مکان کے اندر کسی کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ یکا یک راہداری روشن ہوگئی پھر دروازے کی چٹخنی گری اور اس کے پٹ

تھوڑا سا وا ہو گئے۔

"کون ہے؟" ایک چغہ پوش شخص کا سراپا نمودار ہوا۔

"میں گریگری ہوں' مجھے اندر آنے دو۔"

"گریگری؟ اس وقت کیوں آئے ہو؟ کیا کوئی پریشانی لاحق ہوگئی ہے؟" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

گریگری کمرے میں داخل ہوگیا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ہف؟" اس نے کہا۔ "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا' وہ میں نے پورا کر دکھایا ہے۔" اس نے ننھا سا کیمرہ میز کی جانب اچھال دیا۔

"کیا؟" ہف نے بے یقین نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ "آج رات؟"

"ہاں۔" گریگری نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیمرے میں اس کی فلم موجود ہے مجھے اس کام میں بہ مشکل بیس منٹ لگے۔"

"اور وہ محافظ...... اور وہ کتا؟"

"انہوں نے کوئی پریشانی کھڑی نہیں کی' حقیقت یہ ہے کہ نہ تو میں نے انہیں دیکھا اور نہ ہی ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔"

ہف نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد لب کھولے۔

"کیا پیو گے...... اسکاچ؟"

"ہاں اسکاچ ہی لے آؤ۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ......" ہف کے انداز سے بے یقینی ظاہر ہو رہی تھی۔

"اب تم مجھ سے ضرور اتفاق کرو گے کہ میں درست کہہ رہا تھا۔" گریگری نے مسکرا کر کہا۔

کلام

میری وفا کا اس نے کچھ یوں صلہ دیا ہے
منزل بھی مجھ سے چھینی' رستہ مٹا دیا ہے
سب معتبر رشتے مرے نزدیک ہوگئے تھے
ایک اک کر کے اس نے سب کو ہٹا دیا ہے
اس زندگی کو پا کر گم صم سی ہوگئی ہوں
ان حادثوں نے مجھ کو بُت ہی بنا دیا ہے
صبر مجھ پہ ختم ہوا اور ستم اس پر تمام
خوشیوں کی خواہشوں کو خود ہی دبا دیا ہے
حاصلِ زیست جسے سمجھا وہ دشمن نکلا
حوادث کے تسلسل نے پردہ اٹھا دیا ہے
(زیبا سعید...... کراچی)

"ہاں! بے شک تم ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔" ہف نے اسکاچ کا گلاس تھامتے ہوئے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ "اب جب کہ ہمیں اتنا اہم فوجی ٹھیکہ مل گیا ہے تو ہمیں اپنے حفاظتی اقدامات مزید سخت کرنے پڑیں گے۔ خود ہی سوچو اگر ایک مینجنگ ڈائریکٹر اتنی آسانی سے وہاں داخل ہو کر فوجی راز چرا سکتا ہے تو کسی ماہر جاسوس کے لیے تو یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔"

"یہی بات میں تمہیں شروع سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آ رہی تھی۔" مینجنگ ڈائریکٹر گریگری نے تفکر آمیز انداز میں کہا اور اسکاچ کا گلاس تھام لیا۔

○

گردش

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے. دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا. یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے. اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں. کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں. جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں. وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے.

اس داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں. کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں. کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے.

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش ودلچسپ سلسلے وار کہانی

میں بہت گہری نیند میں تھی جب فون کی تیز بیل نے میری نیند میں دخل اندازی کی۔ میں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی اور دوبارہ گہری نیند کی وادیوں میں اترنے لگی' بیل بج بج کر خاموش ہوگئی لیکن ایک بار پھر بیل بجنے لگی' وہ مسلسل بج رہی تھی' اچانک نیند میں ہی حشام میری آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا اور اس نے پیار سے مجھے پکارا۔

''سرمئی...... سرمئی اٹھوناں......''

اور میں ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فون کی بیل اب بھی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے آدھی رات کو آنے والے اس فون کو سننے کے لیے فون کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں' تب ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی روشن اسکرین پر میری نگاہ پڑی تو میں نے جھپٹنے کے انداز میں فون اٹھالیا اور اسکرین پر نمبر دیکھا' وہ طلال انکل کا نمبر تھا' میں نے جھٹ فون کان سے لگایا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی...... جی انکل...... حش...... حشام کیسا ہے......؟''

''سرمئی بیٹی حشام......!'' میری آواز سن کر انکل نے صرف اتنا کہا اور رو پڑے۔

''کیا ہوا حشام کو......؟'' انکل کے رونے سے میں حواس باختہ ہوگئی اور میرے منہ سے چیخ کے انداز میں نکلا۔

''سرمئی بیٹی حشام...... حشام کو ہوش آ گیا ہے بیٹی...... میرا حشام زندگی کی جانب لوٹ آیا ہے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں ہیں بیٹی......!'' انکل نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا......! حشام کو ہوش آ گیا۔'' میں خوشی کے مارے بیڈ سے اتر گئی۔ ''لیکن آپ رو کیوں رہے ہیں......؟'' میں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

''بس ایسے ہی......'' وہ جھینپ گئے۔ ''یہ تو خوشی کا رونا ہے۔ تم اس وقت میری دلی اور ذہنی کیفیت کا اندازہ بھی نہیں کرسکتیں...... حشام سے مل کر اور اس سے بات کر کے میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں ہنسوں یا روؤں...... اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارا حشام ہمیں لوٹا دیا ہے۔ وہ تم سے اور تمہاری آنٹی سے ملنا چاہتا ہے...... تم ایسا کرو کہ انہیں بھی یہ خبر سنا دو اور انہیں ساتھ لے کر اسپتال آجاؤ۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ حشام اب خطرے سے باہر ہے۔''

اتنا کچھ بتانے کے بعد انکل نے فون بند کردیا اور پھر حقیقت میں مارے خوشی کے میری آنکھیں بھی چھلک پڑیں اور میں ننگے پاؤں ہی کمرے سے نکل کر آنٹی کے کمرے کی جانب دوڑ پڑی۔

میں اندر کمرے میں گئی تو فرش پر جائے نماز بچھائے امی اور آنٹی دونوں محو دعا تھیں۔

''آنٹی...... امی'' میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں دوڑتی ہوئی آنٹی کی جانب بڑھی اور ان کے گلے لگ کر سسک پڑی۔

''کیا ہوا سرمئی بیٹی......!'' میری اس حرکت سے آنٹی کا سارا جسم خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا اور انہوں نے لرزتی ہوئی مدھم آواز میں پوچھا۔

''آنٹی ہمارے حشام کو ہوش آ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زندگی کی جانب لوٹا دیا ہے۔ اس نے انکل سے بات بھی کی ہے۔ وہ آپ کو اور مجھے یاد کررہا ہے......'' میں نے خوشی سے لرزتی اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے......!'' آنٹی کے سینے سے ایک گہری سانس نکلی اور انہوں نے اتنا کہا اور بے ساختہ سجدے میں گر گئیں۔ پھر وہ دیر تک سجدے میں سر رکھے روتی رہیں...... تب میں نے انہیں کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور ایک بار پھر ہم دونوں گلے لگ گئے۔

امی نے بھی گلے لگا کر آنٹی کو مبارک باد دی۔ اماں اور بابا بھی ہماری آوازیں سن کر آ گئے...... سب نے اس خوشی کی خبر پر شکر ادا کیا۔

میں نے گارڈ آصف کو کال کی جو گھر کی اوپر والی منزل میں موجود تھا۔ میری پہلی ہی بیل پر اس نے فون ریسیو کرلیا اور بولا۔

''یس میم......!''

''آصف آپ ابھی فوراً نیچے آجائیں' ہمیں اسپتال جانا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا۔

''او کے میم آئی ایم جسٹ کمنگ۔'' اس نے بھی اسی تیزی سے جواب دیا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

......☆☆☆......

سرمئی کی سسکیاں سن کر میں بری طرح گھبرا گیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ حشام کو گولیاں لگی ہیں اور وہ بہت زخمی حالت میں اسپتال میں ہے' وہ اتنی زیادہ پریشان تھی کہ اس نے نواب سطوت کے اس ری ایکشن کے بارے میں بھی معلوم نہیں کیا جو روشن آراء کی جانب سے آنے والی ای میل کو دیکھ کر ہوا ہوگا۔

میں نے سرمئی سے مزید تفصیلات معلوم کیں اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں کوشش کروں گا کہ حشام کو دیکھنے کے لیے اسپتال آؤں تو اس نے مجھے سختی کے ساتھ منع کردیا' میرے وجہ پوچھنے پر بھی اس نے فی الحال وجہ نہیں بتائی اور کہا کہ وہ بعد میں مجھ سے تفصیلی بات کرے گی بس مجھ سے دعا کی التجا کی' میں نے بھی کہا کہ یہ کوئی کہنے کی بات ہے' پھر اس نے فون بند کردیا۔

سرمئی سے بات کرنے کے بعد مجھے نیند ہی نہیں آئی' میں بیڈ پر پریشان لیٹا سرمئی اور حشام کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دل سے پسند کرتے ہیں اور ساتھ زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ روشن آراء آنٹی نے بھی ایک ماں کی حیثیت سے حشام کو دیکھا اور اپنی بیٹی کی پسند پر

اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ سرمئی کے روپ میں اپنی بہن فائزہ کو دیکھا تھا' ایک بھائی کی حیثیت سے جو ارمان اور جذبات میرے دل میں فائزہ کے لیے تھے وہ اب سرمئی کے لیے میرے دل میں تھے اور میری دلی دعا اور تمنا تھی کہ سرمئی حشام کے ساتھ ایک خوشگوار اور مطمئن زندگی گزارے...... لیکن اب حشام موت وزندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا اللہ نہ کرے کہ اسے کچھ ہو ورنہ سرمئی جیسی لڑکی جو زندگی میں ایک بار ہی کسی کو اپنا سب کچھ مانتی ہیں' جی نہیں سکے گی۔

میں بہت سی فکر اور اندیشوں میں گھرا ہوا تھا کہ اذان فجر کی آواز میرے کانوں میں آئی اور میں بے ساختہ فجر کی نماز کی ادائیگی کے لیے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

نماز کے بعد گڑگڑا کر سچے دل سے حشام کی صحت اور زندگی کی دعا کی' پھر چائے وغیرہ پی کر میں نے ایک بار پھر نواب کے کمرے کا رخ کیا۔ میں نے نواب کے کمرے کے بند دروازے پر ہلکی سی دستک دی یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ جاگ گیا ہے یا نہیں' اگر اندر سے اس کا جواب آتا تب ہی میں اندر داخل ہوتا۔

میری دستک سنتے ہی نواب کی دھیمی آواز سنائی دی۔

''آجاؤ شمروز......'' تو میں دروازہ کھول کر یہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہوگیا کہ اسے کیسے پتا کہ دروازے پر میں ہوں اور اس بات کا اظہار میں نے اندر پہنچتے ہی کر ڈالا۔

''ارے نواب صاحب آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں آیا ہوں۔''

''میں تمہاری دستک پہچانتا ہوں اور مجھے یہ بھی پتا تھا کہ صبح ہوتے ہی تم میری خیریت معلوم کرنے کے لیے ضرور آؤ گے......'' وہ تکیے کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''رات کو تو مجبوراً مجھے جانا پڑا...... لیکن یقین جانیں نواب صاحب کہ رات کو مجھے نیند ہی نہیں آئی' بار بار یہ دل چاہ رہا تھا کہ آپ کو آ کر دیکھ لوں...... لیکن یہ سوچ کر نہیں آیا کہ اگر آپ سو رہے ہوں گے تو میں خواہ مخواہ آپ کے آرام میں مخل ہو جاؤں گا۔ اب کیسی طبیعت ہے......'' میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔

''اب بہت بہتر ہوں......!'' اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ اب بھی مجھے فریش نہیں لگ رہے ہیں۔ ٹھہریں میں پہلے آپ کا بی پی چیک کروں گا۔ بعد میں دوسری باتیں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کا بی پی چیک کیا' جو کہ اب بھی ہائی ہی تھا' لیکن اتنا تشویشناک نہیں تھا۔

''تھوڑا سا اب بھی بڑھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ابھی تک ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوئے ہیں۔ میں نے کہا تو ہے کہ آپ اپنی ساری فکریں اور ٹینشن مجھے دے دیں' میں جو ہوں پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔'' میں نے مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا تو وہ بولا۔

''ایک وقت تھا جب جوانی تھی...... بڑی سے بڑی ٹینشن بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ پاتی تھی۔ لیکن برا ہو اس بڑھاپے کا...... جہاں جسمانی طاقت ڈاؤن ہو...... ساری قوتیں ہی ڈاؤن ہو جاتی ہیں۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''اسی کا نام زندگی ہے نواب صاحب...... یہ وقت تو سب پر ہی آتا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ سر ہلانے لگا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہا' وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا' میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا

کیونکہ میں یہ بات جانتا تھا کہ وہ کن پریشان کن سوچوں میں گم ہے' بڑھاپا ایک ایسی بلا کا نام ہے جو ہر ایک انسان سے جو زندہ ہے' اس کی مرضی کے بغیر اس سے آن لپٹتا ہے' ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا ایسے بہت سے مریضوں سے واسطہ پڑتا تھا جو اپنی گھٹتی ہوئی قوتوں سے خوفزدہ تھے' عورت اور مرد دونوں ہی بڑھاپے کے نام سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ عورت کو اپنی خوب صورتی اور حسن کے فنا ہونے کا غم ہوتا ہے تو مرد کے آگے بھی بہت سی سوچیں ہوتی ہیں۔ خاص کر وہ مرد جس نے اپنی جوانی عیاشیوں میں گزاری ہو' اس لیے کسی دانا کا قول ہے کہ ''جوانی کی دولت کو احتیاط سے خرچ کرو...... کیوں کہ یہ بہت تیزی سے گھٹتی ہے۔''

نواب سطوت بھی اس وقت یہی سوچ رہا ہوگا کہ اس نے اپنی جوانی میں جتنی طاقت حاصل کی تھی' اس کے ماتحت اور اس کو اپنا روحانی پیشوا ماننے والے لوگ صرف اس کی آواز اور دبنگ لہجے سے ہی سہم کر رہ جاتے تھے' لیکن شاید اب اس کا دم خم ختم ہو رہا تھا' اس کو بڑھاپے اور بیماریوں نے آن گھیرا تھا' ذرا سی ٹینشن ہی اس کا بلڈ پریشر بڑھا دیتی تھی' اس کے معائنے کے بعد مجھے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی دل کی بیماری میں بھی مبتلا ہونے والا تھا' وہ نہیں چاہتا تھا کہ عام لوگوں کو اس کی بیماری اور کمزوری کے بارے میں پتا چلے' اس لیے میرے بہت کہنے پر بھی وہ ہاسپٹل نہیں گیا' اسے پراپر چیک اپ کی ضرورت تھی۔

میں نواب کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا' کتنے ہی لمحے چپ چاپ گزر گئے' پھر میں اپنی سوچوں کے حصار سے باہر آیا اور اسے مخاطب کیا۔

''کن سوچوں میں گم ہیں نواب صاحب......؟ میں نے آپ سے کہا ہے کہ آپ اپنے ذہن اور اعصاب پر کسی بھی قسم کی کوئی فکر سوار مت کریں۔ آپ ابھی تک نارمل حالت میں نہیں آئے ہیں۔''

''آں...... ہاں......!'' میرے مخاطب کرنے پر وہ بری طرح چونک پڑا۔ مجھے اس لمحے اس کے چہرے پر ایک عجیب سا خوف دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے نواب صاحب......!'' میں نے بہت ملائم اور محبت بھرے لہجے میں اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا ٹینشن ہے آپ کو...... آپ مجھے بتائیں اور بے فکر ہو جائیں' میں آپ کی تمام فکریں اور پریشانیاں اپنے سر لے لوں گا۔'' یہ بات کہتے ہوئے میرے لبوں پر ایک نرم مسکراہٹ تھی۔

''تم ایک بہت ہی اچھے لڑکے ہو شمروز...... کاش اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے جیسا ایک ہی بیٹا عطا کیا ہوتا...... اگر وہ مجھے ایک بیٹا دے دیتا تو اس کی رحمت کے خزانے میں کیا کمی آ جاتی۔'' اس نے بہت حسرت بھرے انداز اور تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

''آپ اتنی دیر سے یہی بات سوچ جا رہے ہیں نواب صاحب...... میں اپنے آپ کو آپ کا بیٹا کہنے کی گستاخی اور جسارت تو نہیں کر سکتا لیکن اپنے آپ کو آپ کا غلام ضرور تصور کرتا ہوں۔ ایک ایسا غلام جو اپنے آقا پر ہر وقت جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔'' میں نے دل میں اسے ایک ناقابل اشاعت گالی سے نوازتے ہوئے چہرے پر منافقت کی نرمی اور مسکراہٹ سجاتے ہوئے چاپلوسی سے کہا۔

''میں حیران ہوں شمروز کہ تمہارے اندر ایسی کون سی خوبی پوشیدہ ہے کہ مجھے تم اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتے ہو' بالکل میرے کسی اپنے کی طرح......'' اس نے میرا ہاتھ ہلکے سے دباتے ہوئے کہا۔

''یہ سب اللہ کی جانب سے ہے۔'' میں نے کہا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو میں تم پر بہت ٹرسٹ کرنے لگا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر بار بار میرے دل میں ایک خیال کچوکے مار رہا تھا کہ میرے بعد میرا وارث کون ہوگا' سات پشتوں سے اس گدی کے اصل وارث ہماری نسل چلی آرہی ہے' لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ میرے بعد میری یہ گدی خود بخود اس الو کے پٹھے 'لودھی' کے بیٹے کو مل جائے گی' وہ میرا چچازاد بھائی ہے اور اس کے پاس خاندانی بیوی سے دو بیٹے موجود ہیں' لیکن اب نہ جانے کیوں تمہاری باتوں سے مجھے ایک اطمینان سا ہو چلا ہے' اب میں کافی حد تک ریلکس ہوں۔"

"کیا ارادہ ہے' کیا ایک شادی اور کررہے ہیں۔" میں نے بڑی جرات کرکے یہ سوال کر ڈالا۔

"شادی کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو ابھی آپ کی عمر اتنی تو نہیں ہوئی ہے کہ آپ ایک بیٹا پیدا نہ کرسکیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"جو بات میں محسوس کرتا ہوں' تم اس سے ناواقف ہو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"پھر یہ اتنی حسین اور جوان لڑکیاں آپ کے بیڈروم میں کیا کرتی ہیں؟" میں اس کی بات کی گہرائی میں چھپا راز جان گیا اور حیرت سے کہا۔

"وہ تو بس یوں ہی دل لگی...... خیر چھوڑو تم اس موضوع کو۔" اس نے جھینپ کر کہا اور بات بدلتے ہوئے بولا۔ "آج جمعرات ہے ناں۔"

"جی ہاں آج جمعرات ہے' کیوں آج کوئی خاص کام ہے کیا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں آج رات مجھے محفل میں جانا ہے' میرا خیال ہے کہ آج تم بھی میرے ساتھ اس محفل میں چلو۔"

"محفل...... کیسی محفل؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہر اسلامی مہینے کی پہلی جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب میں ایک محفل ہوتی ہے اور میں لوگوں کے روبرو ان کے مسائل سنتا ہوں اور ان کی دادرسی کرتا ہوں۔ بہت دور دور سے لوگ اس میں شرکت کے لیے آتے ہیں اور اس محفل میں شرکت کے لیے بہت پہلے ہی سے انٹری کارڈ حاصل کرنا پڑتا ہے' اس انٹری کارڈ پر محفل میں آنے والے شخص کا پورا بایوڈیٹا فل کیا جاتا ہے اور پھر اسے کمپیوٹر میں فیڈ کردیا جاتا ہے۔" نواب نے جواب دیا۔

"ایسا کس لیے نواب صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی ایک تو احتیاطاً کیا جاتا ہے دوسرے ہمیں لوگوں کے مسائل بھی تو حل کرنے ہوتے ہیں۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بہت خوب!" میں نے متاثر ہونے کی اداکاری کی اور کہا۔ "ٹھیک ہے' نواب صاحب' میں آج رات ضرور چلوں گا۔ اب یہ ساری باتیں چھوڑیں' میں آپ کا ناشتہ بھجواتا ہوں۔"

"تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے' ناصر کو معلوم ہے کہ مجھے کیا کھانا ہے وہ ناشتہ لے آئے گا۔ تم آرام کرو...... اور ہاں میں نے دوسرا لیپ ٹاپ منگوایا ہے' تم ذرا چیک کرکے بتانا کہ اس کمینی عورت کی کوئی دوسری ای میل تو نہیں آئی۔" اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"اس ای میل کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے کہا تو تھا کہ جب اسے آپ کی جانب سے کوئی جواب ہی نہیں ملے گا تو خود ہی خاموش ہوکر بیٹھ جائے گی' اس کام کو تو آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں شمروز تم نے مجھ سے وعدہ بھی تو کیا ہے کہ ان لوگوں کو تلاش کرو گے۔" اس کا اشارہ اپنے نام نہاد بیٹا اور بیٹی کی جانب تھا۔

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے' بس آپ کی صحت کی جانب سے اطمینان حاصل ہوجائے پھر اس کام کا آغاز کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

پھر اس سے اجازت لے کر میں اپنے روم میں آگیا۔ سب سے پہلے حشام کی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے سرمئی کا فون ملایا...... لیکن اس سے رابطہ نہیں ہوپایا' میں نے سوچا کہ ہاسپٹل جاکر خود ہی دیکھ آتا ہوں پھر سرمئی کی بات یاد آگئی اس نے مجھے ہاسپٹل آنے سے منع کردیا تھا' خیر ناشتے سے فارغ ہوکر میں اپنی بقیہ رات کی نیند پوری کرنے لگا۔

سوکر اٹھا تو ایک بار پھر سرمئی کا نمبر ملایا لیکن فون پر وہی ریکارڈنگ سنائی دی کہ فی الحال رابطہ ممکن نہیں ہے' میں پریشان ہونے لگا کہ اللہ خیر کرے کیا بات ہے' سرمئی سے بات کیوں نہیں ہوپارہی ہے۔ میرے پاس سرمئی کے گھر کا نمبر بھی نہیں تھا' پھر سوچا کہ گھر میں چکر لگا کر پتا کروں کیا صورت حال ہے' پھر خیال آیا کہ اگر اس دوران نواب نے مجھے طلب کیا اور میں گھر میں نہ ملا تو وہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ میں کہاں ہوں' پھر میں کیا جواب دوں گا کیونکہ میں نے تو اس سے یہی کہا تھا کہ جب تک اس کا بلڈ پریشر نارمل نہیں ہوجاتا میں گھر پر ہی رکوں گا۔

دوپہر ہوگئی تھی ابھی تک تو نواب نے مجھے طلب نہیں کیا تھا' ہاں رات کو مجھے اس کے ساتھ ضرور جانا تھا' میری تو خواہش ہی یہی تھی کہ میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان لوں ذرا دیکھوں تو وہ اپنے لچھے دار گفتگو اور لہجے سے کس طرح سے نادان لوگوں کو مسحور کرتا ہے' سو میں پوری طرح تیار تھا جانے کے لیے۔

اس وقت دن کے تین بجنے والے تھے' مجھے بھوک کا شدید احساس ہوا' سوچا کہ کچھ کھالیا جائے پھر کمرے سے اس خیال سے نکلنے ہی والا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ سرمئی کا نیوز چینل لگا کر دیکھتا ہوں ہوسکتا ہے حشام کے بارے میں کوئی نیوز آرہی ہو' ویسے بھی یہ ٹائم نیوز ہی کا تھا۔ میں واپس پلٹا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کردیا' سرمئی کا نیوز چینل ہی لگا ہوا تھا۔ میں نیوز سننے لگا' صدر اور وزیراعظم کی بور اور بیکار مصروفیات کی لمبی نیوز کے بعد نیوز کاسٹر نے حشام کا نام لیا تو میں پوری طرح ٹی وی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ "ہمارے نمائندے حشام طلال ہنوز بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ ڈاکٹرز نے چھتیس گھنٹے اس کی زندگی کے لیے اہم بتائے ہیں۔ اگر اس دوران انہیں ہوش آگیا تو بہتر ہے ورنہ خطرہ ہے کہ وہ لمبے عرصے کے لیے کومے میں بھی جاسکتے ہیں۔

حشام کی نیوز سننے کے بعد میں نے ٹی وی آف کردیا۔ اس پیارے اور ہنس مکھ لڑکے کے لیے میرا دل بہت پریشان ہورہا تھا' دل سے بے ساختہ یہ دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد از جلد ہوش کی دنیا میں واپس لے آئے۔

لیکن یہ دعا مانگتے ہی میرا دل اپنے رب کے حضور شرمسار ہوگیا اور ندامت کے بوجھ تلے دل سے یہی آواز آئی۔

"ڈاکٹر شاہ زمان اب تم ایک نیک اور شریف انسان نہیں رہے جو تمہاری دعائیں معتبر ہوں۔ تم اب شمروز بن چکے ہو' قاتل' زانی اور دھوکے باز...... اب تمہاری دعاؤں میں وہ اثر کہاں......! لیکن پھر

ایک اور آواز آئی۔

''نہیں شمروز تو تائب ہو چکا ہے اور اس وقت شمروز کا روپ وہ نہیں ہے جو پہلے تھا۔ اللہ اپنے ایسے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے جو اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اس کے آگے شرمندگی اور ندامت سے سر جھکاتے ہیں اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے اس سے معافی کے خواستگار ہوتے ہیں۔ میرا اللہ میری خلوص دل سے کی گئی اس دعا کو ضرور سنے گا۔ میری فائزہ (سرمئی) کو اس کا حشام ضرور ملے گا۔

تھوڑی دیر پہلے لگنے والی شدید بھوک ایک دم ہی ختم ہو گئی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں خود اسپتال پہنچ جاؤں۔ حشام کی کیفیت خود اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کا علاج کروں...... لیکن میں بہت مجبور تھا میرے قدموں کو ان دیکھی لاتعداد زنجیروں نے جکڑا ہوا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بہت جلد اپنے آپ کو ان زنجیروں سے آزاد کرا لوں گا۔

جس شخص نے مجھے ایک مسیحا سے حیوان بنایا تھا میں خود کو اس کی کمزوری بنا لوں گا...... آج اس نے مجھ سے جی بھر فائدہ اٹھایا ہے...... کل میرا ہوگا۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھا جب میرے سیل فون پر وائبریشن محسوس ہوئی۔ میں نے تیزی سے اس خیال سے فون اٹھایا کہ سرمئی کی کال ہوگی لیکن وہ نمبر میڈم روزی کا تھا۔ حشام کی پریشانی اور نواب کے ساتھ کی مصروفیت نے وقتی طور پر میرے دل سے میڈم روزی کا خیال محو کر دیا تھا پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہم نے دوبارہ ملاقات کرنے کے خیال سے ایک دوسرے کے ساتھ موبائل فون کے نمبروں کا تبادلہ کیا تھا۔ میں نے فون ریسیو کیا اور کہا۔ ''ہیلو میڈم روزی کیسی ہیں آپ......؟''

''میں بالکل فٹ فاٹ......! آپ کیسے ہیں ڈاکٹر شاہ زمان۔ آپ نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔'' اس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ سے ملاقات کی خواہش تو ہے لیکن کچھ مصروفیات تھیں۔ ویسے ابھی ہماری پہلی ملاقات کو اتنا عرصہ تو نہیں ہوا کہ آپ نے شکایت کر دی......!'' میں نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے لہجے کو خوش گوار رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ...... لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا ہی محسوس ہوا...... اس روز کی ہماری ملاقات کچھ تشنگی چھوڑ گئی آپ کو جانا بھی تو تھا۔'' اس نے کہا۔

''تشنگی بھی دور ہو جائے گی جب ہم مل بیٹھیں گے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''مطلب......؟'' اس نے کہا۔

''مطلب کو چھوڑیں اور سنائیں کیسی ہیں۔ آپ کے بندوں نے آپ کو میری مصروفیات کے بارے میں نہیں بتایا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ کی مصروفیات کے بارے میں بھلا کیسے پتا چل سکتا ہے آپ کوٹھی سے باہر ہی نہیں نکلے۔'' اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

''گویا میں یہ سمجھنے میں پوری طرح سے حق بجانب ہوں کہ میری نگرانی آپ سے اس سود مند اور دوستانہ ملاقات کے بعد بھی جاری ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجہ اپنایا۔

''آپ تو بہت زیادہ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔ بھئی ابھی ہماری باضابطہ دوستی کا آغاز ہوا ہی کہاں ہے...... پہلی ملاقات میں ہونے والی دوستی پر اعتبار اتنی جلدی کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس فارمولے سے تو

آپ بھی اچھی طرح واقف ہی ہوں گے ظاہر ہے ہماری لائن بھی تو ایک ہی ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''اعتبار کے لیے آپ کو کتنی ملاقاتیں چاہییں۔'' میں نے کہا ویسے میرا خیال آپ سے یکسر مختلف ہے۔ میں پہلی ہی ملاقات میں انسان کے چہرے اور اس کی گفتگو سے اس کو پہچان لیتا ہوں کیونکہ پہچان وہی سچی ہوتی ہے جو پہلی ملاقات میں ہو بار بار کی ملاقات میں تو انسان کو منافقت کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''بہت خوب! اس نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''مجھے آپ کی بات پسند آئی تو پھر میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس نے دوبارہ چہک کر کہا۔

''اگر آپ کے بارے میں میرا خیال نیک نہ ہوتا تو اس وقت آپ مجھ سے فون پر اس طرح بات نہ کر رہی ہوتیں...... اوپر پہنچ کر اپنے رب کو اپنے گناہوں کا حساب دے رہی ہوتیں۔'' میں نے کہا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی رہی پھر بولی۔

''آپ دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔''

''چلیں چھوڑیں ان باتوں کو کام کی بات کریں فون کسی خاص مقصد کے لیے کیا ہے۔'' میں نے ساری بات ختم کر کے اصل بات کی جانب آتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی خاص بھی نہیں بس یہی پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ ہم دوبارہ کب مل رہے ہیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ہوں......!'' میں نے پرسوچ انداز میں ہنکاری بھری اور چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

''ایک دو دن رک جائیں میں خود آپ کو کال کر کے ٹائم اور دن بتاؤں گا۔''

''ڈن!'' اس نے خوش ہو کر کہا پھر بولی۔ ''اچھا ڈاکٹر صاحب آپ کی ایک شکایت تو میں فوری طور پر دور کر دیتی ہوں اور وہ یہ کہ آپ کی نگرانی پر مامور اپنے تمام بندوں کو ہٹا دیتی ہوں۔''

''نہیں! مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... آپ دو چار بندوں کو اور میرے پیچھے لگا دیں......'' میں نے کہا۔

''ارے بابا اب تو ناراضگی ختم کریں...... اور اچھے دوستوں کی طرح اللہ حافظ کریں میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے بھی جواباً ہنستے ہوئے دوستانہ انداز میں اسے اللہ حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

میڈم روزی سے بات کر کے میں وقتی طور پر پریشانی بھلا کر فریش ہو گیا اور بھوک ایک بار پھر ستانے لگی تو باہر کچن میں چلا گیا اور ناصر سے کھانے کے لیے کہا تو وہ بولا کہ وہ دو تین مرتبہ کھانے کا پوچھنے کے لیے میرے روم کا چکر لگا چکا تھا لیکن میں ہر بار اسے سوتا ہوا ملا اس نے مجھے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔

جتنی دیر میں ناصر کھانا لے کر آیا اتنی دیر میں میں نے شاور لے لیا اور فریش ہو گیا۔ کھانا کھا کر فارغ ہوا تو ایک ملازم میرے لیے سفید رنگ کا نیا شلوار سوٹ لے کر آ گیا کہ یہ نواب صاحب نے بھجوایا ہے رات کو مغرب کے بعد ہمیں جانا ہے آپ یہ لباس پہن کر تیار ہو جائیے گا۔

میں نے حیرت سے سفید کاٹن کے اس لباس کو دیکھا اور پھر بیڈ پر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اس نے سفید شلوار سوٹ ہی کیوں بھجوایا ہے میں کوئی سا بھی

ڈریس پہن کر جا سکتا تھا' پھر سوچا کہ آنا اس کی محفل میں شرکت کر کے مجھے میرے بہت سے سوالوں کے جواب خود بخود مل جائیں گے۔

میرے پاس کرنے کے لیے کوئی بھی کام نہیں تھا' اس لیے لیٹ کر ٹی وی دیکھتا رہا اور مختلف چینل گھماتا رہا۔ عرفان رسول کے بارے میں بھی کوئی نیوز نہیں تھی۔ بہر حال ٹائم پاس کرنا تھا' شام کا چائے پی تو مغرب کی اذان ہوگئی میں نے دروازہ لاک کیا اور مغرب کی نماز پڑھی...... میں اب دوبارہ سے نماز کی پابندی کرنے لگا تھا اور دھیان سے دروازہ لاک کر لیا کرتا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بھی مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھے اور میرے بارے میں کسی بھی قسم کا کوئی خیال اپنے دل میں لائے' کس قدر حیرت اور شرمندگی کی بات تھی کہ مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی مجھے فرض نماز چھپ کر ادا کرنا پڑ رہی تھی۔

اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ یہ لوگ اور یہ جگہ برائیوں اور جرائم کا گڑھ تھی اور یہاں اپنے فرائض کی ادائیگی بھی ایک اچنبھے کی بات تھی۔

نماز مغرب سے فارغ ہو کر میں نے نواب کا بھجوایا ہوا لباس پہن لیا۔ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میرے سامنے اس وقت شمروز نہیں ڈاکٹر شاہ زمان کھڑا تھا۔ میرے چہرے کی سختی اور پھٹکار جیسے کہیں کھوگئی تھی۔ اپنے آپ کو دوبارہ سے اپنے پہلے روپ میں دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا۔

''شمروز کیا واقعی تم دوبارہ سے شاہ زمان بن گئے ہو......؟'' تو میرے دل سے آواز آئی۔ ''ہاں۔'' لیکن دماغ نے فوراً میرے منہ پر ایک جوتا مارتے ہوئے کہا۔ ''صاف ستھرا لباس پہن لینے سے آپ گناہوں کے ان سوختہ نشانات کو نہیں چھپا سکتے جو آپ کے کردار کو جلا چکا ہے۔''

پھر میں نے کہا۔ ''بے شک ایسا ہی ہے لیکن میں جلد اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے اپنے دامن کے سارے داغ دھولوں گا اور پھر ایک نیا شاہ زمان پیدا ہوگا' پچھلا شاہ زمان صرف اپنے صاف ستھرے کردار کا مالک تھا لیکن یہ شاہ زمان اس معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو ہاتھ سے مٹانے کی جدوجہد کرتے ہوئے اپنی زندگی تمام کر دے گا......!''

میں آئینے کے سامنے کھڑا سوچوں میں گم دل و دماغ کی گفتگو میں الجھا ہوا تھا تب ہی کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ۔'' میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے کہا تو گارڈ رسول بخش اندر آگیا اور بولا۔

''آپ کو سرکار سائیں نے یاد کیا ہے۔''

''اچھا تم چلو میں آتا ہوں۔'' میں نے واپس آئینے کی جانب مڑتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر کمرے سے باہر آگیا اور نواب کے کمرے کا رخ کیا۔

میں نے نواب کے کمرے کے بند دروازے پر اپنے مخصوص انداز سے دستک دی تو اس نے مجھے فوراً بلا لیا۔ میں نے دیکھا وہ خود بھی سفید کرتہ پاجامہ پہن کر تیار بیٹھا تھا' ہاتھ میں سفید پتھروں والی تسبیح تھی۔ وہ نہایت پُروقار اور گریس فل لگ رہا تھا' اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ آج بھی ایک پُروقار اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔

''تم بہت خوب صورت دکھائی دے رہے ہو۔'' اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے توصیفی کلمات مسکرا کر ادا کیے۔

''شکریہ نواب صاحب!'' میں نے انکساری سے سر کو ہلکا سا خم دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات میں بھی

کہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے لمحوں کے توقف کے بعد کہا تو اس نے ہلکے سے سر ہلا کر اجازت دی۔

”میں نے جس دن آپ کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا میں تب ہی سے آپ کی پروقار شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوں...... جو وقار آپ کی شخصیت میں ہے وہ کم کم لوگوں میں دکھائی دیتا ہے لوگ یوں ہی تو آپ کے دیوانے نہیں ہیں۔“ میں نے مسکا لگایا تو وہ ڈھیرے سے ہنس دیا اور بات کو ٹالتے ہوئے بولا۔ ”تم تیار ہوناں...... بس ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ چلنے سے پہلے میں ایک بار پھر آپ کا چیک اپ کرلیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ارے چھوڑو یار ٹھیک ہی ہوگا...... اس وقت میں کسی اور بات کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔“ نواب نے بے پروا انداز میں کہا تو میں رک گیا۔

تب ہی نواب کا سیل فون بجنے لگا اس نے نمبر دیکھا اور فون آن کر کے کان سے لگالیا اور بولا۔ ”ہاں شبیر بولو کیا بات ہے؟“

وہ چند لمحوں تک دوسری جانب سے کی جانے والی بات سنتا رہا پھر اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے چند لمحے سوچ کر کوئی فیصلہ کیا اور بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے بھیج دو میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔ تمہیں پہلے ہی اسے بتادینا چاہیے تھا۔“ اس نے ناگوار لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں گہری ہوگئیں۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے نواب؟ کون تھا فون پر؟“

”سیکورٹی گارڈ کے انچارج شبیر کا فون تھا میرا ایک اہم بندہ ہے وہ مجھ سے اس وقت ملنے کے لیے آیا ہے کہہ رہا ہے کہ بہت ضروری کام ہے۔“ نواب نے بدستور ناگوار لہجے میں کہا۔

”بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں اور ان میں ہماری بھلائی چھپی ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ وہ شخص بھی آپ کے لیے کوئی اہم خبر لایا ہو مل لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

میں نے کہا تو نواب کی سمجھ میں میری بات آگئی اور وہ ریلیکس ہوگیا۔ میں نے اس شخص سے نواب کے ملنے پر اس لیے بھی زور دیا کہ میں اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا تاکہ میں زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کے چہروں سے آشنا ہوسکوں جو نواب کے لیے کام کرتے ہیں۔

تقریباً دو تین منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور باہر کھڑے ہوئے گارڈ نے بتایا کہ ”شبن آیا ہے۔“

نواب کی جانب سے اجازت ملنے پر ایک شخص اندر داخل ہوا وہ تقریباً پینتیس چالیس سال کی عمر کا ہوگا لمبی چوڑی مضبوط جسامت کا مالک تھا چہرے پر گھنی داڑھی اور مونچھیں تھیں۔ اس کی آنکھوں کا رنگ سبز تھا اس کی لمبی اور تیکھی ناک اس کے مضبوط ارادوں کو ظاہر کررہی تھی۔ آنکھیں چھوٹی تھیں لیکن نہایت تیز...... برچھی کی مانند اندر اترتی ہوئی۔ چہرہ کسی بھی قسم کے احساس سے عاری بالکل سپاٹ تھا پہلی ہی نگاہ میں وہ مجھے کوئی ڈاکو دکھائی دیا۔

وہ اندر آیا اور نواب کے آگے ہاتھ باندھ کر سر کو جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ مگر اس سے پہلے اس نے آتے ہی جھک کر پہلے نواب صاحب کے پیروں کو دونوں ہاتھ لگائے پھر آنکھوں سے لگا کر چومے پھر دونوں ہاتھوں کو جوڑا نواب نے جب سر کو ہلا کر اشارہ کیا تو وہ دونوں ہاتھ نماز کے انداز میں باندھ کر اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

اس کی اس طرح کی حرکت دیکھ کر میرا پارہ ہائی ہوگیا اور میرا شدت سے جی چاہا کہ اپنے ایک زوردار پنچ سے اس کے چہرے کا جغرافیہ بگاڑ دوں۔ بھلا نواب کی ذات اس قابل تھی کہ اس کی اتنی تعظیم کی جاتی لیکن یہ حکم کے غلام لوگ کیا جانیں۔

”کیسے آنا ہوا شبن...... اور ایسی کیا ایمر جنسی تھی کہ تم نے اس کوٹھی تک آنے کی جرات کی......“ نواب نے دبنگ اور ناگوار لہجے میں پوچھا۔

”آپ کا غلام ہوں سائیں...... اگر میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو میں بہت بہت معافی ہاتھ جوڑ کے مانگتا ہوں۔“ شبن نے جھٹ آگے بڑھ کر بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے نواب کے پیروں پر اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے...... اب بتا...... کیا بات ہے؟“ نواب نے شان بے نیازی سے کہا تو وہ سر اٹھا کر الٹے قدموں چلتا ہوا قدرے ہٹ کر دوبارہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہوگیا۔

”حضور...... سرکار...... میں قربان میرا سب کچھ آپ کے صدقے......“ اتنا کہہ کر وہ رک گیا اور میری جانب دیکھنے لگا۔

میری جانب اس کے دیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ میری موجودگی میں نواب سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بات شاید زیادہ ہی خفیہ تھی۔

نواب نے میری جانب دیکھا تو میں اٹھ کر باہر جانے لگا تب ہی نواب کی آواز سنائی دی۔

”شمروز۔“ تو میرے بڑھتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئے اور میں بنا مڑے اس کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے بابا تم بات کرو...... شمروز اپنا ہی آدمی ہے...... اس سے ہمارا پردہ نہیں ہے۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”آؤ شمروز تم بیٹھو...... تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ تو میں خاموشی سے آکر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور بظاہر بے نیاز بن کر اپنے موبائل فون میں مصروف ہوگا۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے بیٹھے بیٹھے شبن کی جانب موبائل کے کیمرے کا رخ کر کے بٹن دبادیا اور اس کی تصویر کھینچ لی، فلش آن ہوئی تو نواب نے چونک کر میری جانب دیکھا تو میں نے ”سوری“ کہا اور جھٹ موبائل جیب میں ڈال لیا۔ شبن نواب سے بات کرنے لگا تو میں نے اپنا سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکالیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ شبن کہہ رہا تھا۔

”سرکار بات خاصی بگڑ گئی ہے...... اس جرنلسٹ کی ساتھی لڑکی اور لڑکے نے کیمرے سے اصل کیسٹ نکال لی ہے اور اس کی جگہ خالی کیسٹ لگادی ہے...... اب معلوم نہیں وہ کیسٹ کہاں اور کس کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ اب اسپتال میں بھی اس کا کام تمام کرنا مشکل ہوگیا ہے اس کے باپ نے اسپیشل فورس اس کی حفاظت کے لیے تعینات کردی ہے اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں؟“

”کیا بکواس کررہا ہے تو......!“ اتنا سنتے ہی نواب غصے میں لال پیلا ہوکر ایک دم بیڈ سے کھڑا ہوگیا۔

”مم...... میں سچ کہہ رہا ہوں سرکار......!“ شبن منمنایا۔

”اس الو کے پٹھے نے کچھ نہیں کیا جس کو اس کام کا اتنا تگڑا معاوضہ دیا گیا تھا کہ وہ...... نواب نے ایک مادر پدر آزاد فحش گالی دیتے ہوئے کہا دس سال میں اتنا پیسہ اپنی اس چینل کی نوکری سے کمائے گا۔“

’بات کی تھی سرکار...... بلکہ ہم نے اسے اٹھا بھی لیا تھا اپنے ڈیرے پر لے گئے تھے کہ سچ سچ بتا تجھے اس چھوکرے پر رحم تو نہیں آگیا اور تو ہمیں ڈبل

کر اس کر رہا ہے' میں نے گن اس کی کنپٹی پر بھی رکھ دی تھی کہ ہم اپنے ساتھ فراڈ کرنے والے کو بخشتے نہیں ہیں لیکن اس نے رو رو کر اور قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ اس نے کوئی دھوکہ نہیں کیا' دراصل اس چھوکرے کی ساتھی وہ جرنلسٹ لڑکی بڑی تیز نکلی...... اور جو کیمرے والا چھوکرا تھا وہ بھی غائب ہے......!"

"وہ لڑکی کون ہے اس کا پتا کیا...... اسے اٹھاؤ اور پتا کرو......" نواب نے کہا۔

"مشکل ہے سرکار۔ اس کے ساتھ مستقل ایک دو کمانڈو ہوتے ہیں...... چھوکرے کے باپ کی پہنچ بہت اوپر تک لگتی ہے۔" شبن نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تم سب نامرد ہوتے جارہے ہو......" نواب نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "تم ایک لڑکی کو قابو نہیں کرسکتے۔"

"ایسی بات نہیں ہے سرکار...... یہ میڈیا کے لوگ ہیں۔ میڈیا پہلے ہی بہت شور مچارہا ہے' اس چھوکرے کو لے کر ویسے بھی ساری صحافی برادری ایک ہوگئی ہے۔ اب اگر اس لڑکی پر ہاتھ ڈالا تو بہت ہنگامہ مچے گا' اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمارا کوئی ثبوت اس کے ہاتھ لگ گیا ہو اور وہ ثبوت نہ جانے کس کے پاس ہے؟ اگر اس لڑکی کو کچھ ہوا تو سب کچھ سامنے آجائے گا۔" شبن نے کہا تو نواب سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔

"اچھا وہ لڑکا جو رپورٹ بنارہا تھا اس کا کیا ہوا وہ تم لوگوں کے ہاتھ لگی یا نہیں۔ وہ تو بہت اہم چیز ہے وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگنی چاہیے۔"

"رپورٹ تو ہاتھ نہیں لگی' البتہ اس چھوکرے کا لیپ ٹاپ ضائع کردیا گیا ہے۔"

"کیا تمہیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ وہ رپورٹ ضائع ہوچکی ہے...... مجھے آخر زیڈا ے مراد کو بھی تو مطمئن کرنا ہے۔" نواب نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں سرکار سو فیصدی پکا یقین ہے۔" شبن ایک بار پھر منمنایا۔

"چلو ایک خبر تو تم نے اچھی سنائی' لیکن اس بات کو اچھی طرح یاد رکھ لے' اگر اس کے برخلاف کوئی بات سامنے آئی تو تجھے میں اپنے ہاتھوں سے کتوں کے آگے ڈالوں گا' تاکہ وہ تیرے اس ہڈحرام جسم کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھالیں۔" نواب کے لہجے میں بھوکے شیر کی سی غراہٹ تھی۔

"حضور...... سرکار...... آپ مائی باپ ہیں...... غلام ہیں سرکار آپ کے......" یہ کہتے ہوئے شبن ایک بار پھر نواب کے قدموں سے لپٹ گیا اور نواب نے اپنی ٹانگ کو ایک زور کا جھٹکا دیا نواب کے جوتے کی نوک شبن کی نوکیلی ناک پر لگی اور وہ پیچھے گر پڑا۔

"اچھا تو جا...... آئندہ یہاں آنے کی غلطی نہ کرنا...... جو بات بھی کرنی ہو...... رستم زمان سے کرنا۔" نواب نے سخت لہجے میں کہا۔

"جو حکم سرکار......" شبن اپنی ناک سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا...... اور بولا۔ "بات بڑے راز کی تھی سرکار اس لیے میں......"

"بس......!" نواب نے ہاتھ اٹھا کر سخت لہجے میں اسے مزید بولنے سے روک دیا تو پہلے ہی ہمارا موڈ بہت خراب کرچکا ہے' اب زیادہ بک بک کرکے ہمارا دماغ مزید خراب مت کر۔"

"حضور!" شبن نے دونوں ہاتھ جوڑے اور نواب کی تعظیم کے لیے رکوع کی حالت میں آگیا پھر الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں نواب اور شبن کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو بڑے انہماک اور توجہ سے سن بھی رہا تھا اور ادھ کھلی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ بھی رہا تھا۔

صحافی لڑکے اور اس کی ساتھی صحافی لڑکی کا ذکر سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے تھے اور میرا ذہن بہت تیزی کے ساتھ سوچ کی منزلیں طے کررہا تھا' لیکن اس کے کمرے سے چلے جانے کے بعد بھی میں اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا' گویا میں نے یہاں ہونے والی گفتگو کو نہ تو سنا اور نہ ہی اس میں کوئی دلچسپی لی' کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاید نواب سوچوں میں گم تھا' تقریباً سات آٹھ منٹ کی خاموشی کے بعد میرے کانوں میں نواب کی آواز آئی' اس نے دھیمے لہجے میں میرا نام لے کر پکارا تھا' لیکن میں ہنوز خاموش آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا' تب اس نے قدرے تیز آواز میں مجھے پکارا تو میں چونک کر آنکھیں کھول کر اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

"سو گئے تھے کیا......!" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں تو......!" میں نے جان بوجھ کر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"تم نے سنا...... یہاں جو بھی بات چیت ہوئی۔" اس نے پوچھا۔

"ہوئی ہوگی' میں نے تو یہاں کسی کو آتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا...... میں تو آپ کے ساتھ محفل میں شریک ہونے کے لیے جانے کے لیے آیا ہوں۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"بہت خوب...... بہت خوب......!" نواب نے مسکراتے ہوئے میرے جواب کو سراہا' پھر میز پر رکھے پانی سے بھرے جگ اور گلاس کی جانب اشارہ کیا تو میں نے لپک کر گلاس میں پانی بھر کر ادب سے اس کے آگے پیش کردیا' اس نے گلاس خالی کرکے میری جانب بڑھایا تو میں نے گلاس میز پر واپس رکھ دیا۔

"ابھی تو ہمیں جانا ہے' تمہیں پھر کسی وقت یہ ساری کہانی سناؤں گا' ہوسکتا ہے کہ تم کوئی بہتر مشورہ دے سکو۔" نواب نے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" میں نے تابعداری سے جواب دیا۔

نواب نے اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "ہمیں اب چلنا چاہیے۔ تم ذرا جاکر سیکورٹی کو اطلاع کردو کہ ہم آرہے ہیں اور ہاں تم اپنی گاڑی میں ہمارے ساتھ ہی چلو گے۔"

"بہتر نواب صاحب!" میں نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس وقت میرا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ میں سرمئی سے ملاقات کروں...... اور یہاں ہونے والی ساری گفتگو اسے بتاؤں...... نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ساری گفتگو حسام اور سرمئی کے متعلق ہی ہورہی تھی۔ لیکن ہزار چاہنے کے باوجود میں اپنی اس خواہش پر عمل نہیں کرسکتا تھا' اس لیے سوچا کہ رات کو واپس آکر سرمئی کے موبائل پر ایک مرتبہ پھر بات کرنے کی ٹرائی کروں گا۔

یہ سوچتے ہوئے میں کوٹھی کے کارپورچ والے حصے میں آگیا اور میں نے وہاں موجود سیکورٹی گارڈز کے انچارج کو بتایا کہ نواب صاحب چلنے کے لیے تیار ہیں۔

پانچ منٹ بعد ہی نواب آگیا۔ نواب اپنی گاڑی میں تنہا اپنے سیکورٹی گارڈز کے ہمراہ بیٹھا تھا' اس کے پیچھے ایک پولیس موبائل تھی اور آخر میں میں اپنی گاڑی میں ان کے پیچھے جارہا تھا' گارڈز نے میرے پیچھے آنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شاید نواب نے انہیں میرے بارے میں مطلع کردیا تھا۔

تقریباً سوا گھنٹے کے طویل سفر کے بعد سرجانی ٹاؤن کے علاقے میں ہم پہنچ گئے۔ یہ علاقہ اس وقت

خاصا غیر آباد اور ویران تھا۔ دور دور اکا دکا عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہماری گاڑیاں بھی ایک شاندار اور کافی بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی ایک عمارت کے احاطے میں داخل ہوگئیں۔

نواب کی گاڑی کافی آگے کی جانب جاکر رکی جبکہ گارڈز نے میری کار کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

میں کار سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے' اتنے میں نواب کی گاڑی سے ایک گارڈ اتر کر میری جانب آیا اور بولا۔

''تم اس وقت سامنے والے دروازے سے اندر ہال میں داخل ہوجاؤ۔ تمام لوگ وہیں بیٹھے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ نواب وہاں موجود ایک دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوگیا تو میں بھی سامنے والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے بند دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ باآسانی کھل گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک وسیع ہال تھا جو تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہاں کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے' کرسیاں دو رویہ قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب خواتین بیٹھی تھیں اور بائیں جانب مرد حضرات بیٹھے تھے' درمیان میں آنے جانے کے لیے راستہ تھا' سامنے ایک بڑا سا اسٹیج تھا۔ جس پر ایک بہت بیش قیمت اور قیمتی نقش و نگار سے آراستہ کرسی بچھی تھی۔ سامنے میز اور ساتھ ہی میز پر قرآن پاک رکھا تھا۔

میں یہ سب کچھ دیکھتا ہوا حیرانی سے سب سے آخری کرسی پر بیٹھ گیا تو وہاں موجود انتظامیہ کا ایک شخص لپک کر میری جانب آیا اور نہایت ادب اور نرم لہجے میں بولا۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو آگے کی خالی کرسی پر تشریف رکھیے اور ہاں جناب اپنا نام اور رہائش کا پتا بتادیجیے' اور فون نمبر بھی......''

میں نے اس کے ہاتھ میں دبا رجسٹر دیکھ لیا تھا' اس کے بارے میں نواب مجھے پہلے ہی بتاچکا تھا۔

میں نے کھڑے ہوکر اپنا نام اور نواب کی کوٹھی کا ایڈریس بتایا تو وہ چونک کر لکھتے لکھتے سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرے ساتھ تشریف لائیے۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا وہ مجھے اپنے ساتھ سب سے آگے والی رو میں لے گیا اور وہاں موجود چند خالی کرسیوں میں سے ایک پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

کوٹھی کا نمبر سنتے ہی وہ سمجھ گیا کہ میں نواب کا ہی آدمی ہوں اور اپنی کوئی حاجت لے کر نہیں آیا' اس لیے میرے نام کا اندراج ضروری نہیں ہے۔''

میں وہاں بیٹھ کر انتہائی حیرت زدہ ہو رہا تھا کہ اس ہال میں قریباً پچاس کے قریب افراد موجود تھے' لیکن انتہائی درجے کا نظم و ضبط اور خاموشی تھی۔ کسی فرد میں بھی کسی بھی طرح کی کوئی بے چینی نہیں تھی۔ سب بہت صبر اور سکون سے بیٹھے تھے۔

پھر میری نگاہ سامنے میز اور کرسی پر پڑی' میں سمجھ گیا کہ یہ کرسی نواب کے لیے بچھائی گئی ہے اور وہ یہاں آکر بیٹھے گا' لیکن میز پر قرآن مجید کی موجودگی پر مجھے بہت حیرت تھی' کہ نواب قرآن مجید کا کیا کرے گا......؟ میں نے سوچا کہ چلو آج دیکھتے ہیں کہ وہ بے ایمان شخص کس طرح لوگوں کو اللہ کی اس کتاب کا نام لے کر استعمال کرے گا۔

مجھے وہاں بیٹھے بیٹھے مزید آدھا گھنٹا گزر گیا۔ تب ہی ہال میں موجود سارے اسپیکر آن ہوگئے اور اس میں سے آواز آئی۔

''السلام و علیکم ورحمتہ اللہ! آپ تمام حضرات و خواتین کے لیے اطلاعاً عرض ہے کہ محترم عزت مآب نواب سطوت السلام صاحب تشریف لاچکے ہیں۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ آپ کے سامنے ہوں گے...... شکریہ!''

اور پھر اسٹیج کے بائیں جانب کا پردہ ہٹا اور وہاں سے نواب اندر آیا' وہ بڑی تمکنت سے پروقار انداز میں چلتا ہوا آیا اور کہا۔

''السلام و علیکم ورحمتہ اللہ!''

تمام حاضرین نے نہایت عقیدت و احترام سے جواب دیا' اس کے فوراً ہی بعد ہال میں ...... پن ڈراپ خاموشی چھاگئی۔

لمحہ بھر کو تو میں بھی نواب کی پروقار اور پرشکوہ شخصیت اور انداز کے سحر میں گرفتار ہوگیا' مگر جلد ہی میں اس سحر سے باہر نکل آیا' تب ہی نواب نے ایک حیرت انگیز حرکت کی اس نے بسم اللہ کہہ کر میز پر رکھا ہوا قرآن اٹھایا اور چند آیات کی خوب صورت آواز کے ساتھ تلاوت کی پھر اس نے قرآن بند کرکے دوبارہ میز پر رکھ دیا اور بولنے لگا۔

اس کی گفتگو کا متن یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت کی جائے۔ جس طرح بھی ہو ان کے مسائل حل کیے جائیں اور یہ بھی کہ اللہ نے ہر انسان کی ایک تقدیر مقرر کی ہے' انسان کے ساتھ وہی کچھ پیش آتا ہے جو اس کی تقدیر میں ہوتا ہے۔ مسائل سے کبھی گھبرانا نہیں چاہیے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسائل کا حل بھی بتایا ہے' بعض اوقات وہ دوسرے انسانوں کو ان کے مسائل حل کرنے کا وسیلہ بنادیتا ہے۔ بعض اوقات انسان کے مسائل حل بھی نہیں ہوتے' کیونکہ ان کی تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہوتا ہے' اس کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ وہ صبر کریں' صبر بے شک بہت مشکل اور پتھر کی بڑی بھاری سل ہے جسے اس شخص کو اپنے سینے پر اٹھانا پڑتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ جنت لکھا ہے۔ تو میرے بہن اور بھائیوں' اگر آپ کا کوئی مسئلہ یہ ناچیز کسی بھی طرح حل کرنے سے قاصر رہے تو آپ صبر کریں۔ صبر اللہ کا پسندیدہ عمل ہے' اور اس کی جزا آخرت میں جنت کی صورت ملے گی۔ دنیا کی زندگی تو ایک دھوکہ ہے' چند روزہ ہے' ہماری اصل زندگی تو دوسری دنیا میں شروع ہوگی جو کبھی ختم نہیں ہوگی' ہمیشہ باقی رہنے والی......''

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی تقریر سن رہا تھا' اس کا مدلل انداز اس کا لب و لہجہ میں بیان نہیں کرسکتا...... مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اس کمینے شخص کی ناٹک پر...... یہ قرآن ہاتھ میں اٹھا کر کس طرح لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے' آج مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ لوگ کیوں اس کے ہاتھوں الو بن رہے ہیں۔ اگر میں نواب کی اصلیت نہ جانتا تو آج میں بھی اس کے معتقدین میں پوری طرح شامل ہوگیا ہوتا۔

آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو ہاتھوں میں قرآن اٹھا کر دوسروں کو تو نصیحت کرتے ہیں لیکن خود ان کا عمل صفر ہوتا ہے۔

درس ختم کرکے اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے' سارے حاضرین نے بھی اٹھالیے' پھر اس نے نہایت رقت آمیز دعا کی...... اور یوں اس محفل کا ایک سیشن ختم ہوا......

نواب نے دعا کے بعد پانی پیا...... تو مائک سے ایک بار پھر اعلان ہوا کہ جس شخص کا نام پکارا جائے وہ نواب صاحب کے پاس جاکر اپنا مسئلہ بیان کرے...... اور پانی پر دم کروالے۔

پھر ایک عورت اور ایک مرد کا نام لے لے کر پکارا

جانے لگا...... لوگ اس کے پاس اسٹیج پر چڑھ کر جاتے اور دوزانو ہو کر اور سر جھکا کر اس کے قدموں میں بیٹھ جاتے...... وہ لوگوں کی ساتھ لائی ہوئی پانی کی بوتلوں میں بھی پھونکیں مار رہا تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض لوگ اس ہال میں بائیں جانب بیٹھے ایک شخص کے پاس جا رہے تھے وہ ایک علیحدہ کرسی پر بیٹھا تھا' سامنے میز تھی اور میز پر رجسٹر رکھا تھا' وہ ان سے کوئی بات کرتے اور خاموشی سے ہال سے نکل جاتے' بعض لوگ اس شخص کے پاس جائے بنا ہی سیدھے ہال سے باہر جا رہے تھے۔

نواب نے صرف پندرہ بیس لوگوں سے ملاقات کی' پھر اٹھ کر اس دروازے سے باہر چلا گیا جہاں سے اندر آیا تھا۔

نواب کے جانے کے بعد ہال کے اسپیکر سے ایک بار پھر اعلان ہوا اور اس میں کہا گیا کہ بڑے پیر صاحب نواب عصمت السلام کا لنگر لیتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔

سارے لوگ قطار باندھ کر جا رہے تھے' کوئی افراتفری نہیں تھی۔ ایک شخص نے خاموشی سے اس شخص سے جس نے مجھے یہاں بٹھایا تھا آ کر کہا کہ میں مسلسل تین ہفتوں سے یہاں آ رہا ہوں' میری ابھی تک سرکار سے ملاقات کی باری نہیں آئی تو اس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی کہ آپ تسلی رکھیں اور آتے رہیں' جب اللہ کا حکم ہوگا تو آپ کی بھی ملاقات ہو جائے گی' بس یہ سمجھ لیں کہ ابھی اللہ کا حکم ہی نہیں ہوا ہے۔ وہ شخص سر ہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

میں بھی ہال سے باہر نکل آیا' تو میں نے دیکھا کہ ایک بڑے سے ٹوکرے میں بہت سارے شاپرز رکھے ہیں اور ایک شخص ہر جانے والے شخص کو اس ٹوکرے سے ایک شاپر نکال کر اسے دے دیتا اور وہ شاپر لے کر سیدھا گیٹ سے باہر چلا جاتا۔

میں اپنی گاڑی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور یہ سارا منظر خاموشی سے دیکھتا رہا۔ میں دل ہی دل میں نواب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کتنا شاطر' مکار اور دھوکے باز ہے۔ اس کے کلف زدہ سفید بے داغ لباس کے اندر کتنی گھناؤنی بدبودار اور داغ دار شخصیت پوشیدہ ہے۔ میرے دل سے دعا نکلی۔

"کاش ان عقل کے اندھوں کی آنکھیں اللہ کھول دے...... یا پھر کوئی تو ایسا ہو جو اس کا یہ سفید لبادہ اس کے جسم سے نوچ کر اس کا گھناؤنا روپ دنیا کے سامنے لے آئے' لیکن یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔ اس کے بے تحاشا کارندے تھے' میں تو یہاں موجود کارندوں کو بھی شمار نہیں کر پا رہا تھا تو دوسری جگہوں پر تو اور نہ جانے کتنے اور کہاں کہاں پھیلے ہیں۔

ایک ایک کر کے تمام افراد وہاں سے چلے گئے' صرف میں رہ گیا یا پھر یہاں کے کارکنان رہ گئے تھے۔ جو سب کے سب خاموشی کے ساتھ اپنے کام انجام دیے جا رہے تھے' نہ تو مجھ سے کسی نے سوال کیا اور نہ ہی میں نے۔

میں کھڑے کھڑے تھک گیا تھا' سوچا گاڑی میں بیٹھ کر نواب کے واپس جانے کا انتظار کر لیتا ہوں' میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھنے لگا تب وہاں موجود سارے لوگوں نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اب واپس جانے کا ارادہ کر رہا ہوں لیکن جب میں نے گاڑی کو اسٹارٹ نہیں کیا تو وہ پھر سے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

پتا نہیں نواب کا کیا ارادہ ہے' وہ کب تک یہاں سے روانہ ہوگا' میں نے اکتا کر گھڑی میں ٹائم دیکھا' صبح کے تین بج رہے تھے' میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا' بھوک محسوس ہو رہی تھی' مجھے کسی نے نہ تو کچھ کھانے کے لیے دیا اور نہ ہی پوچھا' نواب بھی نہ جانے کہاں ہے' میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی جانب ایک ملازم آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے قریب آ کر ٹھہر گیا اور مودب لہجے میں کہا۔

"آپ اندر تشریف لے چلیے اور عشائیہ تناول فرما لیجیے۔ سرکار حضور نے یہ پیغام کہلوایا ہے کہ آپ کھانے سے فارغ ہو کر واپس کوٹھی تشریف لے جائیے گا' سرکار حضور کل کسی وقت تشریف لے جائیں گے۔"

میں گاڑی سے اتر آیا اور اسی کے پیچھے چل دیا' بڑے ہال کا دروازہ بند تھا' وہ مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ یہ ایک آراستہ بیڈروم دکھائی دے رہا تھا۔ خاصا بڑا کمرہ تھا' یہاں بیڈ کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ اور میز بھی موجود تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹیں پنکھے اور اے سی آن کر کے صوفے کی جانب اشارہ کیا کہ میں یہاں بیٹھ جاؤں' مجھے وہاں بٹھا کر وہ باہر چلا گیا اور میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا' خاصا پرتعیش کمرہ تھا۔ یہ کسی کا بیڈروم ہو سکتا ہے میں نے سوچا پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ نواب رات میں اسی کمرے میں قیام کرتا ہو' پھر سوچا کہ نہیں نواب کے بیڈروم میں مجھے یوں نہیں لایا جاتا۔

ملازم یقیناً کھانا لانے گیا ہوگا' کھانے سے پہلے ذرا ہاتھ منہ دھو لوں' یہ سوچ کر میری نگاہیں کمرے میں موجود ایک اور دروازے کی جانب اٹھ گئیں اور میں سمجھ گیا کہ یہی باتھ روم ہوگا' اپنے خیال کی تصدیق کے لیے میں اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو میرا خیال صحیح نکلا' وہ باتھ روم ہی تھا' کمرے کی طرح باتھ روم بھی خاصا بڑا اور صاف ستھرا تھا' میں بلا تکلف اندر داخل ہو گیا اور اچھی طرح سے ہاتھ منہ دھویا' تب ہی اس ملازم نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آ رہا ہوں۔" میں نے اندر سے جواب دیا اور اسٹینڈ سے صاف ستھرا تولیہ اتار کر اپنا چہرہ خشک کرنے لگا' باہر آیا تو وہ میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میز پر کھانا چنا ہوا تھا۔

"آیئے کھانا تناول فرما لیجیے۔" اس نے مودب لہجے میں کہا تو میں دوبارہ صوفے پر آن بیٹھا اور بسم اللہ پڑھ کر شروع ہو گیا۔

میں کھانا کھا رہا تھا اور وہ خاموش کھڑا تھا' مجھے اس کے اس طرح سر پر سوار ہونے کی وجہ سے عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ اس لیے بوریت دور کرنے کے لیے اس سے بات چیت شروع کر دی۔

"تم کھڑے کیوں ہو' آؤ میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔" میں نے کہا۔

"جزاک اللہ!" اس نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آپ تناول فرمایئے ہم بعد نماز مغرب کھا چکے ہیں۔"

میں حیرت سے اس بیس بائیس سال کے لڑکے کو دیکھ رہا تھا کہ رات کے اس وقت بھی وہ کتنا فریش ہے۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"بدرالزماں!" اس نے جواب دیا۔

"یہاں کب سے ہو؟ کیا دن رات یہیں رہتے ہو' یا تمہارا علیحدہ سے کوئی اور گھر بھی ہے وہاں چلے جاتے ہو؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوالات کر ڈالے۔

"میں چودہ پندرہ سال کا تھا جب سے سرکار حضور کی سرپرستی میں ہوں۔ بے سہارا اور یتیم تھا' اپنے چچا کے گھر رہتا تھا اور چچی کی مار اور گالیاں کھاتا تھا' ایک بار چچا کے ساتھ یہاں آیا تھا تو سرکار حضور کو مجھ غریب پر رحم آ گیا اور انہوں نے مجھے یہاں ملازم رکھ لیا۔ جب سے یہیں ہوں۔ اب تو سرکار حضور ہی میرا سب

کچھ ہیں۔ بہت اونچی ہستی ہیں، بڑی دور دور سے لوگ یہاں پریشان حال آتے ہیں اور من کی مرادیں حاصل کر کے خوشی خوشی لوٹ جاتے ہیں۔" اس کے انداز اور لہجے میں نواب کے لیے بے پناہ عقیدت تھی۔

"سرکار حضور یہاں قیام کے دوران کیا کرتے ہیں؟" میں نے بظاہر بے پروا لہجے میں پوچھا۔

"عبادت کرتے ہوں گے شاید، ہمیں اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے، بعض اوقات دوسرے شہروں اور ملکوں سے بہت سے مہمان تشریف لاتے ہیں تو سرکار حضور ان سے ملاقاتیں بھی کرتے ہیں۔"

"اچھا تو سرکار حضور "محفل" کے علاوہ بھی یہاں تشریف لاتے ہیں۔" میں نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! جب کوئی باہر سے آتا ہے تو سرکار حضور ان سے ملنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ لوگوں کے بڑے بڑے مسائل حل کرتے ہیں سرکار حضور!" اس نے پرمسرت اور دبے دبے پرجوش لہجے میں کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ کمرہ کس کا ہے؟" میں نے گلاس خالی کر کے واپس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مہمان خانہ ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آج بھی مہمان آئے ہوئے ہیں، میرا مطلب ہے...... باہر والے!" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں! دوبئی سے رئیس خان صاحب آئے ہوئے ہیں۔" اس نے کہا پھر مجھے کھانے سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"آپ کو اور کچھ چاہیے، میرا مطلب ہے چائے وغیرہ......!"

"ہاں چائے مل جائے تو......"

"ابھی لیجیے۔" اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا اور میں نواب کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس کا نیٹ ورک کتنا وسیع اور مضبوط ہے، یہاں سرجانی میں اس بلڈنگ میں اس کا نیٹ ورک بالکل جدا ہے، ادھر کوٹھی میں بالکل مختلف ہے اور اس کے گاؤں میں اور کوئی اور شے ہی ہوتا ہوگا۔ جو لوگ اس کو سرکار حضور کی حیثیت سے پہچانتے ہیں وہ اس کی دوسری شخصیت کے بارے میں مر کر بھی نہیں سوچ سکتے کہ وہ ایک بہت بڑا مجرم بھی ہوسکتا ہے، اس کے ہاتھ نہ جانے کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک لمحہ کو تو مجھے ایسا لگا جیسے سارے پاکستان کے مجرموں کی سرپرستی یہی ایک شخص کر رہا ہے۔ میں سوچوں میں گم تھا تو بدرالزماں گرما گرم چائے لے آیا۔

میں نے اس سے اتنے سارے سوالات کیے لیکن اس نے مجھ سے ایک بھی سوال نہیں پوچھا، شاید اس لیے کہ انہیں سوال کرنے کا حق ہی نہیں دیا گیا اور یہ اس کے عادی ہو چکے ہیں، اس نے مجھ سے یہ تک نہیں پوچھا کہ میں یہ سوال کیوں کر رہا ہوں یا پھر میں کون ہوں، کیوں کہ میں نواب کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اس کی ہدایات پر مجھے یہ وی آئی پی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔

میں چائے پی کر فارغ ہوا تو صبح کے چار بج رہے تھے، اب کوٹھی پہنچنے میں بھی ایک گھنٹہ لگ جائے گا، میں جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا۔

"اب میں چلتا ہوں، سرکار حضور کو بتا دینا کہ میں چلا گیا ہوں، یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ میں ان سے مل لوں۔" میں نے جواب طلب نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"معاف کیجیے گا آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی...... اس وقت سرکار حضور کسی سے نہیں ملتے۔" اس نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔" میں نے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ میں نے چلتے چلتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

"بدرالزماں تم ایک اچھے لڑکے ہو اور مجھے بہت اچھے بھی لگے ہو، امید ہے تم سے آئندہ بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"آپ جب جب یہاں تشریف لائیں گے انشاء اللہ ملاقات ضرور ہوگی۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا تم کبھی کہیں باہر نہیں جاتے۔ میرا مطلب ہے کہ تم سے باہر کہیں ملاقات......!"

"جی نہیں!" اس نے میری بات پوری ہونے سے پیشتر ہی تیزی سے جواب دیا۔

"کیوں نہیں؟" میں اس کے اس طرح سے جواب دینے پر چونک پڑا اور بے ساختہ پوچھا۔

"باہر کی دنیا سے ہمارا کیا لینا دینا۔ ہم تو بس یہیں رہ کر اللہ کے بندوں کی خدمت کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔" اس نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے جواب دیا، اس کے چہرے پر مستقل کھیلنے والی مسکراہٹ موقوف ہو چکی تھی اور میں لمحہ بھر میں سب کچھ سمجھ گیا اور میں نے اسے نفسیاتی طریقے سے گھیرنے کی کوشش کی اور کہا۔

"کیوں کیا تمہیں باہر جانے کی آزادی نہیں ہے؟"

"جی ہاں!" اس نے بدستور اسی انداز اور لہجے میں جواب دیا۔

"یہ تو بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے، جب کہ تمہارا بھی دل چاہتا ہوگا کہ باہر نکلو، باہر کی دنیا دیکھو...... گھومو پھرو...... زندگی کا لطف اٹھاؤ، اگر دیکھا جائے تو تم تو یہاں ایک طرح کی قیدی کی زندگی گزار رہے ہو، جس طرح جیل کا کوئی قیدی جیل کی چار دیواری کے اندر تو چل پھر سکتا ہے لیکن اس چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتا۔" میں نے کہا تو اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے تاثرات نمایاں ہو گئے اور اس نے خوف زدہ نگاہوں سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے لبوں کی جانب بڑھایا، لیکن رکھا نہیں، پھر سر ہلاتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

"یہاں اس قسم کی باتیں کرنا تو در کنار سوچنا بھی منع ہے۔ کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہیں۔ اللہ کے واسطے اب آپ یہاں سے جائیے۔"

"اچھا...... اچھا...... میں نے ہاتھ اٹھا کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔" تم پریشان مت ہو، میں جا رہا ہوں، لیکن دوبارہ ضرور آؤں گا اور تم سے ملاقات کروں گا...... تمہارے پاس ایک ماہ ہے اچھی طرح سے سوچ لینا، ہوسکتا ہے کہ میں تمہارا نجات دہندہ بن جاؤں اور تمہیں اس قید سے نجات......"

اس نے زچ ہو کر اس بار میرے منہ پر ہاتھ رکھ ہی دیا اور بولا۔ "اللہ حافظ......"

وہ جھک کر برتن سمیٹنے لگا، گویا اب وہ مجھ سے مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا، میں کمرے سے باہر نکل آیا، سب جانب سناٹا پھیلا ہوا تھا، شاید تمام لوگ سونے کے لیے چلے گئے تھے، میں بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر کار پورچ کی جانب چلا آیا، یہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا سوائے گیٹ کی ڈیوٹی پر موجود دو عدد گارڈز کے۔

میں گاڑی اسٹارٹ کر کے گیٹ پر لے آیا تو گارڈز نے بلا چون و چرا گیٹ کھول دیا۔ شاید انہیں یہ بات معلوم تھی کہ میں ابھی واپس جاؤں گا۔ نواب کے

ساتھ آئے ہوئے گارڈز کی گاڑی خالی تھی' ہوسکتا ہے وہ لوگ اس جگہ پر موجود ہوں جہاں نواب موجود تھا۔ البتہ گیٹ کے باہر پولیس کی موبائل موجود تھی' یہ دوسری موبائل تھی' اندر موجود سپاہی بھی دوسرے تھے' ان کی ڈیوٹی بدل گئی ہوگی۔ ایک ہی شخص دن رات کی ڈیوٹی نہیں کرسکتا' پولیس والوں نے بھی مجھے روکنے یا بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا جانے لگا۔

یہاں سارا راستہ بہت سنسان تھا۔ نہ تو کوئی آدمی اور نہ ہی کوئی گاڑی روڈ پر دکھائی دی' کافی آگے جانے کے بعد نارتھ کراچی کا علاقہ شروع ہوگیا۔ یہ آبادی بھی نئی نئی بننی شروع ہوئی تھی اور یہاں پر زیادہ تر فلیٹس بنے ہوئے تھے۔

مجھے واپسی کے سفر میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں تیز رفتاری سے سفر کرتا ہوا واپس کلفٹن پہنچ گیا۔ راستے میں مجھے ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ میں سرمئی کے گھر چلا جاتا ہوں' ذرا وہاں کے حال احوال تو لوں' لیکن پھر ٹائم کا خیال کرکے اپنا ارادہ ترک کردیا کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے کسی کے گھر جانے کا...... مجھے امید تھی کہ سرمئی خود مجھ سے رابطہ کرے گی اور مجھے ساری صورت حال سے آگاہ کرے گی۔

میں کوٹھی پہنچا تو فجر کی اذانیں ختم ہوچکی تھیں۔ مسجدوں کے دروازے کھل چکے تھے اور نمازی مسجدوں کی جانب جارہے تھے' مجھے یونہی خیال آیا کہ کیوں نہ آج میں بھی فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کروں...... بہت عرصہ ہوا جماعت سے نماز نہیں ادا کی۔ میں نے گاڑی کا رخ مسجد کی جانب موڑ لیا اور مسجد میں آگیا۔ یہاں آکر دل میں عجیب سا خیال آیا اور میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اور میں نے سوچا۔ ''کیا میرا ناپاک اور غلیظ جسم اس قابل ہے کہ مسجد جیسی پاک جگہ پر جسے لوگ اللہ کا گھر بھی کہتے ہیں' میں قدم رکھ سکوں...... میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں' تب ہی میرے کانوں میں ایک نرم اور شفیق آواز آئی۔

''چلے آؤ بیٹا' کچھ مت سوچو' یہ اللہ کا گھر ہے' یہاں ہر دل کو سکون اور ہر جسم کو امان ملتی ہے...... یہاں تو آتے ہی اپنے گناہوں کو دھونے کے لیے......!''

میں نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا تو ایک باریش بزرگ صورت صاحب کو اپنے سامنے موجود پایا' ان کی سرخ وسفید رنگت تھی...... سفید بڑی سی داڑھی تھی اور ان کی پلکیں اور بھویں تک سفید تھیں۔ انہوں نے سفید رنگ کا کرتا اور سفید تہہ بند باندھا ہوا تھا' سر پر سفید ٹوپی تھی اور ان کے لمبے اور سفید بال ان کے شانوں پر پھیلے ہوئے تھے' ہاتھ میں چمکتی ہوئی تسبیح تھی۔ ان کے چہرے پر ایک عجیب سا نور پھیلا ہوا تھا۔

میں نے ان کی جانب دیکھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بولے۔

''آؤ بلا دھڑک چلے آؤ...... تم نے سنا نہیں اللہ کی پکار...... وہی تو ہے جو کہہ رہا ہے' آؤ فلاح اور کامیابی کی جانب۔''

''لیکن میں......!'' میں ہکلا کر بولا۔

''میں نے کہا ناں کچھ مت سوچو...... بس چلے آؤ...... اپنا سر اپنے معبود کے آگے رکھ دو...... توبہ کرلو...... وہ بڑا معاف کرنے والا...... درگزر کرنے والا' توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے' بلکہ وہ تو ارحم الرحمین ہے۔ ندامت سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنی رحمت کی چادر سے پونچھ کر اپنے دامن رحمت میں پناہ دے دیتا ہے......'' وہ مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے

اور میں جیسے کسی ان دیکھی ڈور کے ساتھ بندھا ان کے ساتھ کھنچا چلا جارہا تھا۔

اندر نمازیوں نے صف بندی کرلی تھی' وہ بھی مجھے اپنے ساتھ لے کر کھڑے ہوگئے' اقامت کی گئی تو میں پوری طرح نماز کی جانب متوجہ ہوگیا۔ پورے خضوع وخشوع کے ساتھ نماز ادا کی اور خوب رو رو کر اور گڑگڑا کے اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی...... حشام کی صحت اور زندگی کے لیے بھی دعا کی اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ میرے نیک مقاصد میں میری مدد کرے' اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ میں نے وضو تو نہیں کیا تھا...... میں بنا وضو کے ہی نماز پڑھنے لگا۔ اس خیال کے آتے ہی میری محویت ٹوٹ گئی اور میں نے اپنے اردگرد دیکھا...... ساری مسجد خالی تھی...... کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ بزرگ بھی نہیں اور تب ہی میرے کانوں میں اذان فجر کی آواز آئی۔

میں شدید حیران ہوا کہ ابھی تو فجر کی نماز ختم ہوئی ہے پھر یہ کون سی اذان ہورہی ہے...... میں چونک کر اٹھا تو دیکھا کہ موذن اذان دے رہے تھے' میں اذان ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا وہ اذان دے کر فارغ ہوئے تو باہر آئے' میں نے پوچھا۔ ''نماز تو ختم ہوچکی ہے اب آپ کون سی اذان دے رہے ہیں؟''

''نہیں بیٹا ابھی نماز کہاں ہوئی ہے' ابھی تو اذان ہوئی ہے' نمازی آنا شروع ہوں گے تب نماز ہوگی۔ شاید آپ نیند میں ہیں ابھی تک......'' انہوں نے کہا اور مجھے حیران وپریشان چھوڑ کر سنتیں پڑھنے لگے۔

میرے ساتھ جو کچھ ہوا' وہ مجھ سے بالاتر تھا۔ وہ بزرگ اور وہ تمام حضرات کون تھے جنہوں نے میرے ساتھ نماز پڑھی تھی اور ان بزرگ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں مسجد کے اندر آتے ہوئے کیا سوچ رہا ہوں' کیوں جھجک رہا ہوں' انہوں نے کیسے جانا کہ میں ایک گناہ گار انسان ہوں۔

ان ساری الجھن آمیز باتوں کو سوچتے ہوئے میں وضو خانے کی جانب چل دیا' اس وقت بھی میں وضو کے لیے ہی جارہا تھا' جب وہ بزرگ سامنے آئے۔

میں نے ان ساری باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور سوچا کہ موذن صاحب شاید ٹھیک ہی کہہ رہے تھے میں نیند کے غلبے میں تھا اور شاید وہ سب میں نے خواب میں دیکھا ہوگا' ساری رات گزر گئی' اور بیٹھے بیٹھے ہی گزر گئی' ہوسکتا ہے نیند کا جھونکا آگیا ہو۔

میں نے وضو کرکے سنتیں ادا کیں اور جماعت کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اقامت ہوئی پھر نماز...... نماز کی ادائیگی کے بعد میں بھی سارے نمازیوں کے ہمراہ مسجد سے نکل آیا اور نواب کی کوٹھی کی جانب چل دیا۔

گاڑی کو اندر پارکنگ میں کھڑا کیا اور اندر جاکر سوگیا' ایک بات میں نے شدت سے محسوس کی اور وہ یہ کہ مجھے اپنے اندر بہت گہرا سکون مل رہا تھا۔ ایسا سکون جو پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ میں بہت پرسکون ہوکر گہری نیند سوگیا سارا دن سوتا رہا اور جب بیدار ہوا تو دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔

میں بہت فریش بیدار ہوا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طویل انگڑائی لے کر ساری کسلمندی دور کی' چائے کی طلب شدید ہورہی تھی' میں نے دل میں سوچا کہ کاش کوئی چائے لے آئے' اور اسی وقت دروازہ کھلا اور ناصر نے اندر جھانکا' پھر مجھے کھڑا دیکھ کر اندر آگیا اور بولا۔

''آپ اٹھ گئے...... میں کئی مرتبہ آپ کو دیکھ کر جاچکا ہوں' چائے لے آؤں آپ کے لیے......؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ' تم فٹافٹ زبردست سی اسٹرانگ چائے لے آؤ' اتنے میں شاور لے لوں۔''

میں نے رات والا سفید شلوار قمیص اتار دیا' رات ان ہی کپڑوں میں سوگیا تھا اور حسب عادت جینز اور ٹی شرٹ پہن لی' ذہن میں رات نواب کی محفل اور اس کی باتیں گردش کرتی رہیں۔ ساتھ ہی بدرالزماں کے بارے میں بھی سوچتا رہا' بدرالزماں کے بارے میں' میرے ذہن میں ایک پلان تیار ہو رہا تھا کہ کاش میں اپنے اس پلان پر عمل بھی کرسکوں۔ گو یہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا' لیکن ناممکن بھی نہیں تھا' سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں اپنی مرضی سے جب چاہے اور بار بار اس سے ملاقات نہیں کرسکتا تھا' اور اس سے بار بار ملاقات کیے بغیر میرا کام نہیں ہوسکتا تھا' اسے باہر آنے جانے کی آزادی نہیں تھی اور میں بنا کسی وجہ کے وہاں نہیں جاسکتا تھا' محفل بھی مہینے میں ایک ہی بار ہوتی تھی یہ ممکن تھا کہ میں اگلی بار پھر نواب کی چاپلوسی کرکے اس کی تقریر کی ڈھیروں تعریفیں کرکے اس کے ساتھ جانے کی خواہش کا اظہار کرسکتا تھا لیکن ایک ملاقات وہ بھی ایک ماہ کے بعد...... معاملہ بننا بہت مشکل تھا۔ خیر کچھ اور اس کا حل سوچوں گا۔

میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ ناصر چائے لے کر آ گیا اور اس نے مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ ناشتہ چھوڑو میں دوپہر کا کھانا ہی کھالوں گا' تم تھوڑی دیر کے بعد لے کر آ جانا۔ وہ جانے لگا تو میں نے اسے روکا اور کہا۔

"کیا نواب صاحب تشریف لے آئے ہیں؟"

"جی نہیں! ابھی تک تو نہیں آئے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا جب نواب صاحب آجائیں تو مجھے ضرور مطلع کردینا۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

میرا دماغ ایک بار پھر سرجانی ٹاؤن میں واقع نواب کی اس عمارت کی جانب چلا گیا۔ گزشتہ دن وہاں نواب کا کوئی دوبئی والا مہمان آیا ہوا تھا' نواب اس کے ساتھ مصروف ہوگا...... آخر وہ کون ہوگا؟ میرا ذہن اس کے بارے میں سوچنے لگا' مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہ شخص کسی بہت ہی اہم اور خاص کام کے سلسلے میں آیا ہے اور رکا ہوا بھی ہے اور نواب بھی اس کے ساتھ مصروف ہے' کاش میں اس شخص کی ایک جھلک دیکھ پاتا اور اس کی تصویر بھی اپنے موبائل کیمرے میں محفوظ کرلیتا' کیا نام تھا اس کا......" میں نے ذہن پر زور دیا' ہاں یاد آیا' اس کا نام رئیس خان تھا۔ جیسے میں نے شبن کی تصویر کیمرے میں محفوظ کرلی تھی' اس بات کا خیال آتے ہی میں نے فوراً موبائل نکالا اور شبن کی تصویر دیکھی' میں اتنا مصروف رہا کہ تصویر کھینچنے کے بعد اس کو دیکھنا بھی یاد نہیں رہا آیا تصویر صاف اور واضح آئی بھی ہے یا نہیں۔ میں نے تو یوں ہی اس کی تصویر اتاری تھی' لیکن بعد میں شبن اور نواب کے مابین ہونے والی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ساری بات حشام اور سرمئی کے متعلق ہو رہی تھی' سرمئی کو یہ تصویر دکھانی بہت ضروری تھا۔

میں نے موبائل آن کیا اور تصویر دیکھی تو تصویر واضح اور صاف تھی۔ شبن کا سائڈ پوز آیا تھا۔

میں نے بہت پہلے ہی یو ایس بی لاکر ایسے ہی کاموں کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ پر پہلے تصویر منتقل کی' پھر اسے یو ایس بی میں سیو کرلیا۔ ساتھ ہی اس کا نام بھی لکھ دیا' بعد میں موبائل اور لیپ ٹاپ سے اس کی تصویر ڈیلیٹ کردی۔

میں اس کام میں مصروف تھا تب ہی ناصر کھانا لے کر آ گیا۔ آہٹ ہوتے ہی میں نے لیپ ٹاپ کا رخ گھما کر رکھ دیا۔

"تم کھانا رکھ دو میں کھالوں گا' ابھی ایک ضروری کام کررہا ہوں۔" میں نے لیپ ٹاپ پر نگاہیں جمائے ہوئے کہا۔

یو ایس بی میں' میں نے نواب کی محفل...... اس عمارت اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی تفصیلات نوٹ کیں۔ بدرالزماں کے بارے میں بھی لکھا اور خاص طور پر رئیس خان کے بارے میں بھی لکھا۔ دن تاریخ کے ساتھ۔

اس کام سے فارغ ہوکر میں نے یو ایس بی کو اس کمرے میں ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ کھانا کھا کر فارغ ہوا تو میڈم روزی کا خیال آیا کہ اس سے ملاقات کرلی جائے' میں اسے اپنے فلیٹ پر بلانا چاہتا تھا یا پھر وہ خود کسی جگہ پر بلانا چاہے' مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

میں موبائل لے کر بستر پر لیٹنے لگا تو سائیڈ ٹیبل پر رکھے ڈیٹ کلینڈر پر میری نگاہ پڑ گئی اور میں چونک اٹھا' آج ستمبر کی اٹھارہ تاریخ تھی۔

اس تاریخ کے یاد آتے ہی میرا دل اتھاہ اداسیوں میں گھر گیا۔ پچھلے دو تین سالوں سے جب بھی یہ تاریخ آتی ہے میرا دل اسی طرح سے اداس ہوجاتا ہے اور کمرے میں خود کو بند کرکے یا پھر اندھیری رات کی تنہائی میں اس تاریخ کو اپنی یادوں کے جھروکے میں دہرانا نہیں بھولتا۔

وہ بھی ستمبر کی اٹھارہ تاریخ تھی' وہی رات تھی جب میں نے آخری بار مہ وش کو دیکھا تھا۔ اسے چھوا تھا' وہ تکلیف دہ منظر آج بھی میری یادداشت میں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس نے بلیک اور پنک کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا' اور یہ کلرز اس پر سجتے بھی خوب تھے۔ ویسی ہی ہم رنگ چوڑیاں اس کی کلائیوں میں سجی ہوئی تھیں۔ جب سے اسے پتا چلا

تھا کہ مجھے کانچ کی نازک اور رنگ برنگی چوڑیاں بہت پسند ہیں اس نے ان سے اپنی گوری گوری کلائیوں کو سجانا شروع کردیا تھا۔

میری پسندیدہ جیسمین کی خوشبو سے اس کا نازک اور دلکش سراپا مہک رہا تھا۔ مجھے آج بھی سب کچھ یاد ہے۔

اس کی جھیل جیسی گہرائی لیے ہوئے آنکھوں میں ہلکورے لیتا ہوا نمکین پانی' اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ' کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھ۔

مجھ سے یہ کہتے ہوئے کہ ''شاہو تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ تمہاری جان کو خطرہ ہے۔''

مجھ سے بے خودی سے لپٹ جانا' اس کا پیار کرنا' اس نے کتنے ہی بوسے میرے سینے پر ثبت کیے تھے اور شدت جذبات سے مغلوب ہوکر میں نے کتنی ہی بار اس کے ملیح چہرے کو چوما تھا۔ اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے اسے شدت کے ساتھ اپنے سینے میں بھینچ لیا تھا۔

میں کچھ بھی نہیں بھولا...... کچھ بھی تو نہیں۔

وہ آخری ملاقات تھی......!

آج بھی سوچتا ہوں تو ایک سرد آہ میرے سینے سے خارج ہونے لگتی ہے۔

آخری ملاقات! کتنی ظالم ہوتی ہے یہ آخری ملاقات...... یہ آخری ملاقات ہماری پیار کی زندگی میں آئی ہی کیوں...... کیوں؟

میں نے آخری بار اسے چھوا تھا!

میں نے اس پر ہٹتے ہٹتے آخری نگاہ ڈالی تھی۔

آخری بار بوسہ دیا تھا...... آج بھی اس آخری بوسے کی حلاوت مجھے اپنے نمکین لبوں پر محسوس ہوتی ہے۔

مجھے پتا نہیں چلا کہ کب میرا چہرہ میرے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ بہتے ہوئے دریا کی سرسراہٹ محسوس ہوئی تو میں چونک پڑا اور تڑپ کر کہا۔

''یارب اگر تجھے میری زندگی میں یہ سب شامل کرنا تھا تو پیار کا پودا میرے دل میں کیوں اگایا تھا۔ یا میرے اللہ اگر پیار بنایا تھا تو نصیبوں میں جدائی کیوں لکھ دی تھی۔ میرے پیار کے نصیب میں بھی جدائی لکھی تھی' اس لیے وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔

میں سوچنے لگا کہ کبھی زندگی میں کیا میرا آمنا سامنا مہ وش سے ہوگا......؟ اگر ہوگا بھی تو کیا وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوگی...... نہیں! اس کے ظالم باپ نے یقیناً اس کی شادی اپنے جیسے کسی سرمایہ دار سے ضرور کردی ہوگی...... مجھے اسے بھلا دینا چاہیے۔ میں لاکھ چاہنے کے باوجود اسے کیوں نہیں بھلا پاتا...... اس لیے......!'' میرے دل سے آواز آئی۔

''یہ پیار بھی بڑی ظالم شے ہے' اگر جدا ہوجائے تو بندے کو نہ جینے دیتا ہے اور نہ مرنے...... انسان مرغ بسمل کی مانند تڑپتا رہتا ہے۔''

میں مہ وش کی یادوں سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں لیکن یہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں اور تب ہی میرے موبائل فون کی بیل مجھے یادوں کے کانٹوں سے گھسیٹ کر حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔

میں نے سیل فون کی روشن اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ نواب کی کال تھی' میں نے ریسیو کرنے میں لمحہ بھی نہیں لگایا۔

''السلام علیکم نواب صاحب!'' میں نے حسب عادت کہا۔

''تم کہاں ہو؟ کوٹھی پر ہی ہو؟'' اس نے میرے سلام کو ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''جی ہاں کوٹھی پر ہوں۔ کوئی کام تھا آپ کو......؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کام کوئی نہیں تھا' بس تمہیں یہ اطلاع دینی

تھی کہ میں دوبئی جارہا ہوں' کسی سے اہم ملاقات کرنی ہے' تم فری ہو تو ایسا کرو کہ اپنے اس کام کا آغاز کردو' جس کے لیے میں نے تمہیں کہا تھا۔'' اس کا اشارہ اپنے جڑواں بچوں کی تلاش کی جانب تھا۔

''بہت بہتر! ویسے آپ کب تک تشریف لائیں گے۔'' میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

''فی الحال تو یہ کہنا مشکل ہے کہ کب آنا ہوگا' ہوسکتا ہے کہ ہفتہ لگ جائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زیادہ دن لگ جائیں۔''

''ٹھیک ہے نواب صاحب' لیکن آپ کو یاد ہے ناں میں نے آپ سے کیا کہا تھا' سلمان کو بطور خاص ہدایت کردی جائے کہ میرا پیچھا نہ کیا جائے' کیونکہ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ انہیں تلاش کرنے مجھے کہاں کہاں جانا پڑے گا۔'' میں نے انکساری سے کہا۔

''اس کی تم فکر نہ کرو...... میں سلمان اور سیکورٹی گارڈ کو ہدایت کردیتا ہوں کہ تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے' تمہاری مرضی ہے کہیں آؤ کہیں جاؤ' جب چاہو کوٹھی میں آؤ...... اوکے......!'' اس نے جلدی جلدی کہا اور فون بند کردیا۔

فون بند کرکے میں نے گہرے سکون کا سانس لیا۔ مجھے واقعی ایسا لگ رہا تھا جیسے میں واقعی آزاد ہوگیا ہوں...... اب سب سے پہلا کام مجھے میڈم روزی سے ملاقات کرنی تھی۔ سو سب باتوں کو بھلا کر میں نے اس کا نمبر ملایا' رابطہ ہوتے ہی اس نے چہکتی ہوئی آواز میں کہا۔

''زہے نصیب! آخر ڈاکٹر صاحب کو ہماری یاد آہی گئی۔''

''روزی پلیز...... یہ تم مجھے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو ورنہ میں بھی تمہیں میڈم کہہ کر مخاطب کروں گا۔''

''کیوں بھئی! اس میں کیا برائی ہے' ڈاکٹری تو ایک معزز پیشہ ہے اور میں تمہیں عزت کے ساتھ پکارتی ہوں۔'' اس نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''وہ اس لیے کہ اب میں ڈاکٹر نہیں ہوں' شمروز ہوں اور ڈاکٹر اور شمروز میں کوئی بات بھی مشترک نہیں ہے' میں فی الحال اس بات کو یاد بھی نہیں رکھنا چاہتا کہ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں' اگر یاد رکھتا تو میں پوری طرح شمروز نہیں بن سکوں گا' آدھا شیر اور آدھا ہرن بن جاؤں گا۔ شیر کی خاصیت ہے شکار کرنا اور ہرن بیچارا معصوم شکار ہونے والوں میں ہے۔ میں جب خود شکار ہوا...... تو شیر بن گیا......!'' بات کرتے کرتے میرے لہجے میں خود بخود شیر کی سی غراہٹ اتر آئی۔

''بہت خوب......! اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو شیر صاحب بتائیں گے کہ کب شرف ملاقات بخش رہے ہیں۔''

''شیر کہہ کر میرا مذاق تو اڑا رہی ہو۔'' میں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''ارے بابا مذاق کررہی تھی...... تم تو بہت جلدی برا مان جاتے ہو۔'' اس نے سیریس ہوکر کہا۔

''میں تو ایسا ہی ہوں پٹھانی دماغ ہے' بہت جلدی گرم ہوجاتا ہے۔ سوچ لو مجھ سے دوستی نبھا پاؤ گی۔'' میں نے ہلکے سے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آف کورس یار......!'' اس نے جھٹ کہا۔

''اچھا تو آج ملتے ہیں۔ بتاؤ کہاں ملنا چاہو گی' میرے فلیٹ پر آرہی ہو یا مجھے اپنے گھر بلا رہی ہو۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جیسا تم چاہو۔'' اس نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

''نہیں اس کا فیصلہ تم کروگی۔'' میں نے ہٹیلے لہجے میں کہا۔

''اچھا پھر ایسا کرو کہ تم میرے فلیٹ پر آجاؤ......'' اس نے کہا۔

"ایڈریس بتاؤ۔"

"ڈیفنس میں عنبرین اپارٹمنٹس میں فلیٹ E-17 پر آجاؤ۔ میں تمہارے دیدار کی شدت سے متمنی ہوں۔"

"ٹھیک ہے اگلے پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

پھر میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اپنی بہت اہم اور ضروری چیزیں اپنی خفیہ جیبوں میں رکھیں اور گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر آگیا۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے میں گارڈز کو دیکھ کر مسکراتا ہوا گاڑی باہر لے آیا اور گاڑی کو تھوڑی دیر ادھر ادھر سڑکوں پر گھمانے کے بعد ڈیفنس کی جانب مڑ گیا۔ گاڑی کو سڑکوں پر ادھر ادھر گھمانے کا میرا مقصد یہ تھا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی نواب نے مجھے آزاد چھوڑ دیا ہے، کوئی مشکوک بائیک یا مشکوک گاڑی تو میرا پیچھا نہیں کررہی...... اور حقیقت میں ایسا ہی تھا۔

راستے میں، میں یہ سوچتا ہوا جارہا تھا کہ نواب کو آخر ایسا کیا کام آن پڑا کہ وہ اتنے دن کے لیے دبئی چلا گیا۔ خیر یہ بات بھی میں اس کے منہ سے اگلوا ہی لوں گا، نواب اب اپنی خاص باتیں مجھ سے شیئر کرنے لگا تھا۔

عنبرین اپارٹمنٹ کے پارکنگ لاٹ میں، میں نے اپنی کار پارک کی اور اتر کر جانے لگا تو لفٹ کے قریب کھڑے ہوئے گارڈ نے مجھے روکا اور کہا۔

"کس سے ملنے کے لیے جانا ہے......؟"

"میڈم روزی سے...... کیا انہوں نے تمہیں میرے بارے میں بتایا نہیں تھا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"سوری سر! ایسا ہم سیکورٹی کے پیش نظر کرتے ہیں، ویسے ابھی تک میڈم نے ہمیں اپنے کسی مہمان کے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" اس نے مہذب لہجے میں کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم ان سے معلوم کرلو۔" میں نے کہا تو گارڈ نے انٹر کام کے ذریعے روزی سے بات کی اور ایک بار پھر معذرت کرنے کے بعد مجھے جانے کے لیے کہہ دیا اور لفٹ کا دروازہ کھول دیا۔

میں لفٹ کے ذریعے عمارت کی دسویں منزل پر پہنچا اور مطلوبہ فلیٹ کے باہر لگی بیل پر انگلی رکھ دی۔ چند ہی لمحوں بعد لاک کھلنے کی آواز آئی، میڈم روزی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی، اس نے قدرے جھک کر ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا، اور بولی۔

"چشم ما روشن دل ماشاد......!"

اس کے جھکتے ہی میری آنکھوں کے سامنے بجلیاں سی کوند گئیں، کشادہ گریبان والے چھوٹے سے بلاؤز اور تنگ بلیک کلر کی جینز میں وہ سرتاپا قیامت لگ رہی تھی۔ میں ایک ہی لمحہ میں اس کے حسن بلاخیز کے سحر سے باہر نکل آیا اور بجائے اندر جانے کے باہر کھڑے کھڑے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

"نہیں پہلے تم کسی گارڈ کو بلوا کر میری اچھی طرح سے تلاشی لے لو...... کہیں ایسا نہ ہو کہ......!" میں نے خود ہی جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیسی باتیں کررہے ہو...... آؤ ناں!" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور یوں اچانک اس طرح جھٹکے سے کھینچنے پر میں اس سے جا ٹکرایا۔

"اوہ سوری......!" میں نے اپنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سنبھال کر کہا۔

"کس بات کے لیے......؟ سوری تو مجھے تم سے کرنی ہے، دراصل تمہارے ابھی آنے کا سن کر میں اتنا خوش ہوئی کہ نیچے گارڈ کو اطلاع دینا بھول گئی۔ بس تمہارے استقبال کی تیاری کرنے لگی۔" وہ میرا ہاتھ

تھام کر اندر لیجاتے ہوئے اور دروازہ لاک کرتے ہوئے بولی۔

"بہت فریش دکھائی دے رہی ہو۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کے سراپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ "تمہارے آنے کی خوشی میں۔" وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ایسا کیا ہے مجھ میں۔" میں نے اپنے آپ کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں پتا......؟" اس نے براہ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو......!" میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے تجاہل عارفانہ سے کام لیا، کیونکہ میں اس بات سے اچھی طرح سے واقف تھا کہ خواتین کے لیے میرے اندر مردانہ وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

"اچھا......!" اس نے شوخ انداز میں حیرت کا اظہار کیا اور حسب عادت قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ "اچھا سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کیا پیو گے......؟"

"تم کیا پلانا چاہتی ہو؟" میں نے گہرے لہجے میں کہا۔

"میرے پاس وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو۔" اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ "وہسکی، شیمپئن، رم بتاؤ ناں......"

"ان میں سے کچھ نہیں، میں صرف اورنج جوس ہی پسند کرتا ہوں اور وہی پیتا ہوں۔ وہ اگر ہو تو لے آؤ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سچ کہہ رہے ہو!" اس نے حیرت آمیز سنجیدگی سے کہا، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"واقعی مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی، اس لائین میں آکر بھی تم نے اپنے آپ کو ان خبیث اشیاء سے پاک رکھا ہوا ہے۔"

"ساری چیزیں جن کا تم نے نام لیا ہے، انسان سے ہوش اور عقل چھین لیتی ہیں اور اپنے کام بہتر طور پر انجام دینے کے لیے انسان کی عقل کے دروازے کھلے رہنے چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں جو کبھی ان کے ناموں سے بھی ناواقف تھی، آج سب کے ذائقے چکھ چکی ہوں۔ ان رات کی ٹینشن، ندامت اور پشیمانی کو دور کرنے کے لیے مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ میں ان چیزوں کا سہارا لوں...... ان کے نشے میں گم ہو کر انسان ذرا دیر کو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ سو آج میں ان چیزوں کی محتاج ہوچکی ہوں۔" روزی نے اداسی اور سنجیدگی سے کہا پھر اٹھ کر چلی گئی، چند منٹوں بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی اور اس میں اورنج جوس سے لبریز دو گلاس تھے ایک اس نے میری جانب بڑھا دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر کے لیے ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی ہم بس چپ چاپ جوس کے سپ لے رہے تھے، اپنے اپنے طور پر اپنی سوچوں میں گم تھے، پھر مجھے خیال آیا کہ میں تو اس کی کہانی سننے کے لیے آیا تھا، اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے گینگ کا سربراہ کوئی اور ہے آخر وہ کون ہے اور یہ نواب کی دشمن کیوں ہے اس نے اس کا کیا بگاڑا ہے، اس لیے خاموشی کے اس قفل کو میں نے ہی توڑا اور کہا۔

"روزی اس روز تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں، میں جاننا چاہتا ہوں کہ نواب سے آخر تمہاری دشمنی کس لیے ہے، اس نے کس طرح اور کیا

نقصان تمہیں پہنچایا ہے اور تمہارے گینگ کا سربراہ کون ہے میرے بارے میں تو تم سب کچھ جانتی ہی ہو ورنہ پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتاتا بعد میں تم سے پوچھتا۔"

میری بات سن کر وہ چونک سی گئی اور بولی۔

"روحانہ کو میڈم روزی بنانے والا یہی شیطان ہی تو ہے جس طرح تم ڈاکٹر شاہ زمان سے شمروز بن گئے اسی طرح میں بھی شریف ماں باپ کی شریف بیٹی تھی میرے ماں باپ کے پاس غربت تھی لیکن شرافت تھی غریب کی ساری پونجی عزت ہی تو ہوتی ہے اسے بھی کوئی لٹیرا لوٹ لے تو اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچتا......!" اس نے گہری اداسی سے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ......؟ دیکھو تم اداس مت ہو اور خود کو اکیلا مت سمجھو میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو وہ میرے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے تھوڑی دیر اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو جائے اس کی آنکھوں میں یہ آنسو نہ جانے کب سے رکے ہوئے تھے جو ہمدردی کے دو بولوں سے ساری حفاظتی راستے توڑ کر باہر بہہ نکلے۔

خوب رو چکنے کے بعد اس کی سسکیاں تھم گئیں اور اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "آئی ایم سوری شمروز......!"

"اس میں سوری کی کوئی بات نہیں ہے میں جانتا ہوں کہ تمہارے یہ آنسو جو تم نے نہ جانے کب سے انہیں روکا ہوا تھا انہیں کبھی کبھی بہا دینا چاہیے ورنہ اندر کی گھٹن بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر ہم لوگ جن راستوں پر چل نکلے ہیں یہاں یہ آنسو بزدلی کی نشانی سمجھے جاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے سامنے خود کو بزدل نہیں بلکہ بہادر ثابت کرنا ہوتا ہے اپنے دلوں کو پتھروں سے بھی زیادہ سخت بنانا پڑتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ آنسو واقعی دل کو ہلکا کرنے کا قدرت نے بہترین ذریعہ بنائے ہیں۔ سب کے سامنے نہ سہی رات کی تنہائی اور اندھیرے میں ان ہی کا سہارا لینا چاہیے تھا۔ مگر میں نے اپنے آپ کو نشے میں ڈبو کر ختم کر لینا چاہا میں اندر سے بہت تباہ حال اور خستہ حال ہو چکی ہوں بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ سارے مثبت جذبات میرے اندر کہیں فنا ہو چکے ہیں اور میں اپنے آپ کو تباہ کرنے والوں سے انتقام لینے کی کوشش میں ساری دنیا سے انتقام لینے لگی اور ان دنیا والوں میں خود میری اپنی ذات بھی شامل ہے۔" اس نے میرے ہاتھ سے ٹشو پیپر لے کر اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی اپنی تباہی کے ذمہ داروں سے انتقام لینے کے جوش میں ہم اپنے آپ کو ہی تباہ کر بیٹھے حالانکہ ہم اس کے لیے دوسرا راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"وہ کس طرح......؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کسی کو اپنا وکیل بنا کر......!" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہنہ!" اس نے زہرخند انداز میں کہا اور حقارت آمیز مسکراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔

"وکیل! اس وقت ہم کس کو وکیل کرتے کون لڑتا ہمارا مقدمہ...... کون سی عدالت ہمیں انصاف دلواتی ان دولت مندوں کے خلاف...... ان لوگوں میں سب کو خریدنے کی طاقت ہوتی ہے۔ وکیلوں کو گواہوں کو اور سب سے بڑھ کر جج کو...... غریب کو

کبھی انصاف نہیں ملتا ہے...... سوائے بے عزتی رسوائی اور ناانصافی کے۔ یہی غریب کا مقدر ہے اور اگر بات ہو کسی غریب اور جوان لڑکی کی عزت لٹنے کی...... تو سب سے پہلے یہ دنیا والے اسے سنگسار کرتے ہیں۔ پھر پولیس سے لے کر دوسرے لوگوں تک سب اپنے کام اور مدد کرنے کا خراج اس کی عزت سے مانگتے ہیں بقول ان کے ......"اب تمہارے پاس عزت رہی ہی کہاں ہے ایک بار لٹنے یا بار بار...... کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو...... بالکل غلط! میرا مطلب نہ دنیا کے ان وکیلوں سے ہے نہ عدالت اور جج سے۔ میں جس کی بات کر رہا ہوں...... وہ سب سے بڑا وکیل بھی ہے اور اپنی عدالت کا جج بھی...... اور اس کی عدالت میں کبھی بھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوئی۔ بس کوتاہی ہم ہی سے ہوتی ہے ہم اپنا مقدمہ اس کی عدالت میں درج نہیں کرواتے...... اس کو اپنا وکیل نہیں بناتے اور نہ ہی اس کے منصفانہ فیصلے کا صبر سے انتظار کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ صبر کے ساتھ اس کے فیصلے کا انتظار کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اس لیے شاید ہم یہ نہیں کرتے۔" میں نے نرم لہجے میں دھیرے دھیرے کہا۔

"تم کس وکیل کی بات کر رہے ہو...... میں ایسے کسی وکیل کو نہیں جانتی......" اس نے حیرت سے کہا۔

"جانتی ہو مگر پہچانتی نہیں ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ ایسا کون سا وکیل ہے جس کو میں جانتی ہوں لیکن پہچانتی نہیں ہوں۔" اس نے حیرت سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ......!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اللہ تعالیٰ......!" اس نے آہستہ سے زیرلب دہرایا۔

"ہاں ہمارا رب ہمارا مالک ہمارا وکیل ہے وہ وکیل بھی ہے اور منصف بھی وہ کبھی بھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا چاہے وہ غریب ہو یا امیر ......بشرطیکہ وہ اپنا فیصلہ اس پر چھوڑ دیں لیکن جب ہم جیسے کم عقل بندے خود اپنا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا انجام یہی ہوتا ہے جو آج میرا اور تمہارا ہوا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی کے ساتھ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

"شمروز تمہیں اتنی گہری باتوں کا علم کیسے اور کہاں سے ہوا...... اور میں نے کبھی اس انداز سے کیوں نہیں سوچا......" روزی نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"احساس اب ہوا ہے جب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے اور ہم اس گندگی کی دلدل میں سر سے پاؤں تک دھنس چکے ہیں۔" میں نے اپنی پیشانی سے ندامت کے قطرے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ہم غصے اور جذبات میں شیر اور بھیڑیوں کے بھٹ میں جا گھسے یہ سوچ کر کہ ان کو ختم کر لیں گے لیکن یہ ہماری خام خیالی ہی تھی۔ انجانے میں ہم نے خود کو ان کا حصہ دار بنا لیا۔ ابلیس کا سہارا لیا تو اس کے ساتھی بن گئے۔" روزی کے لہجے میں شدید پچھتاوا تھا۔

"ہاں تم نے بالکل ٹھیک کہا میرا تم سے ملنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ جو احساس آج مجھے ہوا ہے اس کا احساس میں تمہیں بھی دلاؤں...... کہ اگر اب بھی اپنے آپ کو بچانا چاہتی ہو تو خود کو ان کا شریک کار مت بناؤ بلکہ اندر کے اندر رہ کر ان کی جڑوں کو کھوکھلا کرو...... اپنی ساری جدوجہد اب ان کو مٹانے کے لیے صرف کرو...... ہو سکتا ہے معاشرے کی اس گندگی کو صاف کرنے کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ہمارے رب کو ہمارے اوپر رحم آ جائے اور وہ ہمیں

معاف کردے اور جن کبیرہ گناہوں کا ہم ارتکاب کر بیٹھے ہیں، وہ انہیں بخش دے۔ مجھ سے وعدہ کرو روزی کہ تم میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے ضرور غور کروگی...... اور جتنا نقصان ان لوگوں نے ہمیں پہنچایا ہے، ہم اس سے زیادہ انہیں پہنچائیں گے...... مگر ان کے کام کر کے نہیں......!"

"تم یہ تو بتاؤ کہ یہ سب کس طرح سے ہوگا۔" اس نے پوچھا۔

"یہ میں تمہیں بتاؤں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں بھی مجھے ان سب کے بارے میں بتانا ہوگا۔ سب سے پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا تو وہ گہری سوچوں میں ڈوب گئی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کرے...... میں نے بھی اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

سوچتے سوچتے وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کے انداز میں بے قراری تھی، قدموں میں لرزش تھی، وہ بے چینی سے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہی تھی۔ کبھی اس کے لب آپ ہی آپ شدت سے بھنچ جاتے...... کبھی وہ اپنے جبڑوں کو سختی کے ساتھ آپس میں پیوست کر لیتی۔

شاید اپنی تباہی کے سارے مناظر ایک ایک کر کے اس کے سامنے آرہے تھے، میں اس کی ساری کیفیت کو اچھی طرح سے سمجھ رہا تھا، کیونکہ بارہا میں بھی اسی قسم کی کیفیات سے گزرتا رہتا ہوں۔ جب میرا ماضی منہ پھاڑ کر میرے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ اس کی بے چینی اور بے قراری ایک سکون میں تبدیل ہوگئی اور اس کے اندر ایک سکوت سا چھا گیا پھر وہ مجھ سے قدرے ہٹ کر اسی صوفے پر آن بیٹھی اور اس نے کہنا شروع کیا...... اس کی حالت ویسی تھی جیسے وہ خواب کی کیفیت میں بول رہی ہو۔

"میرے والد کا نام مظہر حسین تھا...... وہ اسٹیل مل میں کام کرتے تھے، زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ مزدوری کرتے تھے۔ امی بھی ایک ناخواندہ گھریلو عورت تھیں۔ آمدنی کم تھی، لیکن اولاد...... ہم چھ بہن بھائی تھے، سب سے بڑی ہیں رومانہ مجھ سے چھوٹی فرزانہ...... پھر بھائی اظہر اور آخری میں تین چھوٹی بہنیں اور بھی تھیں۔

ابا زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن ان کی خواہش تھی کہ میں اور میرے سارے بہن بھائی خوب اور بہترین تعلیم حاصل کریں۔

امی ابا کم کھلاتے تھے، موٹا جھوٹا پہناتے تھے لیکن ہمارے انگلش میڈیم اسکولوں کی فیس اور اخراجات خوش دلی سے اٹھاتے تھے، بچپن ہی سے ہمارے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ ہمیں دل لگا کر زیادہ سے زیادہ محنت کرنی ہے اور دنیا میں پڑھ لکھ کر ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے۔

ابا میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بہت پیار سے کہا کرتے تھے کہ میں اپنی ساری بیٹیوں کو ڈاکٹر بناؤں گا اور اظہر انجینئر بنے گا۔

جب سب بہن بھائی اسکول جانے لگے تو گزارہ کرنا بہت ہی زیادہ مشکل ہوگیا۔ اس وقت امی نے ابا کا ہاتھ بٹایا اور گھر میں سلائی کا کام شروع کر دیا۔

ابا کی محلے میں بہت عزت تھی، امی بھی پردے دار اور حیا والی خاتون تھیں۔ میں اسکول میں دوسری لڑکیوں کو دیکھتی تھی وہ ہاف ٹائم میں کھانے کے لیے بہت سے پیسے لے کر آتی تھیں لیکن میرے پاس ایک پائی بھی نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات مجھے بہت بھوک بھی لگتی تھی لیکن میں یہ سوچ کر صبر کر لیتی تھی کہ امی کے پاس پیسے ہوتے ہی نہیں ہیں وہ مجھے کہاں سے دیں۔ میں خوب محنت کروں گی ایک دن ڈاکٹر بن جاؤں گی تو غریبی کے یہ دن ہمیشہ یاد رکھوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

میں نے میٹرک بورڈ میں دوسری پوزیشن لی تھی۔ اس دن امی اور ابا کے چہرے پر جو خوشی اور مسرت تھی وہ مجھے آج بھی یاد ہے، کتنے لوگ کتنے ہی دن ہمارے گھر مبارک باد دینے کے لیے آتے رہے، سارے لوگ امی ابا کی تعریف زیادہ کر رہے تھے کہ انہوں نے اس غربت میں بھی ہماری کتنی شاندار تربیت کی ہے، اور ہمیں تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا ہے۔

ڈاکٹر بننے کا جوش اور ولولہ میرے اندر پہلے سے بھی زیادہ پیدا ہوگیا۔ میں نے شہر کے بہترین کالج میں ایڈمیشن لے لیا، مجھے اب بھی اے ون گریڈ لانا تھا، خاص طور پر پرسنٹیج زیادہ لانی تھی تاکہ میرا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو سکے۔

ہم سب بہن بھائی کی عمروں میں سال سال کا فرق تھا، اس لیے کلاسز میں بھی سب ایک ایک سال ترتیب سے تھے۔

فرسٹ ایئر میں مجھے ٹیوشن کی ضرورت ہوئی تو ابا نے کہا جس سے چاہو پڑھ لو، میں پیسے دے دوں گا، لیکن میں جانتی تھی کہ ابا کہاں سے دیں گے، اس لیے کہا کہ میں ٹیوشن پڑھا کر کچھ اپنا خرچہ اٹھا لیتی ہوں لیکن ابا نے منع کر دیا کہ تم صرف پڑھو، محنت کرنے کے لیے ابھی میں زندہ ہوں۔

اور ابا نے شام کے اوقات میں ایک اور نوکری تلاش کر لی، اب وہ رات کو بارہ بجے ہی گھر لوٹتے تھے اور میری ٹیوشن کی فیس خوشی خوشی دیتے تھے۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا، میں دن رات پڑھائی میں مصروف رہتی میرا فرسٹ ایئر کلیئر ہوگیا، نمبر بھی بہترین آئے، تب مجھے احساس ہوا کہ ابا اور امی دن

رات محنت کر کر کے کتنے کمزور ہو چکے ہیں۔ ابا کو دل کی تکلیف ہوگئی تھی اور یہ بات امی اور ابا دونوں نے ہم بہن بھائی سے چھپائی۔ ایک رات اچانک ابا کو انجائنا کا اٹیک ہوا تب مجھے پتا چلا۔

میں نے ابا کو صاف کہہ دیا کہ آپ ہماری خاطر اتنی محنت نہ کریں۔ اپنی پڑھائی کا بوجھ میں خود اٹھاؤں گی۔

پھر ابا اور امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں نے ٹیوشن پڑھانی شروع کردی، کالج میں میری دوست نے مجھے ایک ہائی کلاس فیملی کے بارے میں بتایا کہ انہیں اپنے دو بچوں کے لیے ٹیوٹر کی ضرورت ہے لیکن گھر جاکر پڑھانا ہوگا، میں نے فیس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ دونوں کے دو ہزار روپے ملیں گے۔

یہ سن کر میں خوشی سے اچھل پڑی اور کہا کہ مجھے وہاں کی ٹیوشن دلوادو اور امی ابا سے پوچھے بناء میں ان کی کوٹھی پر چلی گئی اور بات کرلی، انہوں نے مجھ سے میری رہائش اور گھریلو حالات پوچھے جو میں نے سچ سچ بتادیئے تو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت بھی دیں گے ہمارا ڈرائیور آپ کو گھر سے لے بھی آئے گا اور چھوڑ بھی آئے گا، تاکہ آپ کو زیادہ آنے جانے کی تکلیف اٹھانی نہ پڑے۔

میں نے گھر آکر جب اس ٹیوشن کے بارے میں امی ابا کو بتایا تو انہوں نے سختی کے ساتھ منع کیا لیکن میں نے ان کا کہنا نہیں مانا اور پہلی مرتبہ میری آواز ابا کے سامنے اونچی ہوئی۔ میں نے کہا۔

"تو پھر کیا کروں...... آپ نے اتنے بچوں کی فوج جمع کرنے سے پہلے نہیں سوچا کہ ان کو کہاں سے کھلائیں گے...... اچھی تعلیم دلانے کے خواب آنکھوں میں سجا لیے، یہ نہیں سوچا کہ پیسہ کہاں سے آئے گا...... آج تک میں ایک ایک چیز کو ترستی رہی کلستی رہی، اپنی ہر خواہش کو دل میں مارتی رہی کہ ابا کہاں سے کریں گے...... لیکن آج جب مجھے ایک اچھا موقع مل رہا ہے تو آپ کی عزت اور انا آڑے آرہی ہے، آپ کس دنیا میں رہ رہے ہیں ابا...... غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی...... یہاں عزت ہے تو صرف اس کی جس کے پاس پیسہ ہے چاہے اس نے وہ پیسہ رشوت لے کر حاصل کیا ہو یا اسمگلنگ سے...... میں یہ ٹیوشن ضرور پڑھاؤں گی اور کوشش کروں گی کہ ایسے دو چار ٹیوشن اور مل جائیں تاکہ میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی فیس بھی باآسانی ادا کروں...... گھر میں آنے والے یہ دس پندرہ بچے پچاس پچاس روپے میری ہتھیلی میں رکھتے ہیں۔ ان سے کچھ نہیں ہوتا ابا...... میں جو کررہی ہوں مجھے کرنے دیں۔"

"لیکن بیٹا تم دوسروں کے گھروں میں روز روز جاؤ گی تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی۔ سب تو یہی کہیں گے کہ میں اتنا ناکام شخص تھا کہ اپنی ایک بیٹی کو بھی تعلیم نہیں دلوا سکا اور ویسے بھی جب عورت اپنے گھر کی دہلیز سے باہر قدم رکھتی ہے تو شیطان اس کے ہمراہ ہولیتا ہے، میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں۔" ابا نے تھکے لہجے میں کہا۔ "میری تو قطعی مرضی نہیں ہے۔"

"رہنے دیں ابا ان پرانی اور دقیانوسی باتوں کو...... ابھی تو صرف تعلیم کا مسئلہ ہے، آپ پانچ لڑکیوں کو کیسے بیاہیں گے یہ کبھی سوچا ہے آپ نے...... ابا میں آپ کا سہارا بننا چاہتی ہوں۔" میں نے آخری جملہ نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں چاہیے مجھے سہارا...... ابھی میں زندہ ہوں مرجاؤں تو جو دل چاہے کرتی پھرنا۔ کم از کم جیتے جی تو مجھے نہ مارو...... اگر تم نہ مانیں تو میں اپنی نظروں میں آپ گر جاؤں گا۔" ابا نے کچھ غصے میں کچھ شکستگی کے انداز میں کہا۔

"آپ بے کار کی ضد کررہے ہیں۔ میں یہ ٹیوشن ضرور پڑھاؤں گی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" میں نے کہا اور ابا کے پاس سے اٹھ کر آگئی۔

میں نے ٹیوشن پر جانا شروع کردیا۔ بڑی سی سفید گاڑی جسے ایک باوردی ڈرائیور چلا رہا ہوتا تھا روزانہ مجھے لینے اور چھوڑنے آنے لگی تو محلے میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ لوگ آآ کر امی ابا سے سوال کرنے لگے کہ آخر میں اس گاڑی میں بیٹھ کر روزانہ کہاں جاتی ہوں۔

پھر مسز ہمدانی کے توسط سے مجھے تین ٹیوشنز اور مل گئیں۔ اس طرح گھر کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگیا۔ میں نے چند نئے جوڑے بھی بنالیے جو میں پہن کر جاتی تھی۔

لوگوں میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں، ابا نے مجھ سے بات کرنا بالکل ہی ختم کردی تھی۔ میں بھی اس بات کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔

پھر ایک سانحہ ہوگیا...... ابا اسٹیل مل گئے اور وہاں سے سیدھے ہاسپٹل پہنچ گئے۔ وہ اوپر سے گر پڑے تھے، جس سے انہیں شدید چوٹیں آئیں۔ ان کی ایک ٹانگ ایک ہاتھ اور دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔

ایک ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد ابا گھر آگئے اور پھر ہمیشہ کے لیے بستر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ وہ سارا دن بستر پر چپ چاپ لیٹے چھت کو تکتے رہتے تھے، گھر کے سارے اخراجات میں اٹھا رہی تھی۔

اسی چکر میں سیکنڈ ایئر کے ایگزام ہوگئے۔ میری پڑھائی زیادہ نہیں ہوسکی تھی۔ اس لیے رزلٹ آیا تو میرا اے گریڈ آیا تھا۔ میڈیکل کالج میں داخلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جس دن میرا رزلٹ آیا، ابا بے حد روئے...... اس دن انہوں نے نہ کچھ کھایا اور نہ پیا۔

ہمارے گھر میں اداسی کی فضا طاری تھی، کوئی ایک فرد بھی مبارک باد دینے کے لیے نہیں آیا۔ ابا کا مجھے ڈاکٹر بنانے کا خواب شیشے کی مانند ٹوٹ کر چکنا چور ہو چکا تھا اور میں نے بھی فیصلہ کرلیا کہ میں آگے تعلیم حاصل نہیں کروں گی بلکہ اپنے بہن اور بھائی کو پڑھاؤں گی۔ کیونکہ اب میں نے ابا کی جگہ سنبھال لی تھی۔

میں تندہی سے ابا کا علاج کروا رہی تھی، لیکن ابا صحت یاب ہی نہیں ہو رہے تھے یا شاید وہ صحت یاب ہونا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔

ابا کی بیماری کو لے کر میں دن رات پریشان رہنے لگی، میری آمدنی کا زیادہ تر حصہ ابا کی دواؤں پر خرچ ہو جاتا تھا۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی
تیرا پہلو تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شب تنہائی کی
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی
اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی
(پروین شاکر)

اس روز جب شبانہ نے مجھ سے کہا۔ ''آپا فیس جمع کروا دیں مجھے نوٹس مل گیا ہے۔'' تب میں نے دیکھا کہ شبانہ کی فیس جمع کروانے کے لیے تو پیسے ہی نہیں بچے۔ تب میں نے کہا۔

''گڑیا اس مرتبہ تو سارے پیسے ابا کی دواؤں پر خرچ ہو گئے' اگلے ماہ پہلے تمہاری دو ماہ کی فیس جمع کروادوں گی' تم اسکول سے ایک ماہ کی مہلت لے لو۔''

تب ہی اظہر نے کہا کہ اسے کچھ کتابیں چاہیں چھوٹی فرحانہ نے کہا کہ اس کا جوتا پھٹ گیا ہے اسے نیا چاہیے۔

''چپ کر جاؤ سب......!'' میں چیخ اٹھی۔ ''میں کیا کیا کروں' ان پیسوں میں' اس ماہ کچھ نہیں ہوسکتا۔ تم سب کے پیٹ بھر جائیں تو غنیمت جانتا......'' پھر میں نے ابا سے کہا۔

''دیکھ لیں ابا' آپ مجھے ٹیوشن پڑھانے سے منع کررہے تھے ناں......آپ اپنا حال دیکھ لیں' اگر میں ٹیوشن نہ پڑھا رہی ہوتی تو آج ہم سب فاقوں سے آپ کی نام نہاد عزت میں منہ چھپا کر مر گئے ہوتے۔''

''تجھ سے ایک فرمائش میں بھی کررہا ہوں رومانہ......!'' ابا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے کہیں سے زہر کا ایک ٹیکہ لگادے تاکہ میں یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ ہی نہ رہوں۔''

تو میں جھنجلا کر وہاں سے اٹھ آئی' شام کو مسز ہمدانی کے ہاں جب بچوں کو پڑھانے لگی تو گھر میں ہونے والی چیخ چیخ میرے دماغ میں گونجنے لگی اور میں نے رضوان کو سوال صحیح حل نہ کرنے پر بری طرح ڈانٹ دیا' تب انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا بات ہے رومانہ' آج تم بہت ڈسٹرب دکھائی دے رہی ہو' اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ' ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے کچھ کام آسکوں۔''

دو سال میں میری مسز ہمدانی سے اتنی شناسائی ہوچکی تھی کہ میں اپنے گھر کے مسئلے ان سے ڈسکس کرلیا کرتی تھی تو انہیں میں نے سب کچھ بتادیا ساری بات سننے کے بعد وہ بولیں۔

''پیسوں کا مسئلہ تو میں حل کردوں گی' تم مجھ سے ایڈوانس رقم لے جانا۔ اس کے علاوہ ایک اور مشورہ بھی دوں گی کہ تم اپنے مسائل کے حل کے لیے ہمارے روحانی پیشوا ہیں محترم سطوت السلام صاحب......ان کے در پر جاکر کوئی بھی سائل خالی ہاتھ نہیں آتا' تم ایسا کرو کہ ان کی محفل میں شرکت کرو......ان کا دم کیا ہوا پانی اپنے ابا کو پلاؤ وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائیں گے......اور یہ لڑائی جھگڑا......اور ٹینشن جو تمہارے گھر میں دن رات رہتی ہے اس کے لیے بھی دعائیں بتائیں گے اور ہاں رزق کی برکت کی بھی دعا ضرور کروالینا۔''

اور اس دن میں مسز ہمدانی سے رقم لے کر گھر گئی اور چھوٹے بہن اور بھائی کے مسئلے حل کردیئے تب پہلی مرتبہ اپنے لیے میں نے ابا اور امی کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں دیکھی۔

(باقی آئندہ)

گردش حالات

خلیل جبار

جناب عمران قریشی

السلام علیکم!

رپورٹر کی ڈائری کے ایک ورق کے ساتھ حاضر ہوں۔ ہمارے قانون میں ہزار ہا سقم ہیں۔ آپ اپنے پیسے اور تعلقات کے بل بوتے پر مظلوم کو ظالم اور ملزم کو مدعی ثابت کرسکتے ہیں ایسا ہوتے ہم عدالتوں میں روزانہ دیکھتے ہیں لیکن کبھی کبھار ایک عام سا صحافی ذرا سی کوشش سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے کسی مظلوم کو انصاف دلانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ جیسا اس کہانی میں ہوا لیکن ایسا روز روز نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات اس چکر میں ہم صحافیوں کو بھی لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ بہر حال آپ کہانی پڑھیے اور دیکھیے ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے۔

خلیل جبار
حیدر آباد

سول عدالت میں کسی مقدمہ کی سماعت چل رہی تھی۔ بیانات قلم بند ہورہے تھے۔ میں اور رضا شاہ برنی کورٹ کے احاطے سے ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر پہنچے تھے۔ ابھی ہم عدالت کی سماعت کے ختم ہونے کا انتظار کررہے تھے کہ اچانک دوسری طرف سے نعیم قریشی اور استاد پیارے بھی آگئے۔

''ضرور کوئی خاص خبر ہے جبھی تم دونوں یہاں کھڑے ہو؟'' استاد پیارے نے چہکتے ہوئے کہا۔

''ہم ابھی یہاں پہنچے ہیں۔'' رضا شاہ برنی نے کہا۔

''برنی تم نے بھی کل پرزے نکالنے شروع کردیئے ہیں۔ تم میر پور خاص میں ہی صحیح تھے' بلاوجہ حیدرآباد آئے۔''

''صحافت کا شوق مجھے حیدرآباد لے آیا ہے ورنہ ایجوکیشن میں میری نوکری ہے لیکن صحافت کا شوق بھی ختم نہیں ہوتا۔''

''ہاں تمہاری یہ بات درست ہے' میر پور خاص میں صحافت میں زیادہ چارم نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے شہروں میں صحافت کرنے میں مزا آتا ہے۔ وزیراعظم' وزیراعلیٰ جیسی شخصیات سے ملاقات کر کے ان سے سوالات کرنے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ بہت سارے صحافی ہیں جو صحافت کے پیشے میں زیادہ ترقی نہیں کرسکے لیکن وہ صحافت کو کسی بھی صورت چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہیں۔'' نعیم قریشی نے کہا۔

''آپ لوگ یقیناً جادوگر والی خبر لینے آئے ہو۔'' چپراسی نے ہمیں عدالت کے باہر کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

''جادوگر......!'' ہم سب چونکے۔

''ہاں جادوگر کا بیان قلم بند ہورہا ہے' آپ جب تک فریادی پارٹی سے بات چیت کرلیں۔'' چپراسی نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ اس مقدمے میں فریادی ہیں؟'' ہم نے اس نوجوان سے پوچھا۔

''جی ہاں لیکن آپ کون ہیں؟'' اس نوجوان نے پوچھا۔

''ہم صحافی ہیں اور کورٹ رپورٹنگ کرتے ہیں۔''

''اچھا اچھا' میں سمجھ گیا۔ جی میرا نام فواد ہے اور

اس جادوگر نے میرے بھائی کو تشدد کر کے ہلاک کیا ہے۔ میرا بھائی سفیان مست قسم کا لڑکا تھا' اس نے ہمیں بتایا تھا کہ اس پر آسیب کا سایہ ہے اور ٹھیک ہوسکتا ہے۔ ہم اس جادوگر کی باتوں میں آگئے' یہ روزانہ ہمارے گھر آتا تھا اور جھاڑ پھونک کر کے چلا جاتا تھا۔ ایک دن علاج کے بہانے سے میرے بھائی سفیان کو گھر سے لے گیا کہ میں اس پر سے آسیب اتاروں گا لیکن اس نے تشدد کر کے اسے ہلاک کردیا اور اس کی لاش جامشورو لے جا کر پل سے پانی میں بہادی اور خود بھی غائب ہوگیا۔ بڑی مشکل سے یہ قابو آیا ہے' آپ لوگ یہ خبر اخبارات میں اچھے انداز میں لگانا تا کہ لوگ ایسے جعلی جادوگروں کے چکر میں نہ پڑیں۔'' فواد نے کہا۔

''ہاں ہاں' آپ بے فکر رہیں جیسا آپ کہیں گے ویسی ہی خبر لگے گی۔'' استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ابھی ہم نے ڈائری بند کی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔

''ارے صحافی بھائیو! کدھر چلے' میری بھی عرض سن لو' آپ نے ایک طرف کی بات سن لی اور میری نہیں سنی۔''

عدالت میں سماعت ختم ہوچکی تھی اور جادوگر نے ہمیں خبر نوٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا' اس لیے عدالت کے باہر آکر اس نے آواز لگائی تھی۔

''کیا کریں ہمیں جادوگروں سے بڑا ڈر لگتا ہے' کہیں ہمیں تم جادو سے کبوتر بنا کر فضا میں نا اڑا دو۔'' میں نے اس کو چھیڑا۔

''مجھ سے مت ڈرو' میں کوئی جادوگر نہیں ہوں' تھانے کا عملہ ویسے بہت بہادر بنتا ہے لیکن ساری رات مجھ سے ڈرتا رہا ہے۔ کوئی میرے قریب نہیں آتا' لوگ پولیس سے ڈرتے ہیں اور پولیس مجھ سے ڈرتی رہے۔''

''کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو؟'' استاد پیارے نے کہا۔

''میں نے پولیس والوں سے سگریٹ جلانے کو ماچس مانگی تو انہوں نے دور سے ہی پھینک دی۔''

''یار تمہارے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہے' لوگ تم سے ڈر رہے ہیں ہم سے کوئی نہیں ڈرتا۔'' رضا شاہ برنی نے کہا۔

''آپ کو بھی جو بیان دینا ہے وہ ہمیں لکھوادیں۔'' استاد پیارے نے کہا۔

''میری کورنگی کے علاقے میں پرچون کی دکان تھی' یہ دکان میرے والد نے اس وقت کھولی تھی جب کورنگی نمبر ڈھائی کی نئی آبادی میں آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ دکان میں ہر طرح کا سامان ہونے کی بناء پر لوگ دور دور سے سامان لینے آتے تھے' اس وقت آبادی بہت بڑھ چکی ہے۔ آبادی کے حساب سے دکان کی سیل پر بھی بہت اثر پڑا تھا۔ رات گئے تک مصروفیت رہتی۔ آج صبح ہی سے دکان پر بہت رش تھا۔ دراصل ابتدائی تاریخ تھی تنخواہ دار طبقے کو جیسے ہی تنخواہ ملتی ہے وہ مہینے بھر کا راشن گھر میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوپہر ہوجانے پر مجھے کچھ لمحے کو فرصت ملی تھی میں کچھ دیر ستانے کو بیٹھ گیا۔

''بھورے بھائی! کیا حال ہیں؟ آج فرصت میں نظر آرہے ہو؟'' فواد نے مجھے فارغ دیکھ کر پوچھا۔

رنگ زیادہ گورا ہونے کی بناء پر سب مجھے بھورا کہتے ہیں' میرے اصل نام سلیم سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ فواد اس آبادی میں زیادہ پرانا نہیں تھا اسے کو آئے ہوئے ابھی دو ماہ ہی ہوئے تھے لیکن اس نے اپنے اچھے اخلاق سے اس علاقے کے لوگوں کو اپنا ایسا دوست بنالیا تھا' جیسے وہ برسوں سے یہاں رہ رہا ہو۔

''فرصت ہمیں کہاں مل سکتی ہے' مہینے کی ابتدائی تاریخ ہے' دوپہر میں کچھ دیر کو فرصت مل جاتی ہے ورنہ صبح وشام بہت رش رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بھورے بھائی' کبھی دنیا کو بھی دیکھ لیا کرو' دنیا کتنی خوب صورت ہے' سب کچھ یہیں رہ جائے گا۔'' فواد نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو' انسان کو تفریح کے لیے بھی وقت نکالنا چاہیے لیکن کیا کروں دکان آکر اتنا مصروف ہوجاتا ہوں کہ دنیا کی خبر ہی نہیں رہتی۔ رات گئے تک لوگوں کو سامان دینے میں مصروف رہتا ہوں۔ شام میں چھوٹے بھائی نعیم کے آجانے پر دکان کا سامان لینے کو مارکیٹ چلا جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آج شام کو آپ ہمارے گھر آرہے ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ارے آپ بھول گئے' میں نے آج آپ کی گھر پر دعوت رکھی ہے اگر آج آپ نہیں آئے تو میں سخت ناراض ہوجاؤں گا۔'' فواد نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا۔

''میں واقعی بھول گیا تھا۔'' میں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرنا مجھے شام کو مس کال دے دینا' میں تمہاری مس کال دیکھ کر سمجھ جاؤں گا کہ دعوت میں جانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''دیکھ لیں کہیں پہلے کی طرح بھول نہ جانا۔'' فواد نے کہا۔

''نہیں' میں نہیں بھولوں گا۔'' میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

فواد اس سے پہلے بھی مجھے دو بار دعوت دے چکا تھا لیکن یہ اتفاق تھا کہ مجھے مارکیٹ میں ہی دیر ہوگئی اور میں اس کی دعوت میں نہیں جاسکا۔ اس بار میں نے سوچ لیا تھا کہ آج مارکیٹ ہی نہیں جاؤں گا' اس طرح وقت پر دعوت پر پہنچ جاؤں گا۔

فواد کی مس کال آنے پر مجھے یاد آگیا کہ دعوت میں جانا ہے' میں اپنے چھوٹے بھائی نعیم کو دکان پر بٹھا کر فواد کے گھر چلا گیا۔ دستک دینے پر فواد کی بہن نے دروازہ کھولا۔ فواد کی بہن پر نظر پڑتے ہی میں اس کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا' وہ حسن کا شاہکار تھی۔ میک اپ نے اس کو اور بھی جاذب نظر بنادیا تھا۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ فواد کی بہن اس قدر حسین ہوگی۔ نظریں تھیں کہ اس کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ مجھے اپنی جانب اس طرح محو پاکر وہ شرما سی گئی اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

''آ...... آ...... آپ اندر تشریف لائیے نا۔ باہر کیوں کھڑے ہیں۔'' وہ مجھے اندر آنے کا راستہ دے کر ایک طرف کو ہوگئی۔

''آ...... ہاں...... ہاں......!'' میں اس کے بولنے پر بوکھلا سا گیا۔

بیٹھک میں داخل ہوکر میں ابھی بیٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

''آپ تشریف رکھیں۔''

''فواد کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فواد بھائی ابھی آرہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

میں بیٹھک میں بیٹھ کر فواد کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی' اس کی بہن شمع شربت کا گلاس لے کر آگئی۔

''آج گرمی بہت ہے آپ شربت پی کر موسم کا لطف لیں۔'' شمع نے کہا۔

''مہمان کو بلا کر میزبان کہاں غائب ہے۔'' میں

نے شربت کا گلاس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"ان کے کسی دوست کا فون آ گیا تھا' جس کی بناء پر انہیں اچانک جانا پڑ گیا۔ وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔" شمع نے بتایا۔

"یہ کیسی تقریب ہے یہاں میرے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آ رہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ دراصل آج میری سالگرہ ہے' ہمارے اس علاقے میں کوئی رشتہ دار وغیرہ ہے نہیں' اس لیے گھر کے افراد ہی مل کر سالگرہ منائیں گے۔ بھائی جان اکثر آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں' جب سالگرہ میں دوستوں کو بلانے کی بات آئی انہوں نے اپنے دوستوں میں صرف آپ کا ہی نام بتایا تھا کہ آپ کو ہی بلائیں گے۔"

"کمال ہے فواد نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری سالگرہ ہے' میں آپ کے لیے کوئی خوب صورت سا تحفہ لے آتا۔" میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

اس سالگرہ میں بغیر تحفہ لائے مجھے بڑی شرمندگی ہو رہی تھی۔ میرے بھی ذہن میں نہیں رہا تھا کہ اس سے معلوم کر لوں' کس قسم کی دعوت ہے۔ مجھے فواد نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ کھانے کی تقریب ہے۔

"آپ نے دعوت قبول کر لی اور آ گئے یہی ہمارے لیے بڑا تحفہ ہے۔" شمع نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سالگرہ میں شرکت کرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کیا جائے لیکن آنے والوں کا بھی فرض بنتا ہے کہ وہ اس خوشی کے موقع پر تحفہ دے کر ثابت کریں کہ اس کو بھی خوشی ہوئی ہے۔ چلیں آپ کا تحفہ ادھار رہا پھر کبھی لے آؤں گا۔" میں نے کہا۔

ابھی کچھ دیر گزری تھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فواد سے موبائل پر بات کروں کہ فواد آ گیا۔ اس کے آنے پر شمع کی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔ شمع اپنی سالگرہ پر بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ شمع کو خوش دیکھ کر میرے دل میں نا جانے کیوں کچھ ہو رہا تھا شاید میں پہلی ہی ملاقات میں اس کو دل دے بیٹھا تھا۔

گھر آ کر بھی میرے ذہن پر شمع چھائی ہوئی تھی' اس کا چہرہ میری آنکھوں کے آگے بار بار آ رہا تھا۔ شاید اسی کو پیار کہتے ہیں۔

فواد کے گھر کا رستہ میں نے کیا دیکھا' اب میرا ہفتے میں ایک چکر ضرور لگنے لگا تھا۔ فواد کا ایکسپورٹ امپورٹ کا کام تھا' اس لیے وہ گھر پر کم ہی ملتا تھا لیکن میرے جانے پر فواد کی والدہ مجھے چائے پلائے بغیر نہیں آنے دیتی تھیں۔ میں خود بھی اب یہی چاہتا تھا کہ ایسے وقت پر جاؤں جب فواد گھر پر نہ ہوتا کہ شمع کے باہر زیادہ سے زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع مل جائے۔

شمع بھی میرے جانے پر خوش رہتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے چائے کے ساتھ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی کوئی نہ کوئی ڈش کھلائے بغیر نہیں بھیجتی تھی' دو ماہ کے اندر میری شمع سے ایسی دوستی ہو گئی کہ ہم کو ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ میں نے والدہ صاحبہ سے اس بات کی خواہش کی کہ میں شمع سے شادی کرنا چاہتا ہوں' اس بات پر انہوں نے کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا اور مجھ سے بولیں۔

"سلیم بیٹے! زندگی تم کو گزارنی ہے' تم اپنی زندگی کے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہو کہ کس کے ساتھ تمہاری زندگی اچھی گزرے گی۔ شمع تم کو پسند ہے تو مجھے بھی اس رشتے پر انکار نہیں لیکن مجھے وہاں بھیجنے سے پہلے پوچھ لینا کہ ہم کب گھر پر رشتے کی بات کرنے آئیں اور ان کے گھر والوں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں شمع سے اس بارے میں بات کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

ایک دن موقع پا کر میں نے شمع سے اس سلسلے کے متعلق بات کرنے کا پروگرام بنایا۔ دراصل والدہ کی گفتگو سے مجھے بڑا حوصلہ ملا تھا' میں نہیں چاہتا تھا کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد والدہ کو کسی قسم کی تکلیف یا دکھ دوں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ انہیں زیادہ سے زیادہ خوش رکھوں۔ شمع کو خوش گوار موڈ میں دیکھ کر میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"شمع میں چاہتا ہوں کہ تمہارے گھر اپنی والدہ کو رشتے کی بات کرنے کو بھیج دوں۔"

"دل میرا بھی بہت چاہتا ہے تم رشتے کی بات کرو لیکن مجبوری ہے کہ میرا بھائی فواد نہیں مانے گا۔" شمع نے کہا۔

"وہ کیوں نہیں مانے گا' مجھ میں ایسی کیا کمی یا نقص ہے جو وہ نہیں مانے گا؟" میں نے حیرت سے شمع کو دیکھا۔

"سلیم تمہیں معلوم ہے کہ میرے بھائی کا مارکیٹ میں بڑا نام ہے' تم سے رشتہ ہو جانے پر لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے۔" شمع نے کہا۔

"شمع میرا اپنا ذاتی کاروبار ہے اور کام بھی اچھا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی بات درست ہے لیکن لوگ دکان دار کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے' ہاں اگر یہ کام تم ایکسپورٹ امپورٹ کے طور پر کرنا شروع کر دو پھر دیکھو لوگ کیسی تمہاری عزت کرتے ہیں۔" شمع نے کہا۔

"تمہاری بات سے بالکل اتفاق کروں گا کہ لوگ بناوٹ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ بڑا کاروبار دکھانے پر زیادہ عزت کی جاتی ہے لیکن میرا باہر کے ممالک میں سامان بھیجنے کا تجربہ نہیں ہے۔" میں نے اس کو اپنی مجبوری بتائی۔

"میرے بھائی کا کام یہی ہے تم اس کے ساتھ مل کر یہ کام شروع کر دو پھر جب اچھی طرح یہ کام سمجھ میں آ جائے اپنے طور پر کام شروع کر دینا۔" شمع نے تجویز دی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو لیکن ایک چلتے ہوئے کام کو ختم کر دینا بھی عقل مندی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"سلیم ترقی کرنا ہر شخص کا خواب ہوتا ہے لیکن کامیاب وہی ہوتے ہیں جو رسک لینا جانتے ہوں' اگر تم یہ رسک نہیں لے سکتے پھر کبھی بھی ہم ایک دوسرے کے نہ ہو سکیں گے۔" شمع نے افسردہ ہوتے ہوئے کہا۔

شمع کے اداس ہو جانے پر میں بھی اداس ہو گیا۔ میں اس کو کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن چلتی دکان سے ہاتھ دھونا بھی اچھی بات نہیں تھی۔ دل کہتا تھا کہ رسک لے لو اور دماغ کہتا تھا کہ یہ سراسر بے وقوفی ہے۔ والدہ کو دکان ختم کر دینے سے دکھ ہوتا' میں کسی بھی طور انہیں دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ والدہ کو والد کی ہر شے سے پیار تھا وہ ان کے ہاتھوں سے لائی ہوئی چیزوں کو بڑا سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں۔

میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا' سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک انوکھا خیال آ گیا۔ یہ خیال آتے ہی میں مطمئن ہو گیا' میں نے اپنی دکان سے دس لاکھ کی رقم نکال لی اور بھائی کو اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ میں ایکسپورٹ امپورٹ کے کام میں تجربہ کر رہا ہوں اگر کامیاب ہو گیا تو ہم دونوں بھائی یہ دکان مکمل طور پر ختم کر دیں گے اور رقم ڈوب جانے پر اس دکان پر ہی نئے سرے سے کام کریں گے تم فی الحال لوگوں سے یہی کہنا کہ میں دکان کے کام سے الگ ہو گیا ہوں۔ دس لاکھ کی رقم دکان سے نکل جانے پر سامان سے بھری دکان اب خالی خالی نظر آنے لگی تھی۔ دکان کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہو رہا تھا لیکن میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔

میری چھٹی حس نا جانے کیوں مجھے بار بار خبردار

کررہی تھی کہ میں جو کام نہیں جانتا وہ سراسر گھاٹے کا سودا ثابت ہوگا۔ اسی لیے وہی کام کرو جو کام تم جانتے ہو اس میں کامیابی ہے۔

میں نے جب فواد کو دس لاکھ روپے کی رقم دی وہ بڑا خوش ہوا۔

”بھورے یہ تم نے بڑا اچھا سوچا ہے۔ اس کام میں بڑی عزت اور پیسہ ہے۔ اس کام میں پیسہ لگاتے ہوئے تم سوچ رہے ہوگے یہ کام تم نے کیا ہی نہیں کہیں نقصان نہ ہوجائے‘ تم اس بات سے بالکل بے فکر رہو‘ میں بھی جب اس کام میں نیا نیا آیا تھا‘ اس کو کرتے ہوئے ڈر رہا تھا لیکن کامیابی ملی‘ میرا دل کھل گیا‘ میں اس کام میں اب مار نہیں کھا سکتا۔“

”ہاں کوئی بھی کام جو نیا ہو دل میں طرح طرح کے وسوسے آتے ہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم بے فکر ہو جاؤ‘ ہم اس بار چینی باہر بھیجیں گے۔ باہر پاکستانی چینی کی ان دنوں بڑی ڈیمانڈ ہے‘ وہاں سے ہمیں اچھا منافع ملے گا۔ سب کے پاس اپنی اپنی کار ضرور آجائے گی۔ جیسے جیسے کام میں ترقی ہوگی تم اپنے کام کو بڑھاتے رہنا اور ہاں کام اچھا چلنے پر اپنے بھائی کو کاروبار میں شامل کرلینا تاکہ وہ یہ نہ کہے کہ جب بھائی کو کاروبار میں فائدہ ہو رہا ہے تو مجھے الگ کردیا ہے۔“ فواد نے کہا۔

میں ہاں ہوں کرکے رہ گیا۔

”تم بے فکر رہو تمہارا کاروبار اچھا چل جائے پھر تمہاری خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔ مجھے شمع نے سب کچھ بتادیا ہے۔“ فواد نے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں ایکسپورٹ امپورٹ کے کاروبار میں پیسہ لگا کر بہت خوش تھا‘ دن رات خیالوں ہی خیالوں میں شمع کو اپنی دلہن کے روپ میں دیکھ کر خوش ہوتا رہتا تھا‘ کئی ماہ تک فواد مجھے سبز باغ دکھاتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میرا روپیہ تین گنا ہوچکا ہے اگر میں کچھ اور کاروبار میں لگادوں تو یہ منافع مزید اور بڑھ جائے گا۔ وہ براہ راست نہیں بلکہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اکسا رہا تھا کہ میں کسی طرح دکان کو ختم کرکے اس دکان ختم کر کے پیسہ بھی کاروبار میں لگادوں۔ اس کی چکنی چپڑی باتیں سن کر میرے دل میں خیال آتا کہ فواد صحیح کہہ رہا ہے‘ جب اس کام میں بیٹھے بٹھائے اچھا منافع مل رہا ہے پھر کیا ضرورت ہے دکان رکھنے کی لیکن مجھے بار بار ابا مرحوم کی نصیحت یاد آتی تھی کہ:۔

”بیٹا! ہم نے سب کچھ اس دکان سے ہی کمایا ہے‘ ہماری ہر خواہش اس دکان نے ہی پوری کی ہے اس لیے جب تک دکان فائدہ دیتی رہے‘ کبھی اس کو ختم کرنے کا بھول کر بھی ارادہ نہ کرنا۔ کاروبار میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے اس سے کبھی پریشان نہ ہونا اور ایسے موقع پر صبر کرنا۔“ یہ والد صاحب کی نصیحت ہی تھی جو میں دکان کو ختم کرنے کا سوچ کر بھی ختم کرنے کو تیار نہ تھا۔

ایکسپورٹ امپورٹ میں پیسہ لگائے مجھے چار ماہ سے زائد عرصہ ہوگیا تھا لیکن مجھے فواد نے ایک روپیہ بھی نہیں دیا تھا۔ جب بھی حساب کتاب کی بات کرتا وہ مجھے زیادہ منافع کی خوش خبری سنا کر بات ختم کردیتا۔ حساب کتاب دکھانے کو تیار نہ تھا اور حساب کتاب دکھاتا بھی کیسے جو آفس لیا ہوا تھا وہ کرائے پر تھا۔ اس آفس میں میز کرسی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ ہر وقت فواد کے دوست گپ شپ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے منہ سے کبھی میں نے کاروبار کی بات نہیں سنی تھی۔

میرے بار بار رقم کے تقاضے پر فواد سے تلخ کلامی بھی ہوگئی تھی لیکن وہ اخلاق کا ایسا مظاہرہ کرتا کہ مجھے خاموشی اختیار کرنا پڑ جاتی تھی۔ شمع بھی مجھ سے کترانے لگی تھی۔ میں جب بھی فواد سے ملنے

بہانے سے شمع سے ملاقات کرنے جاتا‘ اس کی والدہ فواد کے گھر پر نہ ہونے کا کہہ کر دروازے سے ہی رخصت کردیتی تھیں۔ شروع شروع میں مجھے بڑا غصہ آتا تھا لیکن وقت گزرنے پر مجھے فائدہ یہ ہوا کہ میرے دماغ سے شمع کا بھوت جو سوار تھا اس کا جادو اترنے لگا اور میرا ذہن حقیقت کو سمجھنے لگا تھا کہ میرے ساتھ بہت بڑا فراڈ ہوچکا تھا۔ ابھی اگر میں نے سختی کرکے رقم نہیں نکلوائی تو وہ رقم ڈوب جائے گی۔ میں نے فواد سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

”مجھے منافع وغیرہ کچھ نہیں چاہیے‘ شرافت سے میری اصل رقم لوٹادو ورنہ پھر میں تم کو عدالت میں کھینچ کر اپنی رقم نکلواؤں گا۔“

میری دھمکی سے فواد گھبرا گیا اور اس نے ایک اپنے مست بھائی سفیان جو دو سال قبل پاگل پن کا دورہ پڑ جانے پر گھر سے نکل کر حیدرآباد چلا گیا تھا اور جامشورو پل سے چھلانگ لگا کر پانی میں ڈوب کا ہلاک ہوگیا تھا‘ اس کی جیب سے ایسی کوئی شناخت نہ ملنے پر پولیس نے اس کی لاش کو لاوارث قرار دے کر ٹنڈو یوسف قبرستان میں دفن کردیا تھا۔ فواد نے اس کو بہت تلاش کیا بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور اس نے کپڑے اور اس کے پاس ملنے والے سامان کو دیکھ کر شناخت کرلیا کہ مرنے والا اس کا بھائی تھا۔ چوں کہ لاش کو دفنائے کئی ماہ گزر چکے تھے اس لیے انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی لاش کو وہاں کے قبرستان سے نکال کر کراچی میں تدفین کی جائے اب میرے رقم کے تقاضے پر انہوں نے سفیان کو تشدد کرکے قتل کرنے کی ایف آئی آر میرے خلاف حیدرآباد کے تھانے میں درج کرادی۔ اس ایف آئی آر میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ میں جادوگر ہوں اور اس کا علاج کرنے ان کے گھر آتا تھا‘ ایک دن علاج کے بہانے میں اس مست کو گھر سے لے گیا تھا اور اس پر آسیب کے بہانے تشدد سے ہلاک ہوجانے پر گھبرا گیا اور اس کی لاش جامشورو لے جاکر پانی کی نذر کردی تاکہ اس کی لاش بہتی ہوئی کہیں دور نکل جائے اور کوئی شناخت نہ کرسکے کہ یہ کس کی لاش ہے۔“

”کیا آپ مطمئن ہیں کہ اس مقدمے سے بری ہوجائیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا یقین ہے کہ جب میں نے جرم کیا ہی نہیں پھر مجھے کیسے سزا ہوگی۔ اگر میں ان کے بھائی کو علاج کے بہانے لے گیا تو انہوں نے میرے خلاف اس کے اغواء کی ایف آئی آر کیوں درج نہیں کرائی جب کہ اس واقعے کو ڈیڑھ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور ایف آئی آر انہوں نے اب درج کرائی ہے ایف آئی آر دیر سے درج ہونے پر ہی مقدمہ کمزور ہوجاتا ہے۔“

”اس میں کوئی شک و شبے کی گنجائش نہیں‘ ایف آئی آر دیر سے درج ہونے سے مقدمہ کمزور ہوجاتا ہے۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”آج عدالت میں کیا کارروائی ہوئی ہے؟“ رضا شاہ برنی نے پوچھا۔

”آج ہم لوگوں کے عدالت میں بیان قلم بند ہوئے ہیں‘ مجھے تین دن کے پولیس ریمانڈ پر پولیس کے حوالہ کرکے سفیان کی قبر کشائی کرکے اس کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہی میری بے گناہی کو ظاہر کرے گی کہ اصل حقیقت کیا ہے اور وہ کیسے ہلاک ہوا تھا۔“ جادوگر نے کہا۔

”اچھا آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں تفصیل سے آگاہ کیا۔“ رضا شاہ برنی نے اپنی قریب کی نظر کا چشمہ چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا اور اپنی نوٹ بک کو بیگ میں رکھ لیا۔

”یہ جو باتیں میں نے آپ کو بتائی ہیں‘ وہ اخبار میں آئیں گی نا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہر کام طریقے سے ہوگا تم پریشان نہیں ہو۔“ استاد پیارے نے کہا۔

”میں کل کون سا اخبار دیکھوں اس خبر کو پڑھنے کے لیے؟“

”جادوگر بھائی یہ خبر سب اخباروں میں آئے گی لیکن میرا اخبار تمہیں ایسا دلہا بنائے گا جو کوئی نہیں بنا سکتا۔“ استاد پیارے نے چہکتے ہوئے کہا۔

”دلہا بنائے گا؟“ جادوگر چونکا۔

”دلہا سے مراد استاد پیارے کی یہ ہے کہ ان کا اخبار آپ کی خبر کو بہت زیادہ نمایاں انداز میں شائع کرے گا۔ دراصل ان کے اخبار کا مزاج ہے کہ وہ خواتین اور کرائم کی خبروں کو زیادہ نمایاں لگاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہمارا اخبار بھی آپ کو مناسب کوریج دے گا‘ ہمارا اخبار ”پاسبان“ حیدرآباد کا مقامی اور سب سے پرانا اخبار ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر مبارک قریشی بھائی مقامی خبروں کو بڑے نمایاں انداز میں شائع کرتے ہیں۔“ رضا شاہ برنی نے کہا۔

”آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری بات کو توجہ سے سنا۔“ جادوگر نے کہا۔

جادوگر کی بات مکمل ہوجانے پر پولیس کورٹ کے احاطے سے جادوگر کو واپس کمرۂ عدالت میں لے گئی تاکہ کاغذی کارروائی پوری ہوجانے پر اس کو تھانے لے جایا جائے۔

”دیکھ لیں استاد پیارے دنیا میں کیا ہورہا ہے۔“ نعیم قریشی نے کہا۔

”استاد پیارے کو سب پتا ہے کہ معاشرے میں کیا ہورہا ہے۔“ استاد پیارے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ دنیا ہے یہاں لوگوں کو کھڑے کھڑے بیچ دیا جاتا ہے اور بکنے والے کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کتنے میں بک گیا۔“

”استاد پیارے یہ بات ہم نے آپ سے ہی سیکھی ہے کہ لوگ کس طرح بک جاتے ہیں بے خبری میں۔“

یہ جملہ کہہ کر میں نے استاد پیارے کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ استاد پیارے میں خاص بات تھی کہ وہ ہر نئے آنے والے کورٹ رپورٹر پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھ دیتے تھے اور اس کو ساتھ ساتھ مختلف کورٹ میں لیے پھرتے تھے۔ جہاں پیدا گی بات ہوتی تو اس رپورٹر کے اخبار میں خبر چھپوانے کے نام پر پیسے پکڑ لیتے تھے اور خبر اس رپورٹر کو یہ کہہ کر پکڑا دیتے تھے کہ اس خبر کو شائع کرنے سے تمہارا نام روشن ہوگا کہ یہ کتنی اچھی خبر لے کر آیا ہے۔ جب رپورٹر ان کے کام سے واقف ہوتا وہ ان کی شاگردی سے بغاوت کرکے ان سے دور ہوجاتا تھا۔ میں جب اپنے اخبار کی کورٹ رپورٹنگ کرنے کورٹ آنے لگا‘ اس نے سمجھا کہ میں بھی کوئی نیا رپورٹر ہوں اور ان کے چکر میں آجاؤں گا۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ استاد پیارے نے میرے نام پر چاند ٹھیکیدار سے تین سو روپے پکڑ لیے۔ چاند ٹھیکیدار مجھے جانتا تھا جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں خبر اور تین سو روپے مل گئے ہیں‘ اس پر میں نے اس کو بتایا کہ آپ کی خبر مل گئی لیکن خبر پیسوں میں نہیں بغیر پیسوں کے لگتی ہے اور مجھے کوئی پیسے نہیں ملے ہیں۔ جس پر چاند ٹھیکیدار کو بڑا غصہ آیا۔ دوسرے دن اس نے استاد پیارے کو جی بھر کر کھری کھری سنادی اور پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ استاد پیارے کے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ استاد پیارے بھی استاد پیارے تھے وہ پیسے وصول کرکے کہاں دینے والے تھے۔ ایک ماہ تک وہ کورٹ میں داخل نہیں ہوسکے وہ جب بھی کورٹ آتے چاند ٹھیکیدار کی صورت دیکھ کر رفو چکر ہوجاتے۔

ایک دن استاد پیارے کورٹ کا وقت ختم ہونے پر کینٹین میں داخل ہوئے‘ اندھیرے میں انہیں چاند ٹھیکیدار دکھائی نہیں دیا‘ وہ جیسے ہی ایک سوفے پر بیٹھے چاند ٹھیکیدار اپنا کالا سا چہرہ لیے نمودار ہوگیا۔ چاند ٹھیکیدار کو دیکھ کر استاد پیارے کی ہوا خشک ہوگئی‘ وہ وہاں سے اب بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔ چاند ٹھیکیدار نے انہیں جی بھر کر کھری کھری سنا ڈالی۔ استاد پیارے کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو خون بھی نہ نکلے۔ یہ استاد پیارے کی خوش قسمتی ہی تھی کہ کورٹ رپورٹر خالد جاوید وہاں آگیا اور اس نے ان کی آپس میں صلح کرادی۔ ساتھ ہی انہیں تین سو روپے جو استاد پیارے نے چاند ٹھیکیدار سے لیے تھے وہ دینے کی آفر کی لیکن چاند ٹھیکیدار نے پیسے واپس نہیں لیے اس طرح استاد پیارے دوبارہ کورٹ میں آنے لگ گیا۔

”خلیل جبار یہ باتیں راز کی ہوتی ہیں‘ سب کے سامنے مت کیا کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم سے غلطی ہوگئی‘ غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے فرشتوں سے نہیں۔ تم اس طرح استاد پیارے کو سب کے سامنے ذلیل نہ کیا کرو۔“ استاد پیارے نے مصنوعی غصے کا اس طرح اظہار کیا کہ بے اختیار سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ استاد پیارے بھی کھسیانے ہوکر ہنسنے لگے۔

☆

سلیم عرف بھورے عرف جادوگر کا عدالت نے تین روز کا ریمانڈ دیا تھا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ پولیس ریمانڈ کیا ہوتا ہے۔ میں نے گفتگو کرتے ہوئے سلیم عرف جادوگر اور فواد کو بغور دیکھا تھا اس لیے میں تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ سلیم قصوروار نہیں ہوسکتا البتہ فواد اپنی گفتگو اور آنکھوں سے انتہائی شاطر انسان لگا تھا۔ میں نے یہ ٹھان لیا تھا کہ میں اس واقعہ کی تہہ تک جاؤں گا تاکہ ایک بے گناہ پھانسی سے بچ جائے۔ اس کا اظہار میں نے استاد پیارے برنی‘ خالد جاوید سے بھی کیا۔ انہوں نے بھی اس حوالے سے ہامی بھرلی۔ چنانچہ ہم نے اس کیس کا سراغ لگانے کے لیے ڈیوٹی باندھ لیں۔

میں نے دو روز میں ہی معلوم کرلیا کہ فواد اور اس کا گھرانا نوسر باز ہے۔ فواد کی والدہ اور بہن اپنی چکنی چپڑی باتوں اور اداؤں سے شکار پھانستی ہیں اور کاروبار میں سرمایہ کاری کے نام پر رقم اینٹھ کر اور بعد ازاں نقصان کے بہانے رقم کھا جاتے ہیں۔

استاد پیارے اور دیگر رپورٹرز ساتھیوں نے اپنے تعلقات کے بہانے لاش کے دوبارہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ حاصل کرلی تھی رپورٹ کے مطابق مذکورہ لاش کسی مچھیرے کی تھی اور وہ دل کے دورے کے باعث دریا میں گر کر ڈوب گیا تھا۔ ہمارے کہنے پر جب وکیل صفائی نے ڈی این اے ٹیسٹ کا مطالبہ کیا تو فواد بوکھلا گیا اس عرصہ میں میں نے فواد کے ڈسے ہوئے ایک اور شخص کو سلیم کے وکیل تک پہنچادیا۔

وکیل صفائی نے ایک ماہ کے اندر ہی عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا ملزموں کے جس کٹہرے میں جہاں سلیم کھڑا تھا آج فواد اس کی ماں اور دونوں بہنیں کھڑی آنسو بہا رہی تھیں اور جج صاحب سے رو رو کر رحم کی اپیل کررہی تھیں۔ رو تو سلیم اور اس کے گھر والے بھی رہے تھے مگر ان کے آنسو تشکر کے تھے جبکہ استاد پیارے کی آنکھیں سلیم کے باپ کے ہاتھوں میں پکڑے پانچ کلو مٹھائی کے ڈبے کو دیکھ رہی تھیں۔

❖

سنہرا جال

محترم بھائی عمران احمد!
السلام علیم!
ایک محاورہ ہے "کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی چال بھی بھول گیا۔" یہ مثال ہمارے معاشرے میں نچلے اور مڈل کلاس کی ان لڑکیوں پر پوری اترتی ہے جو چند کتابیں پڑھ کر من ہی من میں اونچے اونچے خواب بننے لگتی ہیں اور پھر کوئی بھی بھنورا ذرا سی کوشش سے ان کا شکار کرکے اڑ جاتا ہے اور یہ لڑکیاں روشن خیالی کے نام پر خود کو لٹا کر بدنامی اور تباہی کے گہرے گڑھے میں گر جاتی ہیں۔ زیر نظر کہانی بھی ایک ایسی لڑکی کی ہے اس لیے ہمارے معاشرے کی تمام لڑکیوں کے لیے ایک سبق بھی ہے اگر وہ سمجھیں تو۔

طلعت نفیس
جوہر آباد

''ٹھاہ ٹھاہ ٹھاہ!'' کی دل دہلا دینے والی والی آوازوں کے ساتھ وہ گر کر تڑپنے لگا۔ دو تین جھٹکے لینے کے بعد وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ موقع واردات پر پہنچنے والے انسپکٹر نے احتیاط سے پسٹل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

❁ ......☆...... ❁

''اٹھ گئیں۔'' احمر نے کمرے سے باہر نکلتی ہوئی ندا کو دیکھا۔ نیند کے گلابی ڈورے اب تک اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

''ہنہہ! کوئی سو سکتا ہے اس چڑیا گھر میں۔'' اس نے اپنے آگے پیچھے دوڑتے ہوئے بھائیوں کو دیکھ کر تلخی سے کہا اور منہ دھونے لگی۔

❁ ......☆...... ❁

ٹن ٹن ٹن اسمبلی کی بیل ہوتے ہی تمام ٹیچرز اور بچے قطار بنا کر گراؤنڈ میں جمع ہونا شروع ہوگئے۔

ندا کچی بستی یعنی پس ماندہ علاقہ جہاں وہ رہتی تھی۔ اس سے ملحق آبادی میں ایک پرائیوٹ اسکول میں ہیلپر ٹیچر کے طور پر کام کرتی تھی' انٹر کرنے کے بعد اس نے یہاں جوائن کرلیا تھا۔ اپنی کمائی کا نشہ ہی اور تھا۔

اسمبلی میں اعلان ہوا کہ بریک میں میٹنگ ہے' تمام ٹیچرز پہنچ جائیں۔

''لو بھئی لنچ کی بھی چھٹی۔'' رومی بولی۔

تمام ٹیچرز اس ہونے والے اعلان سے بے مزا ہوگئی تھیں۔

سر کی ہدایت کے مطابق تمام ٹیچرز بریک میں آفس میں موجود تھیں۔

''گائز!'' سر اکرام بولے۔ وہ قدرے مشفق باس تھے۔ ''اب میرا بیٹا احمد انگلینڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے آ گیا ہے۔ اس لیے فی الحال یہ سیٹ وہ سنبھالے گا اور اب کچھ اللہ اللہ کا ٹائم بھی ہے' اس لیے میں عمرہ کے لیے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد چیک اپ کے لیے لندن جاؤں گا پھر ان شاء اللہ احمد کے ساتھ آتا جاتا رہوں گا۔'' سر اکرام نے اپنی بات ختم کرکے ایک نظر گھمائی۔ ''کوئی پرابلم!'' انہوں نے ٹیچرز سے پوچھا۔

''اوکے سر!'' تمام ٹیچرز ایک ساتھ بولے۔

''میٹنگ از اوور!'' سر اکرام نے کہا اور تمام ٹیچرز ایک ایک کرکے آفس سے نکل گئے۔

❁ ......☆...... ❁

''باجی...... باجی! جلدی باہر آئیں' احمر بھائی سموسے اور چاٹ لائے ہیں آپ کی پسندیدہ۔'' صائمہ نے کمرے میں کاپیاں چیک کرتی ہوئی ندا کو بلایا۔

''اوہو! آ رہی ہوں ابھی۔'' وہ مصنوعی جھنجلاہٹ سے بولی۔

''ہنہہ ہنہہ!'' احمر نے دروازے سے متوجہ کیا۔

احمر اس کی خالہ کا بیٹا تھا۔ بچپن سے اس کی نسبت احمر سے طے تھی اور ان دونوں کو اس کا علم تھا اور دونوں خوش تھے۔

''بھئی صائمہ! لوگ ہماری طرح فارغ تھوڑی ہیں' بے حد مصروف ہیں۔'' احمر شرارت سے بولا۔

''اچھا بھئی زیادہ اتراؤ مت۔'' وہ کاپیاں سمیٹتے ہوئے بولی۔

❁ ......☆...... ❁

آج اسکول میں نئے پرنسپل کی آمد تھی تقریباً سب ہی ٹیچرز خصوصی اہتمام کے ساتھ اسکول آئی تھیں۔ رومی اور رومیا کے ساتھ رہ کے ندا بھی بہترین پہننا' اوڑھنا سیکھ گئی تھی۔

ریڈ اینڈ بلیک سوٹ میں ندا سب سے نمایاں نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا کہ اس کا تعلق کسی کچی بستی سے ہے اور اس کے سج سنور کے رہنے کا اسٹائل اس کو مزید نمایاں کر دیتا۔

''مس ندا! آپ کو سر نے بریک میں بلایا ہے۔'' ماسی نے آ کر اطلاع دی۔ ابھی سر احمد کو آئے صرف تین دن ہوئے تھے وہ خاصے لیے دیئے رہتے تھے۔

''یار رومی! مجھے کیوں سر نے بلایا ہے۔ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟'' ندا کو آئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ اس لیے وہ جلد پریشان ہو جاتی تھی۔

''نہیں یار! گھبراؤ نہیں۔'' رومی نے اس کو تسلی دی۔

''سر! کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟'' ندا نے اندر داخل ہونے سے پہلے پوچھا۔

''جی جی آیئے!'' سر نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''مس ندا! یہ دیکھیں 4th کلاس کے بچے کی کاپی' چیکنگ میں بہت غلطیاں ہیں' انہیں درست کریں۔'' انہوں نے ندا کو کاپی تھمائی' ہاتھوں کی تھرتھراہٹ ان سے چھپی نہ رہ سکی اور ندا اس ٹھنڈے اور خوشبو دار کمرے سے باہر آ گئی۔ احمد کے ٹھاٹ باٹ اور شخصیت سے وہ بے حد مرعوب ہو چکی تھی۔

❁ ......☆...... ❁

''یہ کیا لائے ہو؟'' رابعہ بیگم نے پیسے فیاض صاحب کے سامنے اچھال دیئے۔

''میں کیا کروں اس دفعہ چھٹیوں کی وجہ سے بہت پیسے کٹ گئے۔'' فیاض صاحب بے چارگی سے بولے۔

''ابھی ندا کی تنخواہ بھی تو آئے گی' کسی طرح کھینچ تان کر گزارہ کرلو۔''

''ان نواب زادی کو کیا کہتے ہو' وہ تو آدھی سے زیادہ تنخواہ اپنے کپڑے لتے پر لگاتی ہیں۔'' رابعہ بیگم کلس کر بولیں۔

❁ ......☆...... ❁

''مس ندا! بریک میں سر نے آپ کو بلایا ہے۔'' ماسی اطلاع لائی مگر ندا آج خاصی پُراعتماد تھی۔ پنک اور پرپل امتزاج کے سوٹ میں وہ نمایاں نظر آ رہی تھی۔

خاص طور پر احمد کی پیغام دیتی آنکھیں اس کو محسوس ہوگئی تھیں۔

"لیس سر! آپ نے مجھے بلایا؟" وہ خاصے اعتماد سے مخاطب ہوئی۔

"گڈ مس ندا!" اس کی نظروں کی ستائش اس سے چھپی نہ رہ سکی۔

"یہ آپ کی سیلری ہے؟" اس کے ہاتھ میں سیلری شیٹ تھی۔ "آپ بہت محنت کرتی ہیں یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہے اگر یہ سیلری بڑھ جائے تو......؟" اس نے ندا کے سامنے سوالیہ نشان چھوڑا۔

"اس میں کوئی اچنبھے والی بات نہ تھی کیونکہ تمام ہیلپر ٹیچرز کی سیلری آس پاس ہی تھی پھر اس نے ندا سے اس کے حالات پوچھے' اس نے بڑھا چڑھا کر پیش کیے۔

"اوہو! آپ تو ضرورت مند ہیں' میں آپ کی سیلری بڑھا دیتا ہوں مگر باہر کسی کو پتا نہ چلے۔" احمد نے سیلری شیٹ واپس لیتے ہوئے ندا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ندا نے بجائے بُرا منانے کے ایک خوب صورت مسکراہٹ اس کی طرف اچھال دی۔ وہ اتنی اچھی آفر مسترد نہیں کر سکتی تھی۔

اب تو تقریباً روزانہ ہی سر احمد چھٹی میں ندا کو روک لیتے' ویسے سب کہ سامنے لیے دیئے رہتے تاکہ اسٹاف کو شک نہ ہو۔ اس نے ندا کے گرد سنہرا جال بُننا شروع کر دیا تھا۔

۞ ......☆...... ۞

"باجی! احمر بھائی آئسکریم لائے ہیں' جلدی باہر آئیں۔" حسب عادت صائمہ چلائی اور آ کر اس کے ہاتھ سے کاپی چھیننے لگی۔

"کیا بدتمیزی ہے' چھوڑو کاپی۔ ہر وقت کا تم لوگوں کا چھچھوراپن...... اس نکھٹو کو تو اور کوئی کام نہیں سوائے یہاں کے چکر لگانے کے۔" اور دروازے پر کھڑے احمر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا نہ جانے کب آئسکریم پگھل کر گر گئی۔

احمر کو ریڈ سگنل مل گیا تھا اس لیے اس نے اپنی ماں کو باقاعدہ رشتہ لینے اور منگنی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

ندا بدل گئی تھی۔ آج اسمبلی میں سر احمد کی بے قرار نظریں اس کے سجے سنورے روپ کو دیکھ رہی تھیں۔ وائٹ اور پرپل انار کلی فراک' اپنے لمبے اور گھنے بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ لائٹ پرپل لپ اسٹک' نازک جیولری پر اس کا حسن ہی نرالا لگ رہا تھا۔

......☆☆☆......

"ندا بیٹے! آج اسکول مت جاؤ' تمہاری ریحانہ خالہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ رسم کرنے کے لیے آج آنا چاہ رہی ہیں۔" اب تو وہ امی کو بھرپور پیسے دیتی کیونکہ اس کے کپڑوں اور دوسری چیزوں کا شوق پورا کرنے کے لیے احمد کافی تھا۔

اس لیے امی کا رویہ بھی خاصا بدل گیا تھا۔

"امی پلیز انہیں منع کر دیں ایسا کون سا خزانہ بھرا ہے ان کے گھر میں' جو بیٹے کی شادی کے لیے اتنا اُتاولی ہو رہی ہیں۔" وہ تلخی سے کہتی ہوئی پاؤں پٹختی نکل گئی۔

ندا سنو تو......" امی کہتی رہ گئیں۔

۞ ......☆...... ۞

"میم! اندر آپ کو سر بلا رہے ہیں۔" اسٹاف روم میں رومی اور مسز کامران بیٹھی تھیں۔

"اس کے کچھ زیادہ ہی آفس کے چکر نہیں لگتے۔" مسز کامران نے سرگوشی کی۔

"نہیں نہیں' سر کو واقعی کچھ کام ہو گا۔" رومی نے اس کا کمزور دفاع کیا۔

"آیئے بھئی' کیوں بجلیاں گراتی ہو مجھ ناتواں پر۔" وہ ستائشی انداز میں گویا ہوا۔ وہ ٹیبل کے کونے پر ٹک گئی۔

"میں نے آپ کو منع کیا ہے نا اسٹاف کے سامنے مت بلایا کریں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"جب اتنا سج کر آؤ گی تو کون کافر بچ پائے گا۔ چھٹی میں آ جانا سرپرائز گفٹ ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے آ جاؤں گی مگر ہوش و حواس میں رہیے گا۔"

اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی تمام حدیں پار کر گئے۔ اب اس کا احمد سے روزانہ ایک مطالبہ ہوتا' اپنے ماما پاپا کو بھیجو مگر اس کا کام نکل گیا تھا۔

"چھٹی میں رکو گی نا۔" موبائل کی بپ کے ساتھ پیغام موجود تھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"پلیز۔" اداس شکل کے ساتھ پیغام تھا۔

اور وہ چھٹی کے وقت خاموشی سے نکل گئی۔

اگلے دن اس نے چھٹی کر لی۔ سارا دن بے قراری لیے ہوئے میسج موصول ہوتے رہے اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پچھتاوے کی دہلیز پر کھڑی تھی۔

اگلے دن جب وہ اسکول پہنچی تو احمد کی بے قراری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"یار! آ جاؤ نا اب صبر نہیں ہوتا۔"

"نہیں......!"

"معاف کر دو جو کہو گی مانوں گا۔" احمد کا یہ ایس ایم ایس اس کو خوش کر گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے چھٹی میں رک جاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔

چھٹی میں وہ اس کو اپنے پاس پاتے ہی حواس کھونے لگا۔

"نہیں! بس اب سب شادی کے بعد۔" ندا

بولی۔ "اچھا یہ بتاؤ مما پپا کو کب بھیجو گے؟" اس کے ہاتھ روکنے اور مما پپا کی تکرار پر وہ جھلا گیا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ ہر وقت ایک ہی رٹ نہ خود کوئی لمحہ انجوائے کرتی ہو نہ مجھے کرنے دیتی ہو۔" احمد غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ اس کا سب کچھ باہر آچکا تھا۔ "تمہاری جیسی لڑکیاں صرف ٹائم پاس ہوتی ہیں، شادی کے لیے نہیں اور میرے ماما پپا نے میری منگنی میرے ماموں کی بیٹی سے کردی ہے۔ تم جیسی لڑکیاں تو ہمارے پھینکے ہوئے نوٹوں سے مل جاتی ہیں، تم سے شادی کی کیا ضرورت۔" اس کے اندر کا بھیڑیا باہر آچکا تھا۔

☆

وہ کیماڑی کے پل کی ریلنگ پکڑے کھڑی تھی۔ اس میں واپس گھر جانے کی ہمت بھی نہیں تھی، وہ وہاں سے نکل کر سیدھی یہاں آئی تھی۔

"میرے رب مجھے معاف کردے، ایک مخلص آدمی کا دل توڑنے اور پیسے کی چمک دمک میں کھونے کی میں نے سزا پائی۔ یارب! تُو تو ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ میرے اس گناہ کو بخش دے۔" ابھی چھلانگ لگانے ہی والی تھی کہ دو مہربان ہاتھوں نے اس کو تھام لیا۔

"کیوں اپنی خوب صورت زندگی کو ختم کررہی ہو۔" یہ نیلم تھی اور اس نے ساری داستان نیلم کو سنادی۔

"خود کیوں مرتی ہو میری جان! اس کو مارو۔" نیلم نے اس کو گلے لگایا۔

"میں کہاں جاؤں؟"

"تم میرے ساتھ چلو، وہاں میری باجی بھی ہیں۔" پھر وہاں جا کر یہ داستان نیلم نے باجی کو سنائی۔

"مگر مجھے تو پستول وغیرہ چلانی نہیں آتی میں کیسے......؟" ندا خاموش ہوگئی۔

"راجو......!" باجی نے آواز لگائی ایک مکروہ شکل آدمی اندر داخل ہوا۔

"حکم!"

"اس کو پستول وغیرہ چلانا سکھاؤ، تربیت کرو پوری اس کی اور ہاں نیلم! باقی تربیت تم کرو گی یہ تمہارے ساتھ رہے گی۔ مگر ہم اس سے کام اس کے اس دشمن کے خاتمے کے بعد لیں گے۔" باجی نے گویا ندا کی زندگی کا پلان ترتیب دے دیا۔

اس نے شلوار قمیص اتروا کر اس کو ٹاپ جینز پہنایا۔ اس کے بال کٹوا کر ریڈش بلیک ڈائی کروائے، اب تو ندا بھی آئینے میں اپنے آپ کو کھوجتی رہ جاتی۔

راجو نے اسے پسٹول چلانے میں ماہر کردیا تھا اور کام گرمیوں کی چھٹیوں سے ایک دن پہلے یعنی اسکول کے لاسٹ ڈے اس کو انجام دینا تھا۔ نیلم نے ندا کو سب کام سمجھا دیا تھا اور کہا تھا یہ کام ہونے کے بعد اس نے بھی یہ ہی کام کرنا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی۔

نیلم اور ندا KFC سے نکلنے کے بعد مال میں گھوم رہی تھیں کہ اچانک احمر اس کے سامنے آگیا۔

"تم......تم ندا ہو نا۔" وہ آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت لیے اس کو دیکھ رہا تھا۔

کہاں وہ سیدھی سادی ندا...... کہاں یہ جینز ریڈ ٹاپ والی لڑکی۔

"نہیں...... نہیں...... میں پنکی ہوں اور یہ میری بہن نیلم۔" ندا بولی، اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

"نہیں، یہ تمہاری بہن نہیں، تمہاری بہن صائمہ ہے۔ تم فیاض انکل کی بیٹی ہو۔" وہ بولا۔

"اوئے جاتا ہے یا دوں دو تین تھپڑ! ابھی ایک آواز میں سب آجائیں گے۔" نیلم نے اس کا گریبان

پکڑا۔

وہ دونوں قریبی دکان میں جا کر ڈریسز چیک کرنے لگیں۔

"یار! یہ میرے اوپر اچھا لگے گا نا۔" نیلم نے اس کے آگے لہرایا۔

"ہاں ہاں جاؤ ٹرائی کرلو۔" ندا بولی اس وقت اس کا دل رو رہا تھا اور وہ احمر سے ملنا چاہتی تھی مگر نیلم کی موجودگی میں ملنا ناممکن تھا کیونکہ اس نے تمام کشتیاں جلادی تھیں۔

جیسے ہی نیلم ٹرائی روم میں گئی اس نے جلدی سے ایک نمبر پرچی پر لکھا اور ریلنگ سے ٹکے احمر کو پکڑایا۔

"اس نمبر پر رات بارہ بجے کال کرنا۔" اور یہ کہتی ہوئی تیزی سے پلٹ گئی۔

رات بارہ بجتے ہی احمر کا فون آگیا۔

"ندا کہاں ہو؟ کیا حال ہوگیا تمہارا؟ تم کہاں چلی گئی تھیں؟" احمر سسک رہا تھا۔ "مجھ سے شادی نہ کرتیں مگر اپنے گھر والوں کو سزا کیوں دی؟"

"احمر! میرے ماں باپ، میرا گھر......" دونوں ایک دوسرے سے سوال کررہے تھے۔

ندا نے پوری داستان احمر کو سنادی۔

"تم مجھے ہر حال میں قبول ہو۔" احمر نے بھیگی آواز میں شکوہ کیا۔

"نہیں احمر! اب بہت دیر ہوگئی ہے۔ مجھے معاف کردینا۔"

"ندا! تمہاری امی نے محلّہ چھوڑ دیا ہے، فیاض انکل تو اسی رات دنیا چھوڑ گئے تھے۔ میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر تمہاری امی سے ملتا ہوں۔"

"تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو نا۔" ندا نے پوچھا۔

"ہاں۔" احمر نے جواب دیا۔

"تو پھر میرا ایک مان رکھ لو، صائمہ کو اپنا لو ورنہ گھر سے بھاگنے والی کی بہن کو کون اپنائے گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ بے جان آواز میں بولا۔

اس کے بولتے ہی لائن بے جان ہوگئی۔ اب اس کا موبائل آف آرہا تھا۔

☆

اگلا دن وہ تھا جس کا اس کو شدت سے انتظار تھا، وہ چہرے پر نقاب لگائے اسکول کے سامنے موجود تھی۔ جب تک اسکول خالی نہیں ہوگیا وہ باہر کھڑی انتظار کرتی رہی۔ احمد کی گاڑی کھڑی تھی اس کا مطلب ہے وہ اندر تھا۔ جب اس کو پکا یقین ہوگیا تو وہ انٹرویو کے بہانے آفس میں داخل ہوگئی مگر اندر جانے سے پہلے وہ 15 پر پولیس کو فون کرچکی تھی، یہ اس کا اپنا چنا ہوا راستہ تھا۔

آفس خالی تھا ملحق روم سے آوازیں آرہی تھیں کسی لڑکی کے کھلکھلانے کی۔

"اوہو تو تم نے کوئی اور چڑیا پھانس ہی لی۔" وہ خفیہ لاک کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

"جاؤ لڑکی! کیوں ندا بن رہی ہو۔"

وہ لڑکی اپنے بکھرے کپڑے اور بال سمیٹتی باہر نکل گئی اور ندا نے اپنا کام کردیا تھا۔

باہر آنے والی پولیس موبائل کے سائرن نے آنے کا اعلان کردیا تھا۔

"نیلم اور اس کی باجی کے ساتھ گناہ آلود زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ جیل میں بیٹھ کر سزائے موت کا انتظار کرلوں۔"

اعتماد

جناب مدیر اعلیٰ نئے افق'
السّلام علیکم!
یہ کہانی ہے تو سچی لیکن چونکہ میرا انداز تحریر ذرا مختلف ہے اس لیے میں نے قارئین کی دلچسپی کے لیے اپنی جانب سے کچھ رنگ آمیزی کی کوشش کی ہے تاکہ کہانی کو ذرا طویل کرکے اپنی بات قارئین تک پہنچا سکوں۔ امید ہے یہ تحریر قارئین اور آپ نظر انداز نہیں کرسکیں گے۔

والسّلام
نوشاد عادل
کراچی

چھما دادا چارپائی پر اوندھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے دو چیلے تیل سے اس کی پیٹھ اور ٹانگوں پر مالش کررہے تھے۔ گیٹ کے باہر سفید رنگ کی مرسڈیز کار رکتے دیکھ کر چھما دادا کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھرک اٹھی' وہ اٹھا اور اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔

کار سے پینتیس سال کا ایک طویل القامت آدمی اتر کے چھما کی طرف بڑھنے لگا۔ سنہرے بال اور بھوری آنکھوں والے اس آدمی نے نہ صرف شاندار قسم کا سوٹ پہنا ہوا تھا بلکہ اس کے گلے میں چمچماتے ہیرے کا لاکٹ تھا جبکہ انگلیوں میں بیش قیمت پتھروں والی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ چال ڈھال اور رکھ رکھاؤ سے وہ بہت امیر آدمی معلوم ہوتا تھا۔

''آؤ سلیم سیٹھ۔'' چھما دادا بارعب لہجے میں بولا۔ ''پچھلے ہفتے ہی تو آئے تھے آج پھر تشریف کا ٹوکرا اٹھالائے۔''

سلیم بیگ نے چاروں طرف نظریں گھما کر لمبے چوڑے پلاٹ کا جائزہ لیا اور پھر ٹھنڈی آہ سی بھر کر چھما سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''اس زمین کا مالک میں ہوں چھما دادا میں۔''

''کل تمہاری خوبصورت بیوی روبی بھی آئی تھی وہ بھی خود کو اس زمین کی مالک بتارہی تھی۔'' چھما دادا نے روبی کے ذکر پر آنکھیں نچا کر کہا۔

''ہاں ایک ہی بات ہے۔'' سلیم بیگ تھوڑا خجل سا ہوکر بولا۔ ''روبی اس پلاٹ کی آدھی مالکن ہے' لیکن تم تو کچھ بھی نہیں ہو چھما تم تو زبردستی اس پلاٹ پر قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔''

''مجھ میں دم تھا۔ کرلیا قبضہ۔'' چھما دادا نے کسی کٹ کھنے بھیڑیے کی طرح غرا کر کہا۔ ''تجھ میں دم ہے تو یہ زمین مجھ سے واپس لے کر دکھا۔''

سلیم بیگ نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے گھورا پھر خود پر قابو پاتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔ ''دماغ تو ٹھیک ہے نا تیرا یہ پلاٹ پانچ کروڑ میں خریدا گیا تھا۔''

''معلوم ہے مجھے تمہارے سسر نے یہ زمین پانچ کروڑ میں خریدی تھی' لیکن کب؟ دس بارہ سال پہلے آج اس زمین کی قیمت پچیس کروڑ سے کم نہیں ہے پھر بھی میں تو آج اس زمین کے صرف پندرہ کروڑ ہی مانگ رہا ہوں کل پیسے لے کر آؤ گے تو بیس کروڑ سے ایک پھوٹی کوڑی بھی کم نہیں لوں گا۔''

''ہم اپنی ہی زمین کے لئے بھلا اتنی بڑی رقم کیوں دیں؟ تمہیں یہ زمین خالی کرنا ہی ہوگی' ہم تمہیں زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ دے سکتے ہیں' اگر تم نے حامی نہ بھری تو مجھے پولیس کی مدد لینی ہوگی۔'' سلیم بیگ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''پولیس...... ہا...... ہا......'' چھما نے ایک بھیانک قسم کا قہقہہ لگایا۔ پھر خونخوار لہجے میں بولا ''پولیس کی دھمکی کسی اور کو دینا سلیم بیگ' چھما دادا کو نہیں میری پہنچ بہت اوپر تک ہے ایس پی کا خاص بندہ ہوں میں تم نے پولیس کے پاس جانے کی یا کوئی اور حماقت کی تو میں تیرا کیا حشر کروں گا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ اور تیری حسین بلبل کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے بعد اسے کوٹھے پر بٹھادوں گا' چل پھوٹ یہاں سے دوبارہ کبھی آنا جب جیب میں پندرہ کروڑ ہوں ورنہ مت آنا میرا موڈ چوپٹ ہوگیا تو تیرے حق میں بہت برا ہوگا یہ بات اپنی انارکلی کو بھی بتادینا۔''

سلیم بیگ پلٹا اور بوجھل قدموں سے اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ چھما دادا کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

بتیس سالہ خوبصورت' تیکھے نین نقوش کی مالک' گوری چٹی روبی نے تکیے سے سر اٹھاتے ہوئے ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور بستر سے اترنے لگی۔ برابر میں لیٹے ہوئے فرنچ کٹ داڑھی والے چالیس سالہ اختر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے ڈارلنگ۔ تھوڑی دیر اور رک جاؤ نا۔''

''چھوڑو نا اختر ڈیئر۔'' وہ کسمسا کر بولی۔ ''بس بہت ہوگیا۔ مجھے گھر جانا ہے' شاپنگ کے بہانے آئی تھی۔ مارکیٹ سے تھوڑا بہت سامان لوں گی اور گھر چلی جاؤں گی۔''

اختر نے اس نے گلاب سے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ ''سلیم بیگ سے ناحق ہی ڈررہی ہو تم ڈارلنگ' وہ کون سا دودھ کا دھلا ہوا ہے' اس نے نہ جانے کتنی عورتوں کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے ہیں تم نے جس ملازمہ کو دس ہزار روپے دے کر ڈرا دھمکا کر نوکری سے نکالا تھا وہ اس ملازمہ کو بھی اپنی رکھیل بنائے ہوئے ہے۔''

''مجھے سلیم بیگ کا کوئی ڈر نہیں ہے۔'' روبی ہنکار کر بولی۔ ''بھلے ہی ڈیڈی نے مجھے جائیداد سے بے دخل کرنے کی دھمکی دے کر مجھے اس کی بیوی بنادیا تھا لیکن وہ میرے ڈیڈی کا نوکر تھا اور میرے لئے تو آج بھی نوکر کی ہی حیثیت رکھتا ہے۔ تبھی تو آج تک میں نے اس کے ساتھ سہاگ رات تک نہیں منائی' ڈیڈی کی وصیت کے مطابق میں اور سلیم بیگ دونوں برابر کے حصے دار ہیں' ہم دونوں میں سے کوئی طلاق لے گا تو اسے اپنے حصے کی جائیداد بھی کھونا پڑے گی' ایسی صورت میں جائیداد کا وہ حصہ ڈیڈی کے بنائے ہوئے ٹرسٹ کو چلا جائے گا۔ جس کے ٹرسٹی وکیل انکل ہیں۔ وصیت میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی کا بھی قتل ہوتا ہے تو ساری جائیداد ٹرسٹ کو چلی جائے گی۔ تبھی تو میں سلیم بیگ سے چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ اسی کے ساتھ ڈیڈی نے وکیل انکل کو ہم دونوں پر نظر رکھنے کی ہدایت دی ہوئی ہے اور یہ حق بھی دیا ہے کہ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کا رشتہ نہ رکھ پائیں تو وہ ہمیں جائیداد سے بے دخل کرکے ٹرسٹ کے حوالے کر

سکتے ہیں۔ مجھے سلیم بیگ کا نہیں بلکہ وکیل انکل کا خوف رہتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کتنے گھاگ اور چالاک ہیں وہ کسی پولیس والے کی طرح ہی مجھ پر اور سلیم بیگ پر نظر رکھتا ہے ایک بار انہیں میرے خلاف ثبوت مل گیا تو وہ مجھے جائیداد سے بے دخل کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے تبھی تو چوروں کی طرح پوری طرح دیکھ بھال کے ہوشیاری سے تم سے ملنے آتی ہوں۔"

اختر بھی بستر سے اتر کر اپنی حالت درست کرتا ہوا اداس لہجے میں بولا۔ "تقدیر میں ہماری شادی ہونا نہیں لکھا تھا ڈارلنگ کیونکہ تمہارے ڈیڈی کو میں پسند نہیں تھا۔ انہوں نے وصیت کو ہتھیار کے روپ میں استعمال کیا اور تمہیں اپنے نوکر کی بیوی بنا دیا میری محبت کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ میں نے آج تک شادی نہیں کی اور آج بھی پاگلوں کی طرح تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"میں بھی تو تم سے ملنے کے لئے بے قرار رہتی ہوں ڈیئر۔ موقع ملتے ہی تم سے ملنے چلی آتی ہوں۔"

اختر نے روبی کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "لیکن سلیم بیگ نے تو تمہارے پچھلے نوکر کو اس الزام میں نوکری سے نکالا تھا کہ تم نے اس نوکر کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ مجھے کلب میں ملا تھا' بول رہا تھا کہ تم نے نئے نوکر کے ساتھ بھی۔"

روبی پھٹ پڑی "وہ کمینہ بکواس کرتا ہے۔" غصے سے روبی کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ "میں اسے ہاتھ بھی لگانے نہیں دیتی ہوں اس لئے وہ مجھے بدنام کرنے کے لئے بکواس کرتا رہتا ہے وہ ہمارے تعلق کے بارے میں جانتا ہے' وہ یہ چاہتا ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرو اور ہر تعلق توڑ دو تمہیں مجھ پر بھروسہ رکھنا چاہئے میں تمہاری صرف تمہاری ہوں ڈیئر او کے اب چلتی ہوں۔ کہیں وکیل انکل میری تلاش میں نہ نکل پڑے۔ اسے ہم دونوں کے بارے میں شک ہے لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چپ ہے اگر ان کے ہاتھ ثبوت لگ گئے تو جائیداد تو گئی ہی سمجھو آدھی جائیداد پر تو وہ ناگ سلیم بیگ قبضہ جمائے بیٹھا ہے' خدا جانے وہ کب مرے گا اور کب اس سے ہماری جان چھوٹے گی۔ کم بخت کو کینسر یا ایڈز کی بیماری بھی تو نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر روبی اپنا پرس اٹھا کر اختر کی طرف ایک قاتلانہ مسکراہٹ اچھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی اور اختر ہنستے ہوئے دوبارہ بستر کے کنارے بیٹھ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

کوٹھی میں داخل ہوتے ہی روبی کا سامنا سلیم بیگ سے ہوتا ہے۔ سلیم بیگ کو گھورتا ہوا دیکھ کر سٹپٹا کر برا سا منہ بنا کر روکھے لہجے میں بولی۔ "مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟"۔

"پوچھ سکتا ہوں کہ کہاں سے آ رہی ہو؟"۔

"تم سے مطلب؟"۔ وہ تنک کر بولی۔ "اپنی حد میں رہا کرو مسٹر۔"

"شوہر ہوں تمہارا۔"

"صرف دنیا کی نظروں میں میرے لئے تو آج بھی میری فیکٹری کے سپروائزر ہو۔"

"اختر کے پاس ہی گئی ہو گی منہ کالا کرانے نوکر کے روپ میں ایک سانڈ تو تم نے پال ہی رکھا ہے کیا اس سے تمہاری ہوس پوری نہیں ہوتی ؟"۔

"شٹ اپ۔"

غصے کے مارے روبی کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چلا

تھا اور جسم کے ساتھ ساتھ اس کے رسیلے ہونٹ بھی تھرتھرانے لگے وہ آنکھوں سے شعلے برساتی ہوئی چلائی۔ "تم کون سا کم ہو؟ نہ جانے کتنی کتیاؤں کے ساتھ منہ کالا کیا ہے تم نے پچاس سال کی نوکرانی اور سات بچوں کی ماں دھوبن تک کو نہیں چھوڑا تم نے تم تو شاید کسی سچ مچ کی کتیا کو بھی نہ بخشو اور پرائیویٹ کوٹھوں پر تو تمہارا پرانا آنا جانا ہے۔"

"حمام میں ہم دونوں ہی ننگے ہیں روبی۔" سلیم بیگ کچھ دھیمے لہجے میں بولا۔ "تم نے آج تک مجھے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا تو میں کیا کرتا؟ کیا سرجری کروا کر ہیجڑا بن جاتا؟ میں جو بھی کرتا ہوں گھر کی چار دیواری میں رہ کر کرتا ہوں لیکن تم تو گھر سے باہر کارنامے دکھا رہی ہو میری اور اپنی نہیں تو کم از کم اپنے ڈیڈی کی عزت کا تو خیال کرو۔"

"ڈیڈی نے میرا کون سا خیال رکھا ہاں؟" روبی نفرت بھرے لہجے میں چلائی اختر کے ساتھ میری شادی کر دیتے تو کیا بگڑ جاتا ان کا؟ اوپر سے ایک ملازم کو میرے پلے باندھ دیا۔"

"میں تمہارے ڈیڈی کے دوست کا بیٹا ہوں۔ جبکہ اختر ایک نمبر کا عیاش اور آوارہ ہے۔ تمہارے ڈیڈی اختر کی تمام کارگزاریوں سے واقف تھے۔ تبھی تو۔"

"اختر کے خلاف تم نے ہی ڈیڈی کے کان بھرے تھے۔ تمہاری نظر میری دولت اور میرے جسم پر پہلے سے ہی تھی۔"

اس وقت ایک پچیس سال کا گورا چٹا' لمبا پہاڑی قسم کا نوجوان کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا جسے سلیم بیگ نے نفرت اور حقارت بھری نظروں سے گھورا۔

"وہ...... میم صاحب...... وکیل صاحب آئے ہیں۔"

روبی کے ساتھ سلیم بیگ کا انداز بھی بدل گیا۔ دونوں ہوشیار ہو گئے اور تھوڑا سہمے ہوئے بھی تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆

وہ پچپن سالہ شخص ایک عالیشان کمرے کے شاندار صوفے پر براجمان تھا۔ لمبے قد اور چھریرے بدن کے اس آدمی کے بال دودھ کی طرح سفید تھے۔

گلابی رنگت لئے لمبوترے چہرے اور پتلے پتلے سوکھے ہونٹوں والا شہاب الدین فاروقی بلوری رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے چالاک اور گھاگ نظر آ رہا تھا۔

سلیم بیگ اور روبی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے رویئے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ ان میں کوئی ان بن ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔

"سلام وکیل صاحب۔" سلیم بیگ نے سلام میں پہل کی۔

"سلام انکل۔"

"وعلیکم السلام۔" شہاب الدین کا لہجہ انتہائی سرد تھا۔ "کیسے ہو تم دونوں؟ آپس میں جھگڑے تو نہیں نا؟"

"نن۔ نہیں انکل۔" روبی جلدی سے بولی۔ "اب ہمارے درمیان صلح ہو چکی ہے۔ ہاں کبھی کبھی تھوڑی بہت تکرار بھی ہو جاتی ہے تو جلدی صلح بھی ہو جاتی ہے۔"

"لیکن ہم تو تبھی مانیں گے جب گھر میں نیا مہمان آئے گا۔ تم دونوں کی شادی کو دس سال ہو گئے ہیں۔ تم دونوں میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے۔ پھر ممی پپا کب بن رہے ہو؟"

روبی اور سلیم بیگ نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ تو قدرت کے ہاتھوں میں ہے وکیل انکل۔" سلیم بیگ نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں داماد صاحب' نہیں۔" شہاب الدین پتلے ہونٹوں پر تیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولے۔ "یہ تم دونوں کے ہاتھ میں ہے۔ سیٹھ صاحب نے تم دونوں کی شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ تم الگ تھلگ رہو اور نسل آگے نہ بڑھاؤ' بہتر ہوگا کہ تم دونوں وصیت کو ایک بار پھر غور سے پڑھو۔ اس میں صاف لکھا ہے کہ تم دونوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کے طور پر قبول نہیں کیا تو یہ ساری جائیداد ٹرسٹ کے حوالے ہو جائے گی۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ آپ دونوں پانچ سال کے اندر اندر ماں باپ بن جائیں گے۔ نہیں بنے تو جو ذمہ دار ہوگا اسے بے دخل کر دیا جائے گا۔ لیکن ہم نے تمہاری درخواست پر ترس کھا کے ایک سال' دو سال کی چھوٹ دیتے ہوئے دس سال گزار دیئے۔ تم ایک بار حاملہ بھی ہوئی تھیں روبی بیٹی۔ تم دونوں نے اس بات کو چھپا کر رکھا۔ لیکن ہمیں معلوم ہو ہی گیا کہ تمہارا وہ حمل سلیم بیگ نہیں اختر کا نطفہ تھا۔ اور داماد جی نے تمہیں دھمکی دی تھی کہ وہ ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر ثابت کر دے گا کہ وہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ جائیداد ہاتھ سے جانے کے ڈر سے تم نے ابارشن کروا لیا تھا۔ آج ہم تم دونوں کو آخری وارننگ دے رہے ہیں کہ سال بھر میں ماں نہیں بنیں تو جائیداد سے بے دخل ہونا پڑے گا۔"

روبی کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ جلدی سے بولی "نہیں انکل۔ میں ماں بنوں گی۔ لیکن کیا یہ میرا ساتھ دیں گے؟"

"کیوں نہیں دوں گا بھلا۔" سلیم بیگ فوراً بولا۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تم شادی سے پہلے ہی اپنا کنوار پن کھو چکی ہو۔ اور اب تک اختر سے تمہارے تعلقات ہیں۔ لیکن سسر جی کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے میں تمہیں دل سے قبول کر لوں گا۔"

اسی وقت گھر کی ساٹھ سالہ پرانی نوکرانی سلمیٰ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آئی۔

روبی نے فوراً چائے کا کپ بنا کر شہاب الدین فاروقی اور سلیم بیگ کو دینے کے بعد اپنے لئے بھی ایک کپ بنا کر چسکی لینے لگی۔

"ہم تم دونوں کے دشمن نہیں ہیں۔" شہاب الدین چاندی کے چمچ سے گاجر کا حلوہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ بزرگ ہونے کے ناتے ہم چاہتے ہیں کہ تم دونوں پچھلی تمام کڑواہٹ کو بھول کر میل ملاپ کر لو۔ ایک دوسرے کو قبول کر لو۔ تم دونوں طلاق نہیں لے سکتے۔ تمہیں ساری زندگی ایک ساتھ رہنا ہے۔ نفرت بھرے ماحول میں زندگی اچھی نہیں گزرتی۔ جب بڑھاپا آئے گا تو باہر کا کوئی کام نہیں آئے گا۔ دونوں کو ہی ایک دوسرے کے کام آنا پڑے گا۔ یونہی رہے تو بچہ نہیں ہوگا اور تمہاری نسل یہیں ختم ہو جائے گی۔ تمہارا کوئی نام لیوا۔ کوئی مغفرت کرنے والا نہیں ہوگا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔"

دونوں نے ایک ساتھ ہاں میں سر ہلایا۔

شہاب الدین مزید بولا۔ "سال بھر میں ہمیں ننھا منا بچہ چاہئے۔ ورنہ دوسری صورت میں یہ ساری جائیداد مجھے ٹرسٹ میں جمع کرنی پڑے گی۔"

سلیم بیگ اور روبی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کی کسی بات سے انکار کرتے۔

آخر سلیم بیگ نے ہمت کرتے ہوئے موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں چھما دادا سے مل کر آ رہا ہوں وکیل صاحب۔ لیکن وہ کم بخت پندرہ کروڑ کی ڈیمانڈ کر رہا ہے۔"

"پندرہ کروڑ...... ہونہہ۔" روبی تنک کر بولی۔ "وہ کمینہ ہم سے ہماری ہی زمین کی اتنی بڑی قیمت مانگ رہا ہے۔ انکل آپ اس پر کیس کیوں نہیں کرتے؟"

شہاب الدین فاروقی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور افسوس میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "ہم کیس تو کر دیں بیٹی۔ لیکن فائدہ نظر نہیں آتا۔ ایسے کیس سالوں تک چلتے رہتے ہیں۔ پچھوے کی چال سے۔ چھما دادا اس کیس سے غصے میں آ کر تم لوگوں کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ پولیس افسر کو قتل کرنے کے بعد لوگوں کے دلوں میں اس کی ایک دھاک بیٹھ گئی ہے۔ سرعام مارا تھا اس نے اس انسپکٹر کو لیکن اس کے ڈر سے کوئی گواہی دینے کو تیار نہیں ہوا اور وہ شک کا فائدہ اٹھا کر بری ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم ننگا آدمی ہے اور وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"تو کیا اتنی قیمتی زمین کو ہم یونہی ہاتھ سے نکل جانے دیں۔" روبی کے لہجے میں غصہ تھا۔ "ڈیڈی نے خون پسینے کی کمائی سے وہ زمین خریدی تھی' جو آج بیس کروڑ سے بھی زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کوئی تو راستہ ہوگا۔ انکل کچھ تو کیجئے۔ یہ کمینہ چھما تو مفت میں ہی اتنی قیمتی زمین کا مالک بن بیٹھا ہے۔"

شہاب الدین فاروقی جھجکتے' ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "ایک راستہ ہے۔ لیکن؟"

"لیکن کیا؟" سلیم بیگ نے پوچھا۔ "بتائیں نا وکیل صاحب۔"

"تم دونوں نے منیش کا نام تو سنا ہی ہوگا؟"

"منیش...... کون وہ گینگسٹر منیش تو نہیں؟" روبی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی۔ روبی بیٹی۔ ہیجڑا ہوتے ہوئے بھی وہ سنکی اور خطرناک ترین انسان ہے۔ عام آدمی تو کیا۔ پولیس بھی اس کے نام سے تھراتی ہے۔ منیش کے سامنے چھما دادا کی تو کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ تم کہو تو میں منیش سے بات کر کے دیکھوں؟"

"وہ زمین خالی کرانے کی کیا قیمت لے گا؟" سلیم بیگ نے پھر پوچھا۔

"یہ تو اس سے بات کر کے ہی معلوم ہوگا داماد بابو۔ تم دونوں کیا کہتے ہو۔"

دونوں نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے۔" شہاب الدین اٹھ کھڑا ہوا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر بولا۔ "میں منیش سے مل لیتا ہوں۔"

☆☆☆☆☆☆☆

ایس ایچ او کی غیر موجودگی میں سب انسپکٹر ظہیر ملک کے ساتھ کچھ سپاہی پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے چائے سموسے اڑاتے ہوئے ادھر ادھر کی گپیں ہانک رہے تھے۔ اچانک ہی شور شرابا ہونے لگا۔ تقریباً ایک درجن ہیجڑے ڈھولک اور

تالی بجاتے ہوئے اندر گھس آئے۔

''اوئے...... یہ کیا ہے؟۔'' ظہیر ملک غرا کر بولا۔''یہ کہاں منہ اٹھائے اندر چلے آرہے ہو۔ چلو باہر نکلو۔ ورنہ ہڈی پسلی ایک کرکے لاک اپ میں بند کردوں گا۔''

''اوئے پولیس کے بچے' بھیجا ٹھنڈا رکھ۔ نہیں تو ایک دوں گی۔ ہاں۔''

ظہیر ملک دھمکی دینے والے کی طرف مڑا۔ وہ ایک عجیب وغریب آئٹم تھا۔ چالیس سال کا گورا چٹا' لیکن چھوٹے قد اور چھریرے جسم کا مالک۔ رنگ برنگی شرٹ نیلی جینز میں ٹھنسی ہوئی تھی اور کمر پر سنہرے بکل والی اٹالین بیلٹ کسی ہوئی تھی۔ پیروں میں چمڑے کے لال چپل' کندھے پر بکھرے ہوئے ریشمی گولڈن بال۔ گلے میں موتیوں کی مالا۔ بائیں کلائی میں سنہری چین والی گھڑی اور دائیں کلائی میں سونے کا بریسلیٹ چمک رہا تھا۔ جبکہ ہاتھوں کی آٹھوں انگلیوں میں قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں چمچمارہی تھیں۔ ناخنوں پر نیل پالش' آنکھوں میں سرمہ' چہرے پر گہرا میک اپ اور ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک تھوپی ہوئی تھی۔

''گلابو نام ہے میرا۔'' وہ کرک آواز میں تالی پیٹتے ہوئے بولا۔''جانتا ہے نا مجھ کو۔ گینگسٹر ہوں میں۔ یا شاید نیا نیا آیا ہے جو مجھے جانتا نہیں ہے رے۔''

یہ سن کر ظہیر ملک کے پسینے چھوٹنے لگے۔ کیونکہ اسٹاف کے لوگوں سے وہ گلابو کے بارے میں کافی کچھ سن چکا تھا۔

گلابو لڑکیوں کی طرح مٹکتا ہوا ظہیر ملک کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔''میرے چیلے نے راہ چلتی لونڈیا کو تھوڑا سا چھیڑ دیا تو تم نے اس کو دھنک کر رکھ دیا۔ جبکہ اس نے تمہیں بتایا بھی تھا کہ وہ میرا چیلا ہے' بیمہ کرا کے خودکشی کے ارادے سے یہاں آئے ہو کیا۔ یہ دیکھ۔''

اس نے ہپ پاکٹ سے استرا نکال کر کھولا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا کر کہا۔''اس سے کئی گلے کاٹ چکی ہوں رے۔ اور کئی کے ناک اور کان بھی کاٹ چکی ہوں۔ بول تیرا کیا کاٹوں رے؟۔''

سب انسپکٹر ظہیر ملک نے ادھر ادھر نظریں گھما کر اسٹاف کے لوگوں کی طرف دیکھا تو اسے سب ہی گلابو سے خوفزدہ نظر آئے۔ ایسا قطعی نہیں لگتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر کوئی اس کی مدد کو آگے آئے گا۔ اچانک اس کے ذہن میں آیا کہ اگر وہ ہمت کرکے گلابو کو پکڑ لے تو ہیرو بن جائے گا۔ شاباشی کے ساتھ ترقی ملنے کا بھی امکان تھا۔ اس نے فوراً ہولسٹر سے ریوالور نکال کر تان لیا۔

''استرا پھینک دو گلابو۔ میں تمہارے جیسے کتنے ہی سڑک چھاپ غنڈوں کو تگنی کا ناچ نچا چکا ہوں۔ آہ ہ......ہ۔''

بجلی کی سی پھرتی سے گلابوں نے اس کی کلائی پر استرے کا وار کرکے ریوالور چھین لیا۔ کلائی سے بہنے والے خون کو روکنے کے لئے زخم کو دبوچ کر ظہیر ملک دوہرا ہوکر کراہنے لگا۔

ریوالور ایک سپاہی کو تھما کر گلابو نے ظہیر ملک کی گردن دبوچ لی اور گردن پر استرا رکھ کر پھنکارا۔''بول۔ کچھاک سے تیری منڈی اڑا دوں کیا؟''

''نن' نہیں' نہیں۔ مجھے معاف کردو۔'' وہ تھر تھر کانپتے ہوئے گڑگڑایا۔''غغ۔ غلطی ہوگئی۔

آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔ جو آپ بولیں گے وہیں کروں گا' یا اپنا ٹرانسفر کروالوں گا۔''

''میں ایسے ہی معاف نہیں کرتی۔ تیرا تو بینڈ بجا کر ہی جاؤں گی۔ اری او ریما۔ ڈھولک سنبھالنا ذرا۔ اوئے پینو' منجیرے نکال۔ آج تو جم کر ناچوں میں۔''

دو ہیجڑے ڈھولک اور منجیرے بجانے لگے۔ تیسرے نے بیگ سے گھنگھرو نکال کر گلابو کے پیروں میں باندھ دیئے۔ دو ہیجڑوں نے ظہیر ملک کو پکڑ لیا اور باقی اسے لاتوں اور گھونسوں سے پیٹنے لگے۔

''سج رہی گوری تیری اماں سنہری گوٹے میں۔'' پھٹے بھانس کی سی آواز میں گاتے ہوئے گلابو کسی ماہر رقاصہ کی طرح ناچنے لگا۔ کسی سپاہی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے افسر کو بچالے۔

دس منٹ بعد جب گلابو کے قدم رکے تو ہیجڑوں نے بھی ظہیر ملک کو چھوڑ دیا۔ پھٹے حال' بے حال ظہیر ملک بے دم سا ہوکر زمین پر گر کر اکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ کراہنے لگا۔

''اب میں جاتی ہوں۔'' گلابو نے جیب سے پانچ پانچ سو کے تین نوٹ نکال کر ایک ہیجڑے کے سر پر وارنے کے انداز میں گھما کر ظہیر ملک کی گود میں ڈال دیئے اور زور زور سے تالی پیٹتے ہوئے کہا۔

''آج ہی ٹرانسفر کرالینا۔ اور دوبارہ میرے علاقے میں نظر مت آنا۔ ورنہ اس سے بھی برا حال کردوں گی۔ ہاں۔ چلو ری اپنا کام ہوگیا۔ اے حوالدار۔ تیرے داروغہ کو روپے دے دیئے ہیں۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاکر علاج کرالینا اور اسے میرے بارے میں سمجھا دینا۔'' یہ کہہ کر گلابو اپنے چیلوں کے ساتھ باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

''تم تو ٹھہرے پردیسی۔ ساتھ کیا نبھاؤ گے۔ صبح پہلی گاڑی سے۔ گھر کو لوٹ جاؤ گے۔'' گلابو ناچتے ہوئے گا رہا تھا۔ کچھ ہیجڑے سنگیت بجا رہے تھے۔

اس ہال میں درجن کے قریب نوجوان ہتھیار بند بھی تھے جو قد کاٹھی اور چہرے سے ہی خطرناک اور چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔

وکیل شہاب الدین ایک ہیجڑے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

''سلام گلابو صاحب...... مجھے ایڈووکیٹ شہاب الدین فاروقی کہتے ہیں۔''

گلابو نے ناچ گانا ختم کیا اور سازندوں کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر باہر چلے گئے۔

گلابو ایک جھولے میں بیٹھ گیا اور شہاب الدین کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے پھٹے بانس سی آواز میں بولا۔''فرمایئے وکیل بابو۔ میں آپ کے لئے کیا کرسکتی ہوں؟۔''

ایک ہیجڑے کی جانب سے پیش کیا جانے والا پانی پی کر شہاب الدین نے کہا۔''گلابو صاحب۔ میرے کلائنٹ سلیم بیگ اور روبی کا ایک دو ہزار گز کا پلاٹ انڈسٹریل ایریا میں ہے۔ جسے دس سال پہلے روبی کے والد نے پانچ کروڑ میں خریدا تھا۔ لیکن آج اس پر چھما دادا نے قبضہ جما رکھا ہے۔''

''چھما دادا۔'' گلابو آنکھیں سکیڑ کر بولا۔

''یہ وہی چھما دادا ہے گرو جی جس نے پچھلے سال ہی انسپکٹر خان کو قتل کردیا تھا۔'' جھولے کے پیچھے کھڑے ایک ساتھی نے کہا۔''اس علاقے

میں اس کی کافی چلتی ہے۔ آس پاس بہت رعب ہے اس کا۔"

"آئے ہائے۔ ناس پیٹے۔" گلابو زور زور سے تالی پیٹتے ہوئے چلایا۔ "اس چوہے کی تعریف تو ایسے کر رہا ہے جیسے وہ تیری ماں کا خصم ہو۔ میرا سامنا ہونے پر موتنے نہ لگے تو نام بدل دینا۔ گلابو کے سامنے اچھے اچھے پانی بھرتے ہیں۔ ہاں۔ آپ بولیں وکیل بابو میں سن رہی ہوں۔"

"چھما دادا زمین خالی نہیں کر رہا ہے۔ کم بخت پندرہ کروڑ مانگتا ہے۔ پولیس یا قانون کی مدد مانگنے پر جان سے مارنے کی دھمکی دیتا ہے۔ روبی میرے مرحوم دوست کی بیٹی ہے۔ مجھے اس کی اور اس کے شوہر کی فکر لاحق ہے۔ ان کی طرف سے ہاں ہونے پر ہی میں آپ کی خدمت میں آیا ہوں۔ اس امید پر کہ صرف آپ ہی وہ زمین چھما دادا کے قبضے سے چھڑا کر واپس دلوا سکتے ہیں۔"

"دس کروڑ۔"

"د...... دس...... کروڑ۔" شہاب الدین فاروقی جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے بولا۔ "زمین چھڑانے کے اتنے لیں گے آپ؟"

"بیٹھ جاؤ وکیل بابو۔ میں یہ رقم تمہاری پارٹی کو دے رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"وہ زمین چاہے سو روپے کی ہو یا پچیس کروڑ کی۔ تمہاری پارٹی کے ہاتھ سے گئی۔ لوگ تو بھاگتے چور کی لنگوٹی پر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ میں تو دس کروڑ دے رہی ہوں تمہاری پارٹی کو۔ زمین میرے نام کر دو اور ہاتھوں ہاتھ دس کروڑ لے کر نجات پا لو۔ رہا چھما دادا۔ تو اس سے میں نمٹ لوں گی۔"

شہاب الدین سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچ رہے ہو وکیل بابو؟"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ وہ زمین چھما دادا سے چھڑا لیں اور اور اس کے بدلے اپنی قیمت لے لیں؟"

"ایسا کرنے سے کیا ہوگا؟" گلابو زور زور سے تالی پیٹتے ہوئے بولا۔ "میں پچاس لاکھ میں بھی یہ کام کر دوں گی۔ لیکن کراچی میں کتنے گینگ ہیں، پتہ ہے تمہیں۔ ہر علاقے کی اپنی مافیا ہے۔ ایک چھوڑے گا تو کوئی دوسرا قبضہ کر لے گا پھر میرے پاس آؤ گے۔ کیوں خواہ مخواہ کی ٹینشن پالتے ہو۔ دس کروڑ لے کر اپنی جان کیوں نہیں چھڑا لیتے میاں؟"

"مم۔ مجھے پارٹی سے پوچھنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ صلاح مشورہ کر کے مجھے بتا دینا۔ میں اٹیچی میں دس کروڑ سجا کر رکھوں گی کچھ ٹھنڈا وٹھنڈا چائے کافی لو گے کیا؟"

"نہیں شکریہ۔ میں آج شام کو ہی آپ سے دوبارہ ملتا ہوں۔"

"ہاں ملنا۔ میں انتظار کروں گی۔"

☆☆☆☆☆☆☆

نوکرانی سلمٰی تینوں کے سامنے چائے رکھ کر چلی گئی۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

شہاب الدین فاروقی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "یوں چپ چاپ بیٹھنے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ تم دونوں کو کوئی فیصلہ تو کرنا ہی ہوگا۔"

"مجھے تو کچھ سوجھ نہیں رہا۔" سلیم بیگ اپنی ہتھیلی ملتا ہوا بولا۔ "ہمیں پچیس کروڑ کی زمین دس کروڑ میں بیچ دیں۔ آپ کا کیا مشورہ ہے وکیل صاحب۔"

"تم دونوں بچے تو نہیں ہو۔ خود فیصلہ کر سکتے ہو۔ لیکن یہ طے ہے کہ گلابو پیسے لے کر چھما کو نہیں ہٹائے گا اور نہ ہی رقم بڑھائے گا۔ وہ ایک بار جو کہتا ہے اسی پر اڑا رہتا ہے۔ تھوڑا سنکی بھی ہے۔ ویسے میرا مشورہ یہ ہے کہ تمہیں گلابو کی آفر قبول کر لینی چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین بھی جائے اور پیسہ بھی۔ گلابو دس کروڑ دے رہا ہے۔ بہت بڑی رقم ہے یہ بھی۔ اور ٹینشن سے بھی نجات مل جائے گی۔" یہ کہتے ہوئے شہاب الدین نے ایک سگریٹ نکال کر ایک سلیم بیگ کو دی اور دوسری اپنے ہونٹوں سے لگا کر لائٹر سے پہلے سلیم بیگ اور پھر اپنی سگریٹ سلگائی۔

روبی نے سگریٹ کی طلب کو مارتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال سے انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دس کروڑ مل رہے ہیں تو وہ ہی سہی۔ چھما نے ہمیں بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ پھر وہ گلابو کا سردرد ہوگا کہ وہ چھما سے زمین کیسے خالی کرواتا ہے۔ بھگا کر یا مروا کر۔ کم بخت کو اچھا سبق مل جائے گا۔"

"آپ کیا کہتے ہیں داماد بابو؟"

"ٹھیک ہے۔ روبی راضی ہے تو میں بھی تیار ہوں۔ لیکن گلابو کوئی دھوکے بازی تو نہیں کرے گا نا؟" سلیم بیگ نے اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں داماد بابو۔ ایسے لوگ بزنس میں ہیرا پھیری کر کے اپنی ساکھ خراب نہیں کرتے۔ وہ بے ایمانی کا کام بھی نہایت ایمانداری سے کرتے ہیں۔ گلابو کی بات پتھر پہ لکیر ہوتی ہے۔ وہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے۔ زبان کا بہت پکا ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ ہماری طرف سے ڈن ہے۔ آپ آج ہی گلابو سے مل کر سودا پکا کر لیں۔ ہم کل کورٹ جا کر زمین گلابو کے نام کر دیں گے اور دس کروڑ لے کر آ جائیں گے۔"

☆☆☆☆☆☆☆

سفید مرسڈیز میں کورٹ پہنچ کر سلیم بیگ، روبی اور شہاب الدین فاروقی، گلابو کا انتظار کرنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد ایک پراڈو آ کر رکی اور اس میں سے ایک لمبے چوڑے خوبصورت نوجوان کے ساتھ سنہرے رنگ کی شرٹ اور کالی پینٹ میں گلابو باہر نکلا۔

کمر کو لچکاتے ہوئے وہ نوجوان کے ساتھ قریب آیا اور کندھے پر لٹکے پرس سے چھوٹا آئینہ نکال کر چہرہ دیکھنے لگا۔

"سلام گلابو صاحب۔" شہاب الدین نے پہل کی اور تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ "یہ سلیم بیگ اور یہ ان کی بیوی روبی۔"

"ہیلو۔ ہائے۔" گلابو نے اسٹائل کے ساتھ ہوا میں ہاتھ لہرا کر نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کاشف ہے۔ میرا چھوٹا بھائی۔ یہ میری طرح چھکا نہیں ہے۔ ثناٹن مرد ہے یہ۔ اس کے لئے جاپانی گڑیا جیسی لڑکی تلاش کروں گی اور دھوم دھام سے اس کی شادی کروں گی۔ ایسی شادی کروں گی کہ پورا کراچی جگمگا اٹھے گا۔"

کاشف نے مسکرا کر سب سے ہاتھ ملایا اور خاص طور سے روبی سے ہاتھ ملاتے وقت اس کی ہتھیلی کی گرفت سخت ہو گئی اور وہ بھوکی نظروں سے

اس کے بلاؤز میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہرے رنگ کی بنارسی ساڑھی میں روبی بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔

پھر شہاب الدین کی نگرانی میں سلیم بیگ اور روبی نے زمین گلابو کے چھوٹے بھائی کاشف کے نام ٹرانسفر کی اور گلابو سے بریف کیس لے لیا۔ اس میں پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ پورے دس کروڑ روپے۔

گلابو کی پراڈو میں ہی شہاب الدین نے رقم گن کر تسلی کرلی۔ جبکہ اس دوران کاشف مسلسل روبی کو گھورتا رہا۔ روبی نے بھی کئی مرتبہ چور نظروں سے کاشف کو گھورا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

گھر پہنچنے پر شہاب الدین نے پانچ پانچ کروڑ کے دو بنڈل بنادیئے اور کہا۔ ''تم دونوں اس زمین کے برابر کے پارٹنر تھے۔ اس لئے تم دونوں کے حصے میں آدھی آدھی رقم آئے گی۔ تم لوگ اس رقم کو جیسے چاہو خرچ کر سکتے ہو ویسے تم دونوں میاں بیوی ہو۔ اگر رقم اکٹھی رہے تو اچھا ہے۔''

''یہ رقم اکٹھی ہی رہے گی وکیل صاحب۔'' سلیم بیگ نے اعتماد سے کہا۔ ''آپ کی باتوں سے ہم بہت متاثر ہوئے ہیں۔ میں نے اور روبی نے میاں بیوی کی طرح رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے کیوں روبی؟''

''ہا...... ہاں' کیوں نہیں ہم میاں بیوی کے رشتے کو نبھائیں گے اور کسی تیسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ اب آپ ہمیں مشورہ دیں کہ اس رقم کا کیا کریں' فیکٹری میں لگادیں؟''

''میرے خیال سے تو نہیں فیکٹری ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔ مقابلے کا دور ہے۔ کچھ بھی کرنے سے کھلونوں کی سیل تو بڑھے گی نہیں۔ ہر ٹوائے فیکٹری نے اپنے اپنے کسٹمر سیٹ کئے ہوئے ہیں۔ فیکٹری کو تو یونہی چلنے دو۔''

''تو رقم شیئر مارکیٹ میں ......؟'' سلیم بیگ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''نہیں داماد جی۔ شیئر مارکیٹ بھی اس وقت کچھ خاص نہیں جارہی۔''

''ٹھیک ہے تو فی الحال ہم اس رقم کو بینک میں ڈال دیتے ہیں۔''

''بینک میں رکھنا بھی زیادہ فائدے مند نہیں ہے۔ کیوں نہ تم دونوں اس رقم سے سونا یا ہیرے خرید لو۔ سونے کی اہمیت اپنی جگہ ویسے آج کل ہیروں کی ڈیمانڈ بھی بڑھتی جارہی ہے۔ سونے کے مقابلے میں آج کل ڈائمنڈ سیٹ پہننے کا کریز بڑھ رہا ہے۔ بینک میں ڈپازٹ کروگے تو رقم چھ سال میں دوگنی ہوگی۔ لیکن ہیروں کی قیمت تو سال دو سال میں ہی ڈبل ہوسکتی ہے۔ تین گنا بھی ہوجائے تو کوئی تعجب نہیں۔''

''تو پھر ہم ہیرے ہی خرید لیتے ہیں۔ تم کیا کہتی ہو روبی؟''

''ہاں۔ جیسا تم اور انکل مناسب سمجھو۔''

شہاب الدین نے سگریٹ سلگائی اور ڈبی کے ساتھ لائٹر سلیم بیگ کی طرف بڑھادیا۔

''میں عالیانی جیولرز والوں کو جانتا ہوں۔ میرے کہنے پر وہ رسید تو دے گا دس کروڑ کی لیکن ڈائمنڈ دے گا پندرہ کروڑ قیمت کے۔ یعنی تم جب بیچو گے تو اس کی قیمت پندرہ کروڑ سے زیادہ ہی آئے گی۔''

''کیا ایسا ممکن ہے انکل؟''

''کیوں نہیں......'' شہاب الدین ایک کش لیتے ہوئے بولا۔ ''عالیانی جیولرز چوری کے ڈائمنڈز بھی خرید لیتے ہیں۔ اور جان پہچان کے لوگوں کو کم دام میں زیادہ قیمت کے ہیرے دے کر اپنا پیسہ وہائٹ کر لیتے ہیں۔ جیولر بھی خوش اور خریدار کا بھی فائدہ۔ دس کروڑ میں تمہیں پندرہ کروڑ کے ہیرے مل جائیں گے۔''

''تو چلیں پھر ابھی ہیرے خرید لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم چائے پی کر سیدھے عالیانی جیولرز کی طرف چلتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆☆☆

عالیانی جیولرز نے دس کروڑ کی رسید پر پندرہ کروڑ کے ہیرے ان کے حوالے کئے۔ مٹر کے دانے کے برابر پورے سو ہیرے۔ اپنی تسلی کے لئے وہ ہیرے دوسرے جیولر کو دکھائے گئے تو اس نے پندرہ کروڑ قیمت بتائی' جس پر سلیم بیگ اور روبی دونوں بہت خوش ہوئے۔

واپسی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے سلیم بیگ بولا۔ ''وکیل صاحب۔ کیا ہیرے گھر میں رکھنا مناسب ہوگا؟''

''میرے خیال سے تو نہیں' چوری ہونے کا اندیشہ لگا رہے گا۔''

''تو پھر ہم انہیں بینک کے لاکر میں رکھ دیتے ہیں۔'' روبی ہیروں کی تھیلی سے کھیلتے ہوئے بولی۔ یہ لال رنگ کی تھیلی تھی جس پر سنہری کڑھائی سے عالیانی جیولرز کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔

سلیم بیگ نے تھیلی روبی کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''پورے دس کروڑ کے ہیں۔ یہ کھیلنے کی نہیں۔ سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے۔''

روبی نے اسے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا لیکن پیچھے بیٹھے شہاب الدین کا خیال کر کے ہونٹ بھینچ لئے اور زور زور سے سانس چھوڑنے لگی۔

''بینک کا لاکر ہی مناسب رہے گا۔'' شہاب الدین نے روبی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن رائل بینک کے لاکر میں رہے گا تو اور زیادہ مناسب رہے گا۔''

''رائل بینک۔ لیکن وہ تو پرائیویٹ ہے؟۔''

''تو کیا ہوا بیٹا۔ پرائیویٹ والے زیادہ سیکورٹی دیتے ہیں۔ اور سروس بھی اچھی ہوتی ہے۔ ذرا سی گڑبڑ سے ہی بینک فیل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے پوری احتیاط برتی جاتی ہے۔ اور رائل بینک کا منیجر شرافت علی تو میرا دوست بھی ہے۔ جبکہ چیئرمین سے تو رشتے داری ہے۔ لاکر کے کرائے میں بھی ڈسکاؤنٹ مل جائے گا۔ آج کل تو اس بینک کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک تو یہ بینک زیادہ انٹریسٹ دیتا ہے اور کم انٹریسٹ پر قرضہ بھی فراہم کرتا ہے۔ لاکرز کی سیکورٹی کا تو ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ چوری یا ڈکیتی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''کیا سیکورٹی ہے انکل؟۔''

''ساتھ چلو اور خود دیکھ لو۔ مطمئن ہونے کے بعد ہی لاکر لینا۔ اگر کوئی لاکر دستیاب ہوا تو میرے خیال سے ان کے پاس کل سو کے قریب لاکر ہیں اس لئے کسٹمرز میں کھینچ تان لگی رہتی ہے۔ تبھی تو بینک نے ایک لاکر کا کرایہ پانچ ہزار روپے مہینہ کر دیا ہے لیکن ہمیں کم میں مل جائے گا۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب۔ چل کر دیکھ لیتے ہیں۔''

☆☆☆☆☆☆☆

رائل بینک کی خوبصورت عمارت ایک پوش علاقے میں تھی۔ نزدیکی پولیس اسٹیشن صرف دو سو میٹر کی دوری پر تھا۔ مین گیٹ پر جدید ہتھیاروں سے لیس چار گارڈز تعینات تھے۔

شہاب الدین کے ساتھ اندر داخل ہونے پر سلیم بیگ اور روبی کی نظر ایک طرف بنے مضبوط دروازے پر پڑی جس پر ''والٹ اینڈ سیکورٹی روم'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

اس روم کی دیوار کے ساتھ آخر میں منیجر کا کمرہ تھا جو کہ مین گیٹ کے بالکل سامنے پڑتا تھا۔ بائیں طرف لمبا کاؤنٹر تھا کیشئر اور پیسے جمع کرانے والوں کے کیبن بھی تھے۔ پیچھے کی طرف بھی کچھ کمرے اور کیبن بنے ہوئے تھے۔ وہ حصہ جنرل کسٹمرز کے لئے تھا۔

شہاب الدین کی ہمراہی میں سلیم بیگ اور روبی منیجر کے کمرے میں داخل ہوئے جو قیمتی اور شاندار فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ شیشے کے ٹاپ والی بڑی سی میز کے پیچھے پچاس سالہ منیجر بیٹھا ہوا تھا جو کہ نیلے رنگ کے سوٹ، سفید شرٹ اور رنگین ٹائی میں کافی جچ رہا تھا۔

اس کے بارعب چہرے پر سیاہ چمکتی آنکھیں اس کے ہوشیار، چالاک اور نڈر بندہ ہونے کی گواہی دے رہی تھیں۔ منیجر پوری گرمجوشی کے ساتھ شہاب الدین کے گلے ملا، حال چال پوچھا۔ شکوے شکایت کی۔ پھر شہاب الدین نے سلیم بیگ اور روبی کا تعارف کرواتے ہوئے آنے کا مقصد بیان کیا۔

انٹرکام پر چائے کا آرڈر دینے کے بعد منیجر شرافت علی مسکرا کر سلیم بیگ اور روبی سے بولا۔ ''آپ بے فکر ہو کر لاکر لے سکتے ہیں۔ یہاں جیسے لاکر آپ نے کہیں نہیں دیکھے ہوں گے۔ دوسرے بینکوں کے لاکرز عموماً سائز میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے لاکرز قد آدم کیبن کے اندر ہیں۔ یعنی کیبن کے اندر بڑی الماری نما لاکرز ہیں۔ اس میں آپ چاہیں تو گھر کا کوئی بھی قیمتی سامان رکھ سکتے ہیں۔ اور اتنا رکھ سکتے ہیں جتنا کہ گھریلو سیف نما الماری میں رکھا جا سکتا ہے۔ لاکر تین فٹ چوڑا اور پانچ فٹ اونچا ہے۔ چائے آ رہی ہے۔ آپ اطمینان سے چائے کا مزا لیں پھر آپ کو لاکرز دکھا دیتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی اور سلیم بیگ گرم چائے کی گھونٹ بھر کر منیجر سے بولا۔ ''منیجر صاحب۔ لاکر لینے کے بعد لاکر میں سامان رکھنے اور نکالنے کا کیا طریقہ کار ہے؟ کیا کوئی دوسرا ہمارے لاکر کی چابی حاصل کر کے سامان نکال سکتا ہے؟''

''نہیں۔ قطعی نہیں۔ کسٹمر کے سائن اور فوٹو ہمارے ریکارڈ میں ہوتے ہیں۔ کسٹمر پہلے میرے پاس آئے گا۔ چاہے میں اس کسٹمر کو ذاتی طور جانتا ہوں، لیکن میں اس کی فوٹو اور سائن چیک کر کے ہی لاکر کی چابی دوں گا۔ لاکر کی دو چابیاں ہوتی ہیں۔ ایک میرے پاس ہوتی اور ایک کسٹمر کے پاس۔ دونوں چابیاں لگانے سے ہی لاکر کھلے گا۔ لاکر کے کیبن کی چابی سیکورٹی آفیسر کے پاس ہوتی ہے۔ وہ خود یا ایک گن مین کسٹمر کے ساتھ نیچے والٹ میں جائے گا اور کیبن کھول کر والٹ کے دروازے پر کھڑا ہو جائے گا۔ کسٹمر کو صرف دس منٹ دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنا کام کر کے والٹ بند کر دے گا اور پھر گارڈ کیبن بند کرے گا۔ اس سے پہلے سیکورٹی روم میں کسٹمر کو تلاشی بھی دینی ہوتی ہے۔'' منیجر سے پوری تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''تلاشی کے باوجود بھی کوئی کسٹمر گڑبڑ کرتا ہے تو؟'' شہاب الدین نے سوال کیا۔ ''مان لو کہ میں کسی نہ کسی طرح دوسرے کے لاکر کی چابی حاصل کر لیتا ہوں اور ساتھ والے گارڈ کو بھی بے ہوش کر دیتا ہوں تو۔''

''تم کسٹمر والی چابی ہی حاصل کر سکتے ہو نا شہاب بھائی۔ دوسری چابی تو میرے پاس ہوتی ہے۔ وہ سامنے والی الماری دیکھ رہے ہو۔ اسی میں تمام چابیاں ہوتی ہیں۔ اس کی چابی میں یونہی نہیں رکھتا۔ ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیبن کی چابی سیکورٹی آفیسر کے پاس ہوتی ہے۔ وہ گارڈ کو کسٹمر کے کیبن والی چابی دے گا۔ تلاشی ہونے پر بھی کوئی اسکریو ڈرائیور یا کوئی اوزار لے بھی جائے تو کیبن یا لاکر کا دروازہ نہیں توڑ پائے گا۔ نا ہی کوئی ماسٹر کی اس میں کام کرے گی۔''

''لیکن منیجر صاحب۔'' روبی نے کہا۔ ''مان لیجئے کہ میں نیچے والٹ میں ہوں اور میں نے اپنا لاکر کھولا ہوا ہے۔ وہاں دوسرا کوئی کسٹمر بھی ہے اور وہ میرا سامان زبردستی لے لیتا ہے تو؟''

''تو...... تو...... روبی صاحبہ، ایک بار میں ایک ہی کسٹمر اندر جاتا ہے۔ جب وہ اپنا کام نمٹا کر واپس آئے گا تب ہی دوسرے کو والٹ میں بھیجا جائے گا۔ چلیں۔ آپ کو دکھا دیتا ہوں آج ہی ننانوے نمبر کا لاکر خالی ہوا ہے، باقی سب تو بک ہیں، میں اس کی دونوں چابیاں لے لیتا ہوں۔''

☆☆☆☆☆☆☆

منیجر شرافت علی نے اپنے گلے میں چین کو اتار کر اس میں پڑی چابی سے اسٹیل کی الماری کو کھولا۔ الماری کے خانوں میں اسٹیل کی چھوٹی چھوٹی ڈبیائیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان پر ایک سے سو تک نمبر لکھے ہوئے تھے۔

شرافت علی نے ایک ڈبیہ کھول کر ننانوے نمبر والی دو چابیاں نکالتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے ایک چابی آپ کو دی جائے گی اور ایک چابی ڈبیہ میں رہے گی کسٹمر جب والٹ سے نکلے گا تو بینک والی چابی سیکورٹی آفیسر کو دے دیگا۔ سیکورٹی آفیسر وہ چابی میرے حوالے کر دے گا۔ اس چابی کے آنے پر ہی میں دوسرے کسٹمر کو اس کے لاکر کی چابی دوں گا۔ ساتھ ہی ایک کارڈ بھی دوں گا۔''

''کیسا کارڈ۔ منیجر صاحب؟''

''وہ بینک کا کارڈ ہے۔ اس پر کسٹمر کے سائن اور فوٹو ہوتا ہے۔ وہ اس کارڈ کو سیکورٹی روم کے داخلی دروازے کے برابر میں بنی جھری سے اندر ڈالے گا۔ سیکورٹی آفیسر اس کا کارڈ میچ کرے گا اور ضروری سمجھنے پر کسٹمر کے سائن لے کر کارڈ کے سائن سے ملائے گا۔ تبھی وہ کسٹمر کو اندر آنے کی اجازت دے کر گیٹ کھولے گا۔ یہ اس لئے کہ ڈکیت جبراً والٹ تک نہ پہنچ سکیں۔ آئیے دکھاتا ہوں۔''

تینوں اٹھ کر منیجر کے پیچھے چل پڑے۔

☆☆☆☆☆☆☆

مین گیٹ سے تھوڑا پہلے والٹ کے سیکورٹی روم میں جانے والا گیٹ تھا جسے کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک بیس بائیس فٹ کا گول کمرہ تھا۔ جس میں ہتھیاروں سے لیس دو ہٹے کٹے گارڈ موجود تھے۔ دونوں نے منیجر کو سلام کیا۔

انٹری گیٹ کے ٹھیک سامنے ہی سیکورٹی روم کا

گیٹ تھا اس کی بغل میں شیشے کی اسکرین لگی ہوئی تھی جس کے نیچے دو سینٹی میٹر چوڑی اور ایک فٹ لمبی جھری تھی۔ اس جھری سے ہی کسٹمر اپنا کارڈ اندر ڈالتا تھا۔

منیجر شرافت علی بولا۔ ''مطمئن ہونے پر ہی گیٹ کھولا جاتا ہے۔ لیکن میں ساتھ ہوں اس لئے گیٹ کھول دیا گیا ہے۔''

چاروں اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں کاؤنٹر بھی تھا اور کچھ کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ایک درجن کے قریب گارڈز کے ساتھ ایک طویل القامت چوڑی کاٹھی کا پتھر جیسا سخت جان اور چٹان سے کھردرے چہرے والا ایک نوجوان بھی موجود تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی دہشت تھی کہ کوئی زیادہ دیر تک اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھا تو عالیشان سوٹ میں لیکن جسمانی بناوٹ اور چہرے کے تاثرات سے وہ کوئی پولیس والا یا فوجی لگتا تھا۔ اس نے اٹھ کر چاروں کا استقبال کیا۔

''یہ ہمارے سیکورٹی آفیسر فلک شیر ہیں۔ ریٹائرڈ میجر ان کے علاوہ ایک اور آفیسر ہے عابد خان وہ سابق پولیس انسپکٹر ہے۔ فلک شیر صاحب آپ تو ہمارے دوست شہاب صاحب کو جانتے ہی ہیں۔ یہ ہیں مسٹر سلیم بیگ اور ان کی وائف روبی صاحبہ دونوں ہمارے کسٹمر بننا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے ان کی تسلی کے لئے ہمارے ساتھ چل کر انہیں والٹ دکھا دیں۔''

''کیوں نہیں۔ آئیے۔''

فلک شیر نے پیچھے جا کر کوئی سوئچ دبایا تو والٹ کا مضبوط دروازہ آٹومیٹک ہی کھلتا چلا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

سیڑھیاں اترتے ہوئے سلیم بیگ نے کہا۔ ''منیجر صاحب میں نے فلموں میں دیکھا ہے کہ ڈاکو سرنگ بنا کر بینک میں ڈکیتی کرتے ہیں اور بینک کی سیکورٹی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔''

''نہیں مسٹر سلیم بیگ۔ کوئی بھی سورما کم از کم اس دیوار، فرش یا چھت میں نقب لگا کر والٹ میں داخل نہیں ہو سکتا۔''

''وہ کیسے؟''

''والٹ کی دیوار۔ فرش اور چھت تہری پرت میں بنی ہوئی ہے۔ اندر تین فٹ موٹی سیسے کی مضبوط پرت ہے اور اس کے دونوں طرف سیمنٹ کی موٹی پرت بنائی گئی ہے۔ برگلر الارم اس کے علاوہ ہے جو نزدیکی پولیس اسٹیشن میں بجتا ہے۔''

''اس سسٹم کو کاٹا بھی تو جا سکتا ہے نا؟'' روبی نے خیال پیش کیا۔

''نہیں مادام۔'' ایک کاریڈور میں گزرتے ہوئے منیجر بولا۔ ''برگلر الارم کا سسٹم فرش کے نیچے ہے اور اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ خرابی آنے پر فرش ہی توڑنا پڑے گا۔ وہ بکس بینک کے کس حصے میں ہے یہ میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ بینک کے چاروں طرف اور چھت پر ہر وقت گارڈ موجود رہتے ہیں۔ کوئی بھی مائی کا لال بغیر اجازت اندر داخل نہیں ہو سکتا۔''

وہ چاروں ایک بڑے کمرے میں پہنچے۔ کمرے کے تین طرف ایک سو اسٹیل کے قد آدم دروازے تھے۔

''یہ سو کیبن کے دروازے ہیں۔'' شرافت علی نے بتایا۔ ''انہیں سیکورٹی آفیسر یا گارڈ کھولے گا فلک شیر ننانوے نمبر کا کیبن کھلوائیں۔''

''میں ننانوے نمبر کی چابی لے کر آیا ہوں سر۔''

فلک شیر مسکرا کر بولا۔ ''کیونکہ ایک یہی لاکر خالی ہے۔''

فلک شیر نے کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ کیبن کے اندر تین بائی پانچ فٹ کا مضبوط لاکر تھا۔ منیجر نے چابیوں کے ذریعے لاکر کھول کر سلیم بیگ اور روبی کو دکھایا۔ وہ دونوں بینک کی سیکورٹی سے بے انتہا متاثر نظر آ رہے تھے۔

''ٹھیک ہے منیجر صاحب اب یہ لاکر ہمارا ہوا۔ کیوں روبی؟''

''ہاں بالکل، لیکن ہم دونوں کے نام سے ہوگا۔''

''اوکے۔ آپ دونوں کل اپنی فوٹو لے آئیں، کل سے ہی آپ اس لاکر کے مالک بن جائیں گے۔''

☆☆☆☆☆☆☆

گھر پہنچتے ہی روبی نے سلیم بیگ کی جیب سے ہیروں والی تھیلی نکالتے ہوئے کہا۔ ''کل بینک کے لاکر میں جمع ہونے تک یہ ہیرے میرے ہی پاس رہیں گے۔''

''کیوں......؟ تمہارے پاس کیوں رہیں گے۔'' کہتے ہوئے سلیم بیگ نے تھیلی چھیننے کی کوشش کی تو روبی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا اور غرا کر بولی۔ ''ڈونٹ ٹچ' یہ میرا ہے۔''

''نہیں۔ میں جائیداد میں برابر کا حصے دار ہوں۔ آدھے میرے ہیں' تھیلی دو۔''

''نہیں دوں گی۔ تمہارا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ بدل کر نقلی ہیرے بھی رکھ سکتے ہو تم۔''

''بکواس مت کرو۔ ایسا شک میں بھی تم پر کر سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ ہم آدھے آدھے بانٹ لیتے ہیں۔ سو ہیرے ہیں۔ پچاس تم رکھو۔ پچاس میرے پاس رہیں گے۔''

''یہ کیا...... تم دونوں پھر بچوں کی طرح لڑنے لگے۔'' گھر کی پرانی نوکرانی سلمٰی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تنبیہی لہجے میں بولی۔ ''میں تو سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں۔ میاں بیوی میں پیار اور بھروسہ ہونا چاہئے۔ اگر ان ہیروں کا بٹوارہ کرو گے تو دلوں کا بھی بٹوارہ ہو جائے گا۔''

''نہیں' یہ میرے پاس ہی رہیں گے۔''

''تم دونوں یہ ہیرے مجھے دو۔'' سلمٰی نے روبی سے تھیلی لیتے ہوئے کہا۔ ''سامنے والی سیف میں دو چابیاں لگتی ہیں۔ میں اس میں ہیرے رکھ دیتی ہوں اور تم دونوں سیف لاک کر کے ایک ایک چابی اپنے پاس رکھ لو۔ کیونکہ ایک چابی سے تو یہ الماری کھلے گی نہیں۔ کل بینک جانے سے پہلے نکال لینا۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

''مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' دونوں نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

تب سلمٰی نے دیوار گیر الماری میں وہ ہیرے رکھ کر لاک کیا اور دونوں کو ایک ایک چابی دے دی۔

''میں کھانا لگا رہی ہوں۔'' وہ کمرے سے باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''جلدی سے کپڑے بدل کر ڈائننگ ٹیبل پر آ جاؤ۔''

☆☆☆☆☆☆☆

''کیا ہے؟'' سلیم بیگ کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر روبی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ غصے سے بولی۔ ''اتنی رات کو یوں چوروں کی طرح میرے کمرے میں آنے کا مطلب؟''

"چوری کی کیا ضرورت ہے۔ میں شوہر ہوں تمہارا۔" یہ کہتے ہوئے سلیم بیگ نے دروازہ بند کر دیا۔

روبی چونک کر تھوڑا سا نروس ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ...... یہ کیا کر رہے ہو تم...... دروازہ کیوں بند کر دیا؟ مجھے تمہارے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے' پاگل ہو گئے ہو کیا یا شراب دماغ پر چڑھ گئی ہے؟ دیکھو میں شور مچا کر سلمٰی بوا کو بلالوں گی یا انکل کو فون کر دوں گی' یا پولیس کو بلالوں گی' قانون بیوی کے ساتھ بھی زبردستی کی اجازت نہیں دیتا۔"

"تم ناحق ہی پریشان ہو رہی ہو۔" سلیم بیگ اسے شانوں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وکیل صاحب نے ہمیں سال بھر کا وقت دیا ہے۔ سال بھر میں بچہ نہیں ہوا تو جائیداد تو گئی سمجھو۔ نقصان تمہارا ہی ہوگا ڈارلنگ' میں تو تیار ہوں' یہ ثابت بھی کر دوں گا' لیکن تم یہ ثابت نہیں کر پاؤ گی کہ تم میرے ساتھ تعلقات کے لئے تیار تھیں لیکن میں تیار نہیں تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارے جسمانی ملاپ کے بغیر اولاد ہو جائے۔"

"اس کے لئے مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے روبی نے سلیم بیگ کے ہاتھ اپنے شانوں پر سے ہٹا دیئے۔

"ضرورت ہے میری جان۔" سلیم بیگ اسے خود سے چمٹاتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنے بوائے فرینڈ اختر یا نوکر کے ساتھ تعلقات کے ذریعے بچہ پیدا کیا تو میں عدالت میں ڈی این اے ٹیسٹ کا مطالبہ کروں گا۔ تمہاری پول کھل جائے گی اور تمہیں بدنامی کے ساتھ ساتھ کنگالی بھی ملے گی۔ مجھے تو آرام سے آدھی جائیداد مل جائے گی لیکن تمہارے حصے کی جائیداد ٹرسٹ کو چلی جائے گی۔ سال بھر میں بچہ ہونے کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ تین مہینے ہیں' تمہارے حاملہ ہونے پر نو مہینے بعد بچے کی ولادت ہوگی' ہاں اگر تمہیں یہ دولت نہیں چاہئے تو وہ الگ بات ہے۔"

"ابھی میرا موڈ نہیں ہے۔" روبی سلیم بیگ کی بانہوں سے نکل کر سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اس کے لئے میں ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں ہوں۔ مگر میں ڈیڈی کی جائیداد ٹرسٹ میں نہیں جانے دوں گی۔"

"تو پھر آج ہی سہاگ رات منا لیتے ہیں نا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری سہیلی مونا کا شوہر نامرد تھا۔ دونوں کوئی یتیم بچہ گود نہیں لینا چاہتے تھے۔ کیونکہ اس طرح اس کے شوہر کو نامرد سمجھا جاتا۔ تب انہوں نے مونا کو سیمین بینک سے کسی کا سیمین لے کر حاملہ ہونے کو تیار کر لیا۔ میں بھی وہی کروں گی۔ ڈاکٹر تمہارے سیمین کو......"

"میں تیار ہوں گا تبھی تو نا۔" سلیم بیگ کھلکھلا کر بولا۔ "تمہارا شوہر ہوتے ہوئے بھی میں اپنا سیمین ڈاکٹر کے ذریعے تمہارے رحم میں ڈالواؤں گا کیا؟ تم بس جائیداد بچانے کے لئے ماں بننا چاہتی ہو۔ جبکہ میں تو چاہتا ہوں کہ ہم دونوں تن من سے ایک ہو جائیں۔"

"لیکن مجھے ایسا کرنا منظور نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنا جسم چھونے کی بھی اجازت نہیں دے سکتی۔"

"تو پھر بھاڑ میں جاؤ۔" سلیم بیگ جھلا کر بولا۔ "میں وکیل صاحب کو بول دوں گا کہ میں تو تیار ہوں مگر تم تیار نہیں ہو۔"

"خبردار جو وکیل انکل کے سامنے ایسی بکواس کی تو۔" روبی ڈر کر نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "تم تو کب سے مرے جا رہے ہو لیکن مجھے خود کو سلجھانے کے لئے وکیل نے تین مہینے دیئے ہیں۔ کوشش کرتی ہوں کہ ان تین مہینوں میں خود کو آمادہ کر لوں۔ جب میں ذہن بنالوں گی تو آ کر اپنی تمنا پوری کر لینا۔ لیکن صرف ایک بار۔"

"ضروری تو نہیں کہ ایک بار میں ہی کوئی نتیجہ نکل آئے۔"

"فی الحال تو تم جاؤ میرے کمرے سے۔"

"میں وکیل صاحب کو بول دوں گا۔"

"میں' میں کہہ تو رہی ہوں کہ جلد ہی خود کو تیار کر لوں گی۔"

"یہ تو میری ابھی کی خواہشوں کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے' اچھا ابھی ایک بوسہ ہی دے دو۔"

"نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے میں وکیل صاحب سے بات کر ہی لوں۔"

روبی نے اسے جلا دینے والی نظروں سے گھورا اور ہتھیار ڈال دیئے اور سلیم بیگ کا چہرہ کھل اٹھا۔

سلیم بیگ کے جانے کے بعد روبی کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور پھر خود کو بیڈ پر پھینک دیا۔ اپنی پہلی شکست پر وہ بری طرح سے تلملا رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

فرنچ کٹ داڑھی والا اختر اس وقت ایک حسینہ کو آغوش میں لئے داد عیش دے رہا تھا کہ اچانک فون کی بیل نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ اس نے برا سا منہ بنا کر فون ریسیو کیا۔ "ہیلو...... کون؟"

"سو گئے تھے کیا۔ میں ہوں روبی۔"

"اوہ ڈارلنگ تم ہو۔" وہ چہکتے ہوئے بولا۔ "نیند کہاں آتی ہے کم بخت۔ ہر دم تمہاری یاد ستاتی رہتی ہے کیا بات ہے۔ کچھ پریشان سی لگ رہی ہو کیا گلابو نے زمین کی پیمنٹ نہیں کی؟"

"اس نے تو ہاتھوں ہاتھ دس کروڑ دے دیئے تھے۔"

اختر کی آنکھوں میں لالچ کی چمک ابھر آئی۔ وہ بولا۔ "وہ روپے تمہارے ہی پاس ہیں نا ڈارلنگ؟ میرے پاس ایک بہت اچھی اسکیم ہے۔ دو سال میں ہی رقم دوگنی ہو جائے گی۔"

"نہیں ڈیئر وکیل انکل کے مشورے پر ہم نے ہیرے خرید لئے ہیں۔ دس کروڑ میں پندرہ کروڑ کے ہیرے لئے ہیں۔"

"اوہ۔ کوئی بات نہیں ڈارلنگ۔ وہ ہیرے کہاں ہیں؟"

"گھر میں ہی ہیں۔ لیکن کل ہم رائل بینک کے لاکر میں رکھنے والے ہیں۔"

اختر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر فوراً بولا۔ "فی الحال وہ ہیرے تم اپنے پاس ہی رکھنا۔ سلیم بیگ کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔"

"ڈیڈی والے کمرے کے سیف میں رکھ دیئے ہیں۔ ایک چابی میرے پاس ہے اور ایک چابی سلیم بیگ کے پاس۔ لیکن میری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔"

"بھلا وہ کیا؟"

"وکیل انکل نے سال بھر کا الٹی میٹم دیا ہے۔ میں اگر سلیم بیگ کے بچے کی ماں نہیں بنی تو مجھے جائیداد سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ میں نے سوچا کہ میں تمہارے بچے کی ماں بنوں لیکن سلیم بیگ ڈی این اے ٹیسٹ کی دھمکی دے رہا ہے۔ کم بخت

تھوڑی دیر پہلے ہی کمرے میں گھس آیا تھا۔ ایک بوسے پر ٹال دیا میں نے۔ میں کیا کروں ڈارلنگ؟ مجھے سلیم بیگ کے بچے کی ماں بننے کے لئے اس کی خواہش پوری کرنا پڑے گی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم ہی کوئی مشورہ دو مجھے۔''

''یہ تو نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ وکیل کے بچے نے بری طرح پھنسا دیا ہے۔ تمہیں اگر اپنے ڈیڈی کی جائیداد حاصل کرنی ہے تو پھر سلیم بیگ کے بچے کی ماں تو بننا ہی پڑے گا اور اس کے لئے۔''

اختر نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں سلیم بیگ کو اپنے جسم کا مالک نہیں بننے دینا چاہتی۔ خدا کے واسطے مجھے اس عذاب سے نکالو۔''

''پوری جائیداد کا لالچ چھوڑو ڈارلنگ۔ تم بس یہ دس کروڑ کے ہیرے ہتھیا لو۔''

''یہ تو ناممکن ہے۔''

''کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا' انسان اگر کچھ کرنا چاہے اور دماغ کا استعمال کرے تو ہر کام ہو سکتا ہے۔ فی الحال ہیروں کو اپنے قبضے میں کر لو۔ وکیل نے سال بھر کا الٹی میٹم دیا ہے تو کم از کم تین مہینے تو تمہارے حاملہ ہونے کا انتظار تو کرے گا ہی۔ اس دوران تم اور بھی مال سمیٹ سکتی ہو۔ فیکٹری کے حساب میں ہیرا پھیری کر سکتی ہو۔ پندرہ بیس کروڑ بہت ہیں۔ پھر چاہے تمہارے حصے کی جائیداد ٹرسٹ کو چلی جائے' پروا نہیں۔ تمہیں سلیم بیگ سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ ہم دونوں شادی کر لیں گے اور خوب موج کریں گے۔ ابھی تو تم بس ہیروں کے بارے میں سوچو۔''

''ٹھیک ہے۔ سوچتی ہوں۔ گڈ نائٹ۔''

اختر نے فون بند کیا اور دوبارہ عیش میں مگن ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

صبح سویرے وکیل شہاب الدین چالیس سال کے ایک خوش پوش آدمی کے ساتھ آ پہنچا۔ اپنی وضع قطع سے وہ کوئی افسر معلوم ہوتا تھا۔

''گڈ مارننگ وکیل صاحب۔''

''سلام انکل۔''

''جیتے رہو۔ ان سے ملو۔ یہ ہیں مسٹر جمیل احمد۔ گڈ فارچیون کمپنی کے فیلڈ آفیسر ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ ہیرے رائل بینک میں محفوظ رہیں گے۔ لیکن برا وقت آتے دیر تھوڑی ہی لگتی ہے۔ ہم نے سوچا کیوں نہ ہیروں کا انشورنس کروا لیا جائے۔ جب ہیروں کا انشورنس ہو جائے گا تو چاہے چوری ہو جائیں یا ڈاکہ پڑ جائے۔ اپنا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ دس کروڑ کی رسید ہے تو اتنے ہی مل جائیں گے۔ کیوں جمیل صاحب؟''

''بالکل۔'' جمیل احمد بولے۔ ''ہر سمجھدار انسان کو اپنی قیمتی اشیاء کا انشورنس کرا لینا چاہئے۔ بہت معمولی پریمیم میں ہی انشورنس ہو جائے گا۔''

''تم دونوں چاہو تو تنہائی میں آپس میں مشورہ کر سکتے ہو۔''

''نہیں انکل اس میں مشورے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔'' روبی نے فوراً جواب دیا۔ ''میں تو خود ہی ایسا سوچ رہی تھی۔ انشورنس سے ہم مطمئن ہو جائیں گے۔ کیوں؟'' اس نے سلیم بیگ کی طرف دیکھا۔

''ہاں انشورنس کرا لیتے ہیں۔'' سلیم بیگ نے بھی تائید کی۔

''گڈ...... ویری گڈ۔'' جمیل احمد خوش ہو کر بولا۔ ''ذرا وہ ہیرے نکال کر لائیں۔ مجھے آپ پر

پورا بھروسہ ہے لیکن ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے نا' میں تھوڑی تسلی کر لینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔''

''نہیں نہیں۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔''

''تو پھر کسی نوکر سے رسید کی فوٹو کاپی کروا کر مجھے دے دیں۔''

''وہ تو ہمارے ہی پاس ہے۔'' شہاب الدین جیب سے رسید نکال کر بولا۔ ''ہم بھیما کو بھیج دیتے ہیں۔''

پھر دونوں میاں بیوی نے اپنی اپنی چابیوں سے سیف کھول کر ہیروں والی لال تھیلی جمیل احمد کو دی۔

جمیل احمد نے تھیلی سے ہیرے نکال کر گنے۔ پورے سو دانے تھے۔ پھر اس نے بریف کیس سے میگنی فائنگ گلاس نکالا اور ایک ایک دانے کو خوب اچھی طرح چیک کیا اور مطمئن ہو کر کاغذی کارروائی مکمل کر لی۔

''مجھے ایک پارٹی سے ملنا ہے۔ بہت ضروری میٹنگ ہے۔'' شہاب الدین نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دس بجے کے بعد وہ پارٹی چلی جائے گی۔ ہم اس سے مل کر دوبارہ آتے ہیں۔ پھر ساتھ ہی بینک چلیں گے۔ تب تک ان ہیروں کو سنبھال کر رکھو۔''

یہ کہہ کر شہاب الدین' جمیل احمد کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ان کے جانے کے بعد سلیم بیگ اور روبی نے اسی خاص سیف میں ہیرے رکھ کر اپنی اپنی چابی سے الماری لاک کر دی۔

☆☆☆☆☆☆☆

ناشتے کے دوران روبی نے تھوڑا جھجکتے ہوئے کہا۔ ''انکل بھلے ہی لاکر ہم دونوں کے نام ہے۔ لیکن چابی تو ایک ہی ملے گی۔ وہ چابی میں رکھوں گی۔ اپنے پاس۔''

''کیوں؟ مجھ پر بھروسہ نہیں ہے کیا؟'' شہاب الدین سے پہلے ہی سلیم بیگ تنک کر بولا۔ ''تم بہت بے پروا ہو۔ اپنا سامان بھی ادھر ادھر رکھ کر بھول جاتی ہو۔ نہیں وہ چابی میرے ہی پاس رہے گی۔''

''لیکن مجھے تم پر رتی برابر بھروسہ نہیں ہے۔ کیا پتہ مجھے بتائے بغیر ہیرے نکال لو۔''

''روبی بیٹی تم دونوں کو ایک دوسرے پر بھروسہ ہونا چاہئے۔''

''تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی انکل۔ میں چابی رکھوں گی تو سلیم بیگ کو کیا اعتراض ہے۔''

''اعتراض ہے۔ تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو مجھے بھی تم پر اعتبار نہیں ہے۔''

شہاب الدین گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''تم دونوں کے مسئلے کا حل ہے ہمارے پاس۔ لاکر کی چابی ہمارے پاس رہے گی۔ جب بھی تم لوگوں کو ہیرے نکالنے ہوں گے ہم ساتھ چلیں گے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

سلیم بیگ اور روبی کے چہرے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ انہیں شہاب الدین پر بھی بھروسہ نہیں ہے اور کیوں ہوتا۔ آخر کو معاملہ دس کروڑ کے ہیروں کا تھا۔

ان کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے شہاب الدین مسکرا کر بولا۔ ''اگر تین چابیاں ہوں تو؟ ایک ایک چابی ہم تینوں کے پاس ہو اور تینوں چابیوں کے بغیر ہیرے حاصل نہ ہوں تو؟''

"لل۔ لیکن بینک سے تو ایک ہی چابی ملے گی وکیل صاحب۔"

"تمہارے سسر کے کمرے میں الماری ہے اور اس کی ایک ایک چابی تم دونوں کے پاس ہے نا؟ وہ الماری گولڈن اسٹیل کمپنی کی بنی ہوئی ہے اور اس کمپنی کی الماری یا تجوریاں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ آسانی سے توڑی نہیں جاسکتیں۔ تم دونوں کہو تو ہم کمپنی سے ایک تجوری منگوا سکتے ہیں۔ وہ دو چابیوں والی الماری ہوتی ہے۔ اس میں ہیرے رکھ کر اسے ہی بینک کے لاکر میں رکھ دیں گے۔ تجوری کی ایک ایک چابی تم دونوں کے پاس اور بینک کے لاکر کی چابی میرے پاس ہوگی تو کوئی بھی اکیلا ان ہیروں کو حاصل نہیں کر پائے گا۔ ہم تینوں ایک ساتھ ہوں گے تب ہی ہیرے نکالے جاسکیں گے۔"

"مجھے آپ کا آئیڈیا پسند آیا انکل۔ ہم چل کر ایسی تجوری لے آتے ہیں۔"

"ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے بیٹی۔ ہم کمپنی کو فون کر دیتے ہیں اور لاکر کا سائز بتا دیتے ہیں۔ کمپنی کا آدمی یہیں پر تجوری لے کر آجائے گا۔ اور ان کی قیمت بھی فکس ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے وکیل صاحب۔ آپ فوراً ہی تجوری منگوالیں۔"

☆☆☆☆☆☆☆

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی گولڈن کمپنی کا ایک افسر اور دو مزدور بھاری بھرکم تجوری لے کر پہنچ گئے۔ تجوری ایک فٹ گہری۔ ڈھائی فٹ چوڑی اور چار فٹ اونچی تھی۔ افسر نے بتایا کہ وہ تجوری دو چابیوں سے ہی کھلتی اور بند ہوتی ہے۔ اور اتنی مضبوط ہے کہ کسی اوزار چھینی ہتھوڑے سے توڑنا ناممکن ہے۔ گیس کٹر سے کاٹنے میں گھنٹوں لگ جائیں گے۔

شہاب الدین فاروقی نے اس تجوری کو ٹھوکر بجا کر دیکھا۔ "واقعی میں یہ بہت مضبوط ہے۔ دونوں چابیاں ایک ساتھ لگنے پر ہی کھلے گی۔"

دونوں میاں بیوی کو بھی تجوری پسند آئی اور انہوں نے افسر کو مطلوبہ قیمت ادا کردی۔

شہاب الدین نے زور لگا کر تجوری کو اٹھانا چاہا لیکن ناکام رہا۔ "کافی وزنی ہے۔ اسے دو آدمی ہی اٹھا سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہیروں کا انشورنس ہوگیا ہے۔ اس پر بھی بینک میں ڈکیتی ہوجائے تو ڈکیت اتنی وزنی تجوری اٹھا کر لے جانے کی ہمت نہیں کریں گے۔ اور کھولنے کی کوشش بھی ناکام ہی رہے گی۔ تم دونوں ہیروں کی تھیلی لے آؤ پھر بینک چلتے ہیں۔"

سلیم بیگ اور روبی دوسرے کمرے میں گئے اور ہیروں کی تھیلی نکال کر لے آئے۔

"لاؤ۔ ہم اسے تجوری میں رکھ دیتے ہیں۔" شہاب الدین نے روبی سے تھیلی لیتے ہوئے کہا۔ "پھر لاک کر کے تم دونوں کو ایک ایک چابی دیتا ہوں۔" شہاب الدین تجوری کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اس کے کوٹ کی جیب میں رکھا موبائل بجنے لگا۔

اس نے تھیلی کوٹ کی جیب میں رکھ کر فون نکالا اور بات کرنے کے بعد فون جیب میں رکھا اور تھیلی نکال کر تجوری میں رکھ کر دونوں چابیوں سے لاک کر کے ایک ایک چابی سلیم بیگ اور روبی کو دے دی۔ پھر وہ تینوں بینک کے لئے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بینک منیجر شرافت علی نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ تینوں کا استقبال کیا۔ پھر چائے کا دور چلا۔ اس دوران اس نے بھی تجوری کی تعریف کی۔ پھر اس نے ایک فارم پر سلیم بیگ اور روبی کے سائن لے کر ریکارڈ میں درج دونوں کے سائن سے ملایا اور انہیں ایک کارڈ دے دیا۔ پھر الماری سے ننانوے نمبر کی اسٹیل کی ڈبیا نکال کر بولا۔ "اس میں لاکر کی چابی ہے۔ دوسری چابی اور دیتا ہوں۔ وہ چابی آپ کے پاس ہی رہے گی۔" منیجر نے میز کی دراز سے چھ انچ لمبی چابی نکال کر دی اور کہا۔ "یہ آپ کے پاس رہے گی۔ ڈبیا والی چھوٹی چابی کو کام ہونے پر سیکورٹی روم میں دے دینا۔"

اس کے بعد شہاب الدین اور سلیم بیگ بھاری تجوری کو اٹھا کر روبی کے ساتھ سیکورٹی والے پہلے کمرے میں پہنچے۔ وہاں چار گارڈز تھے انٹری گیٹ کے برابر والی شیشے کی اسکرین کے نیچے روبی نے کارڈ ڈالا۔ خونخوار چہرے والے سیکورٹی آفیسر نے شیشے میں سے سلیم بیگ اور روبی کے چہروں کا فائل میں لگے فوٹو سے میچ کیا اور پھر گیٹ کھول دیا۔

"ویل کم۔" وہ تینوں سے بولا۔ "میرا نام عابد خان ہے۔ بینک کے رولز کے مطابق آپ کی تلاشی ہوگی اور وکیل صاحب۔ آپ اندر نہیں جاسکتے۔"

"ہمیں معلوم ہے۔" شہاب الدین مسکرا کر بولا۔ "ہم تو اس تجوری کے بھاری بھرکم وزن کی وجہ سے آئے ہیں۔"

گارڈز نے دونوں میاں بیوی کی تلاشی لی۔ (وہاں لیڈی گارڈ بھی تھی)۔ پھر عابد خان نے والٹ کا گیٹ کھول دیا اور گارڈ کو ننانوے نمبر کیبن کی چابی دی۔ دو گارڈز نے تجوری اٹھالی۔ ان کے ساتھ والٹ میں جا کر سلیم بیگ اور روبی نے کیبن کھلنے پر منیجر کی جانب سے دی گئی چابیوں سے لاکر کھولا اور تجوری رکھوا کر لاکر لاک کر دیا۔ گارڈز نے کیبن کا دروازہ بند کیا اور سیکورٹی آفس میں آکر سلیم بیگ نے بینک والی چابی عابد خان اور دوسری چابی شہاب الدین کے حوالے کر دی۔ تجوری کی چابیاں تو پہلے سے ان کے پاس تھیں ہی۔ دونوں میاں بیوی مطمئن تھے کہ ان کے ہیرے محفوظ ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ دونوں یہ ذہن دوڑا رہے تھے کہ کس طرح وہ اکیلے ہی ان ہیروں کا مالک بن سکتا ہے۔ جبکہ واپسی کے دوران وکیل شہاب الدین سوچ رہا تھا کہ اسے ٹریول ایجنسی فون کر کے اپنی ٹکٹ بک کروانی ہے۔ کیونکہ دس کروڑ کے ہیرے جو اس کے کوٹ کی جیب میں کلبلا رہے تھے۔ انہیں خرچ کرنے کے لئے کوئی یورپی ملک ہی بہترین انتخاب ہوسکتا تھا۔ اپنی سوچ کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے اپنے کوٹ کی جیب تھپتھپائی جیسے ہیروں کی موجودگی کا اطمینان کر لینا چاہتا ہو۔ برسوں کی خدمت کے بعد آج اس نے اپنے اعتماد کی قیمت خود ہی وصول کرلی تھی۔



مُیرِدیوانہ

محترم عمران احمد قریشی،
امید ہے مزاج بخیر ہوں گے
عشق جب حد سے گزر جاتا ہے تو دیوانگی کی صورت اختیار کرلیتا ہے اگر اس چاہت میں خواہ وہ اللہ سے ہو یا اس کے کسی بندے سے، سچائی اور پاکیزگی کا عنصر ہو تو عاشق انسان کے رتبے سے بلند ہو کر کامل بن جاتا ہے اور دنیا والے اپنی آنکھ سے اسے دیوانہ اور پاگل کے طور پر دیکھتی اور اس کا تمسخر اڑاتی ہے۔ مگر وہ کس منزل پر ہوتا ہے اسے کوئی نہیں جان سکتا۔ زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے شخص کی ہے جسے عشق نے فرزانے سے دیوانہ بنا دیا تھا۔ امید ہے قارئین کو یہ کہانی ضرور پسند آئے گی۔

والسّلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

ان دنوں کالج میں چھٹیاں تھیں۔ ہم نے کچھ دن گاؤں میں رہنے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے برسوں سے گاؤں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ میں ان دنوں بہت ہی چھوٹی تھی جب ہم گاؤں سے لاہور آ گئے تھے۔ اس عرصہ میں میں نے کئی بار گاؤں جانے کا ارادہ کیا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ پڑ جاتی تھی۔ اس بار تو امی بھی تیار ہوگئی تھیں۔ ہم گاؤں جانے والی بس پر سوار ہوگئے۔ گاڑی گاؤں کی حدود میں داخل ہوئی تو میری ناک میں سوندھی سوندھی مٹی کی مہک آئی اور مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب ایسی ہی مہک مجھے بہت اچھی لگا کرتی تھی۔

سائیں بابا کا مزار نزدیک آ گیا تھا۔ وہاں پر لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ امی بتانے لگیں کہ آج سائیں بابا کا سالانہ عرس ہے۔ رش کی وجہ سے بس رک گئی تو سواریاں نیچے اترنے لگیں۔ مجبوراً ہمیں بھی نیچے اترنا پڑا۔ امی کہنے لگیں کوئی بات نہیں۔ پیدل چند منٹ کا راستا ہے ہم بس کے پہنچنے سے پہلے گھر پہنچ جائیں گے۔

لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ چلنا محال ہو رہا تھا۔ اچانک لوگوں کے ہجوم میں سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔

''پکڑو، پکڑو جانے نہ پائے ارے دیکھ تو کیا لے کر بھاگا ہے۔''

میں چونک کر اس طرف دیکھنے لگی۔ لوگوں کی چیخ و پکار کی وجہ سے میں بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص آگے آگے بھاگ رہا ہے۔ خستہ حال ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات تھی۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ رنگت کبھی سرخ و سپید رہی ہو گی لیکن اس کے جسم پر میل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں مجھے نہ جانے کیوں اس پر ترس سا آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کوئی چیز پکڑی ہوئی تھی اور لوگ وہ چیز اس سے چھیننے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص اور اس کا پیچھا کرنے والے لوگ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ امی نے ایک سرد آہ بھری اور گردن ہلا کر افسوس کا اظہار کرنے لگیں۔

''بے چارہ کم نصیب۔''

''یہ کون ہے امی؟'' مجھے امی کے افسوس پر حیرت ہوئی تھی۔

''یہ ہمارے گاؤں کے چوہدری اکبر خان کا بیٹا ہے مگر پاگل ہے بے چارہ اسی لیے لوگ اسے تنگ کرتے ہیں۔'' امی نے تاسف سے جواب دیا۔

''امی یہ پاگل کیسے ہوا؟ اتنا خوب صورت اور وجیہہ نوجوان ہے مگر پاگل؟'' میں حیرت سے بولی۔

''گھر پہنچ کر تجھے اطمینان سے اس کے بارے میں بتاؤں گی۔'' امی کے جواب پر میں خاموش ہوگئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے امی کو یاد دلاتے ہوئے کہا کہ ''اب بتائیں کہ اکبر خان کا بیٹا پاگل کیوں اور کیسے ہوا؟''

''اُفوہ رانی! تجھے بھی ایک بات کی رٹ ہی لگ جاتی ہے۔ تجھے ایسی کیا فکر ہے بتادوں گی۔'' امی نے جھنجلا کر جواب دیا۔ انہوں نے اس وقت نانی جان سے گفتگو کا کوئی دلچسپ موضوع چھیڑا ہوا تھا۔

''بیٹی آؤ میرے پاس آؤ، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ بے چارہ کیسے پاگل ہوا؟'' نانا جان نے مجھے اپنے پاس بلالیا۔

''یہ اب سے پندرہ سولہ سال قبل کا واقعہ ہے۔ اس وقت تعلیم اتنی عام نہ تھی۔ ہمارے گاؤں میں تو اسکول ہی نہ تھا۔ گاؤں سے چار میل دور علی پور میں ایک سیکنڈری اسکول تھا۔ اس اسکول میں ہمارے گاؤں کے کچھ ہی بچے پڑھنے جاتے تھے۔ کیونکہ عام آدمی میں نہ تو اپنے بچوں کو پڑھانے کی سکت تھی اور نہ ہی وہ تعلیم کی اہمیت سے آگاہ تھا۔

ان دنوں اس پورے علاقے میں اکبر خان کا کچھ زیادہ ہی رعب اور دبدبہ تھا۔ چوہدری اکبر خان حد درجہ کا ظالم اور کمینہ آدمی تھا۔ لوگ اس سے اس لیے ڈرتے تھے کہ کسی کی عزت اس کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ علی پور کا تھانے دار بھی اس کا احسان مند تھا۔ اس لیے اکبر خان کو کسی کا ڈر اور خوف نہ تھا۔ وہ جب بھی حویلی سے باہر نکلتا تھا تو لوگ ڈر کے مارے گاؤں کی گلیاں خالی کردیتے تھے۔ اگر کوئی جانور بھی اکبر خان کے راستے میں آ جاتا تو وہ بھی اس کی گولی کا نشانہ بن جاتا تھا۔ وہ اتنا ہی ظالم تھا بیٹی کہ اپنے راستے میں آنے والے انسانوں کو روندتا ہوا گزر جاتا تھا۔ اس نے گاؤں اور علاقے کے لوگوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ اس کی شادی برادری ہی کی ایک لڑکی سے ہوئی تھی۔ مگر وہ اس سے اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ اسے اپنی بیوی کی رتی برابر بھی پروا نہ تھی۔ اس کے شب و روز عیاشیوں میں گزرتے تھے۔ وہ ان دنوں لاہور کی ہیرا منڈی کی ایک طوائف جمیلہ پر بے دریغ پیسا خرچ کر رہا تھا۔ گاؤں میں اکثر جمیلہ کے مجرے ہوتے یا اکبر خان خود ہی لاہور چلا جاتا اور مہینہ مہینہ بھر لاہور میں ہی رہتا۔

ایک دن ہم نے سنا اکبر خان اسی جمیلہ کو بیوی بنا کر گاؤں لے آیا ہے۔ گاؤں والوں کو اس خبر پر زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ اکبر خان کے چھوٹے بھائی سرور خان کو جب اس کا علم ہوا تو وہ اس کے راستے کی دیوار بن کر کھڑا ہوگیا کہ میں باپ دادا سے ورثے میں ملی ہوئی اس حویلی کے تقدس اور عزت کو یوں پامال نہیں ہونے دوں گا، ایک ناچنے گانے والی اور جسم فروش عورت اس حویلی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھ

سکتی۔ اکبر خان اس وقت کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تو جمیلہ کے عشق میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔"

"اب یہ میری بیوی ہے سرور میری عزت ہے تمہیں اس کے لیے اتنے گھٹیا الفاظ استعمال کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ یہ اب اس حویلی میں رہے گی چوہدرائن بن کر۔"

اکبر خان نے سخت لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ دونوں بھائیوں میں زبردست جھڑپ ہوئی اور ممکن تھا کہ بات بہت زیادہ بڑھ جاتی کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے بیچ بچاؤ کر ڈالا۔ مگر اکبر خان کے دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ دولت اور عشق کے نشے نے اسے اندھا کر دیا اور وہ اپنے ہی خون کا دشمن بن گیا۔

اکبر خان کا بھائی سرور خان بہت ہی غیرت مند اور شریف انسان تھا وہ اپنے بھائی کے بالکل برعکس تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں کے کام آتا تھا۔ یہی شرافت اس کی کمزوری بن گئی۔ گاؤں کے لوگوں نے جلد ہی یہ سن لیا کہ سرور خان شکار کھیلتے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کی موت پر اکبر خان نے بہت ہی غم اور افسوس کا اظہار کیا۔ مگر مچھ کے آنسو بہائے مگر لوگوں کو معلوم تھا کہ سرور خان کا قاتل اکبر خان ہی ہے۔ لیکن یہ بات کون اپنے منہ سے نکال سکتا تھا۔ سارا گاؤں خاموش تماشائی بنا رہا اور ایک طوائف گاؤں کی چوہدرائن بن کر راج کرنے لگی۔

جمیلہ کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب اس نے اکبر خان کے وارث جمال خان کو جنم دیا۔ جمال کی پیدائش پر اکبر خان نے حویلی میں جشن منایا۔ اس نے تجوریوں کے منہ کھول دیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خوشی میں گاؤں کے غریب لوگوں پر دل کھول کر دولت نچھاور کی۔ اس نے اپنے گاؤں میں ہی نہیں بلکہ ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی مٹھائی تقسیم کی۔

اسی طرح چھ سال گزر گئے۔ اکبر خان نے جمال کو علی پور کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ جمال کو اسکول لے جانے اور واپس لانے کے لیے ایک خصوصی تانگا بنوایا گیا اور ایک کوچوان کو خاص طور پر ملازم رکھا گیا یوں شاندار انداز میں جمال تعلیمی مراحل طے کرنے لگا۔

وہ ان دنوں کلاس نہم میں پڑھتا تھا کہ اس کی دوستی اپنے گاؤں کے ایک موچی غلامو کے بیٹے گلزار سے ہو گئی۔ گاؤں کے دوسرے بچوں کی طرح گلزار بھی پیدل اسکول آیا جایا کرتا تھا۔ غلامو اس قابل تو نہ تھا کہ گلزار کو تعلیم دلوا سکے مگر گلزار کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے غلامو اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر گلزار کو پڑھا رہا تھا۔

جمال کی عادتیں اور کردار اپنے باپ سے بہت ہی مختلف تھیں۔ وہ اپنے چچا سرور کی طرح نہایت شریف اور اچھے اخلاق اور کردار کا مالک تھا۔ اسی لیے امیری غریبی اور ذات پات کی پروا کیے بغیر اس نے گلزار کو دوست بنا لیا تھا۔ ان دونوں کے مزاج میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ جمال اکثر اسکول آتے جاتے گلزار کو اپنے ساتھ تانگے پر بٹھا لیتا تھا۔ جمال تو یہ چاہتا تھا کہ گلزار روزانہ ہی اس کے ہمراہ تانگے میں آیا جایا کرے مگر گلزار کو اپنی کم تر حیثیت کا احساس تھا کہ وہ تو ایک غریب موچی کا بیٹا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اکبر خان کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے اس لیے وہ حتیٰ الامکان یہ کوشش کرتا تھا کہ جمال کے ساتھ تانگے میں نہ بیٹھے لیکن وہ

جمال کی ضد کے آگے مجبور ہو جاتا تھا۔

جمال کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگر اس کے باپ کو اس کا علم ہو گیا تو وہ قیامت برپا کر دے گا۔ اس نے کوچوان کو منع کر رکھا تھا کہ چوہدری صاحب کو اس بات کی بھنک نہ پڑے وہ گاؤں سے کچھ فاصلے پر گلزار کو تانگے سے اتار دیتا تھا تاکہ کسی کو پتا نہ چلے کہ گلزار اس کے ہمراہ آتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمال اور گلزار کی دوستی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو جمال نے گلزار کے گھر بھی جانا شروع کر دیا تھا۔ غلامو جمال کو اپنے گھر میں دیکھ کر خوش تو ہوتا تھا مگر وہ ڈرتا تھا کہ اگر اکبر خان کو اس کا علم ہو گیا کہ جمال اس کے گھر آتا ہے تو وہ اس کا جینا حرام کر دے گا۔ وہ اور گلزار جمال سے ان خدشات کا اظہار کرتے تو وہ انہیں تسلی دیتا اور کہتا کہ آپ لوگ فکر مت کریں۔ میں کوئی گناہ یا جرم تو نہیں کر رہا ہوں کہ ابا جان ناراض ہوں گے۔ آپ بھی میری طرح کے انسان ہیں اور ہمارے مذہب کی رو سے تمام انسان برابر ہیں۔ گلزار میرا دوست ہے۔ یہ دوستی انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ مجھے اپنی اور گلزار کی دوستی پر فخر ہے اور میں اپنا خون دے کر بھی اس دوستی کو نبھاؤں گا میں امیری غریبی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف ہوں۔"

اس کی باتوں سے وقتی طور پر غلامو اور گلزار مطمئن ہو جایا کرتے تھے جمال کی دوستی نہ صرف گلزار سے تھی بلکہ وہ اس کی بہن غزالہ کو بھی اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میری بہن نہ تھی غزالہ کی صورت میں مجھے بہن مل گئی ہے۔

یہ بات آخر کب تک چھپی رہ سکتی تھی۔ بالآخر اکبر خان کو جمال اور گلزار کی دوستی کا علم ہو گیا۔ اس نے جمال کو بلا کر تنبیہہ کی کہ اگر آئندہ تم نے گلزار کو تانگے میں بٹھایا یا تم اس کے گھر گئے تو پھر اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔

جمال کہنے لگا۔

"ابا جان مجھ میں اور گلزار میں فرق کیا ہے؟ وہ بھی آخر میرے جیسا ہی انسان ہے۔ کیا اس سے صرف اس وجہ سے نفرت کی جائے کہ وہ ایک موچی کا بیٹا ہے۔"

"ہاں۔" اکبر خان نے غصے سے کہا۔ "وہ ایک موچی کا بیٹا ہے اور اس کا مقام ہمارے قدموں میں ہے سمجھے تم۔"

"لیکن وہ میرا دوست ہے ابا جان۔" جمال نے اکبر خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اکبر خان، جمال کا جواب سن کر بھڑک اٹھا اور بولا۔

"جمال......! گلزار سے تمہاری دوستی ان دونوں باپ بیٹے کو بہت مہنگی پڑے گی۔ کیا وہ مجھے نہیں جانتے؟ میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں بس اب جاؤ۔" اکبر خان نے ہاتھ ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"میرا جواب بھی سن لیں ابا جان میں گلزار کی دوستی کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

جمال نے دوٹوک لہجے میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا گیا اس کی چال میں ایک اعتماد تھا۔ اس لمحے اکبر خان کو محسوس ہوا جیسے اس کا بھائی سرور زندہ ہو کر اس کے سامنے آ گیا ہو۔ غلامو اور گلزار کے متعلق سوچ کر اس کا خون کھول رہا تھا انہی لوگوں نے جمال کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ وہ باپ کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا چوہدری اکبر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

جمال اس کی اکلوتی اولاد اور وارث تھا۔ وہ اس پر زبردستی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن اس کے حکم پر اس کے آدمی غلامو اور اس کے بیٹے گلزار کو حویلی میں اٹھا لائے غلامو جان گیا تھا کہ اسے کیوں حویلی میں اس طرح لایا گیا ہے اس لیے وہ اکبر خان کو دیکھتے ہی اس کے قدموں میں گر گیا اور اس سے معافی مانگنے لگا۔

اکبر خان نے دونوں باپ بیٹے کو خوب ڈرایا دھمکایا کہ جمال کو اپنے گھر مت آنے دو۔ اس نے گلزار سے کہا کہ تم میری بات غور سے سنو اور فوراً جمال سے دوستی ختم کردو۔ ورنہ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔

دونوں نے اکبر خان کی خوشامد کی اور وعدہ کیا کہ وہ جمال کو اپنے گھر آنے سے منع کردیں گے اور گلزار اس سے دوستی بھی ختم کردے گا۔ اسی وجہ سے اگلے روز گلزار نے ڈر کے مارے اسکول سے بھی چھٹی کرلی۔

جمال نے جب گلزار کو اسکول میں موجود نہ پایا تو وہ فکر مند ہوگیا اور اسکول سے واپسی پر بجائے اپنے گھر جانے کے وہ سیدھا گلزار کے گھر چلا گیا۔ گلزار اور غلامو جمال کو اپنے گھر میں دیکھ کر گھبرا گئے۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو بیٹا؟" غلامو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں چاچا کہ آج گلزار اسکول کیوں نہیں آیا؟" جمال اس کی گھبراہٹ سے حیران ہورہا تھا۔

"آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی۔" گلزار نے بہانہ بنایا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" جمال ایک دم فکر مند ہوگیا۔ "چلو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔" جمال نے کہا۔

"نہیں یار اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کل سے اسکول بھی آؤں گا۔ اب تم جاؤ۔" گلزار ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

"میں غزالہ بہن کے ہاتھ کی لسی پیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" جمال نے بے تکلفی سے کہا اور وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھنے سے دونوں باپ بیٹا مزید پریشان ہوگئے۔

"غزالہ گھر پر نہیں ہے جمال، اب تم چلے جاؤ۔" غلامو نے گھبرا کر کہا۔

ان لوگوں کی گھبراہٹ سے جمال کو شک ہوگیا اور پھر اس کے اصرار پر انہوں نے اسے تمام بات بتادی۔ ...... غصہ بھرے انداز میں بولا۔

"ابا جان کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی اور نہ ہی میری اور گلزار کی دوستی اتنی کچی ہے کہ ان کی دھمکیوں سے ٹوٹ جائے گی۔" اس نے اٹل لہجے میں کہا اور گھر آگیا۔

اکبر خان اس وقت اپنی بیٹھک میں لوگوں کے درمیان گھرا بیٹھا تھا۔ جمال غصے سے بھرا ہوا وہیں پہنچ گیا۔

"ابا جان۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ نے غلامو اور گلزار کی پھر بے عزتی کی ہے؟" اکبر خان بھی اس گستاخانہ انداز پر کھڑا ہوگیا اور غصے سے بولا۔

"ہونہہ، بے عزتی ان کی ہوتی ہے برخوردار جن کی کوئی عزت ہو، جاؤ اندر جاؤ۔" اکبر خان نے حویلی کے اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ میں غلامو کے گھر جارہا ہوں۔ اگر کسی نے میرے رستے میں آنے کی کوشش کی تو وہ پچھتائے گا۔"

"جمال۔" اکبر خان سراپا غضب بن گیا۔ "گھر میں جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جمال کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کردیا۔

اکبر خان کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ اور کیا کرے۔ اس کا اپنا بیٹا ہی اس کے مقابلے پر آ گیا تھا۔ جمال اسی وقت پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

جمال اور گلزار نے ان دنوں میٹرک پاس کرلیا تھا۔ گلزار تو شہر جا کر پڑھنا چاہتا تھا لیکن اس کا باپ اس کے تعلیمی اخراجات برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اس لیے گلزار ملازمت کی تلاش میں لگ گیا۔

اکبر خان بھی اسی وقت کے انتظار میں تھا کہ جمال پڑھنے کے لیے شہر چلا جائے تو وہ اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرسکے جو غلامو اور گلزار کی بے عزتی سے ہی بجھ سکتی تھی۔ ایسا تو کبھی ہوا ہی نہیں تھا کہ گاؤں میں اکبر خان کی مخالفت کرنے والے نے دوسرا سانس بھی لیا ہو۔ اکبر خان نے اپنی عزت کے لیے گلزار کو راہ سے ہٹانے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کی نظروں میں انسانی جان کی کوئی قیمت اور اہمیت ہی نہ تھی لیکن جمال کی وجہ سے اسے یہ کام منصوبہ بندی سے کرنا پڑ رہا تھا تاکہ جمال اس پر کسی قسم کا شبہ نہ کرے۔ جمال کو بھی کسی طرح اپنے باپ کے اس گھناؤنے منصوبے کا علم ہوگیا۔ لہٰذا وہ جب شہر روانہ ہوا تو گلزار کو بھی زبردستی ساتھ لے گیا۔

جمال کے کہنے پر غلامو نے سارے گاؤں میں یہ مشہور کردیا کہ گلزار کو شہر میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ شہر چلا گیا ہے۔ اکبر خان نے یہ سنا تو تلملا کر رہ گیا۔ مگر اس نے بھی یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ اب

گلزار اور غلامو اور جمال کی دوستی ختم کر کے ہی دم لے گا۔ اس نے اپنے آدمی گلزار کی تلاش میں شہر روانہ کردیے۔ وہ اسے ہر قیمت پر راستے سے ہٹانا چاہتا تھا۔ اکبر خان کے لوگوں نے گلزار کو کافی تلاش کیا مگر ناکام رہے۔ وہ گلزار کو شہر کے گلی کوچوں میں ڈھونڈ رہے تھے اور گلزار آرام سے جمال کے ساتھ ہوسٹل میں رہ رہا تھا ان کے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ گلزار وہاں ہوگا۔ اپنے آدمیوں کی ناکامی سے اکبر خان غصہ میں اندھا ہوگیا۔ اس نے غلامو کو حویلی میں بلایا اور اس سے گلزار کا پتا پوچھا۔ مگر غلامو نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ گلزار جس دن سے شہر گیا ہے اس کا کوئی خط آیا ہے اور نہ ہی کوئی اطلاع ہے میں خود اس کی وجہ سے پریشان ہوں۔

''تو ضرور بتائے گا ذلیل بڈھے۔'' اکبر خان نے حقارت سے کہا۔

غلامو بھی آنے والے خطرات کی بو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اکبر خان کا آئندہ قدم کیا ہوگا۔ اکبر خان نے غلامو کو ایک کال کوٹھڑی میں بند کرنے کا حکم دے دیا اور خود وہاں سے باہر نکل گیا۔ اسی رات اکبر خان نے گلزار کی بہن غزالہ کو بھی اٹھوا لیا۔ غلامو کی بیوی نے کافی مزاحمت کی مگر اکبر خان کے لوگوں نے اس کی اس قدر پٹائی کی کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی ناپاک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا غزالہ نے اکبر خان کی حویلی کے ایک کمرے میں اپنا دوپٹا گلے میں ڈال کر اپنی جان دے دی۔

اکبر خان نے غزالہ کی لاش گاؤں سے باہر ویرانے میں پھینکوادی اور یہ اعلان کردیا کہ کوئی بھی شخص غزالہ کی لاش کے قریب نہیں جائے گا اور وہ بے گور و کفن پڑی رہے گی۔

سارا گاؤں اکبر خان کے انتقام سے واقف تھا اس لیے کوئی بھی غزالہ کی لاش کے قریب نہ گیا۔ صرف غلامو اور اس کی بیوی اس ویرانے میں اپنی معصوم بیٹی کی لاش کے گرد بیٹھے اپنی غریبی اور بے کسی کا رونا رو رہے تھے۔ غلامو کے بوڑھے بازوؤں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے غزالہ کی قبر ہی کھود لے اور نہ ہی وہ تھانے جا کر ان ظالم لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کرانے کی ہمت رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا ان لوگوں کے خلاف اگر اس نے کوئی قدم اٹھا لیا۔ تو وہ بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ گلزار کو بلایا جائے مگر اکبر خان کی دہشت اسے کچھ بھی نہ کرنے دے رہی تھی۔

ساتھ والے گاؤں میانی میں اس کی برادری کے کچھ لوگ رہتے تھے۔ غلامو ان کے پاس گیا اور ان سے التجا کی کہ کوئی شہر جا کر گلزار کو غزالہ کی موت کی خبر دے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص شہر روانہ ہوگیا اور گلزار کو غزالہ کی موت کی خبر سنائی۔ گلزار اور جمال یہ سن کر سکتے میں آگئے۔ جمال بھی گلزار کے ہمراہ گاؤں آ گیا۔ وہ دونوں اس جگہ گئے جہاں غزالہ کی لاش پڑی تھی۔ گلزار بہن کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔

جمال نے غلامو کے سامنے قسم کھائی کہ اب میرا باپ میرے انتقام سے نہ بچ سکے گا۔ میں بھی آخر اس کا ہی بیٹا ہوں۔ میں دوستی کے امتحان میں پورا اتروں گا۔

لاش کی حالت ابتر ہوتی جارہی تھی اور اس میں سے بدبو بھی آنے لگی تھی۔ اس لیے ان تینوں نے لاش کو کپڑوں سمیت غسل دیا اور اس کا جنازہ بھی پڑھا۔ انہوں نے اب اس کو دفنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے مل کر اس کی لاش کو چارپائی پر ڈالا اور گاؤں لانے لگے تو اچانک اکبر خان کے مسلح لوگ سامنے آگئے اور انہوں نے کوئی بات کیے بغیر غلامو اور گلزار کو گولیوں سے چھلنی کردیا اور جمال کو پکڑ کر اکبر خان کے پاس لے گئے۔ اکبر خان نے جمال کو حویلی کے ایک کمرے میں بند کردیا۔ جمال پر باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی۔ مگر اس کے اندر تو ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ انسانیت کی اتنی بے حرمتی کہ ان کی لاشوں کو کفن بھی نہ پہنایا جائے اور انہیں یوں ہی آوارہ کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ یہی سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جارہا تھا۔

اس نے دروازے پر دستک دے کر نوکر کو بلایا اور اس سے پانی مانگا۔ جیسے ہی ملازم نے پانی دینے کے لیے دروازہ کھولا جمال نے اس کے سر پر پیتل کا بھاری گلدان مار کر اسے بے ہوش کردیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے اکبر خان کے کمرے میں رکھی ہوئی رائفل اور پستول پر قبضہ کرلیا اور فالتو راؤنڈ بھی ساتھ لے کر وہ باہر آ گیا۔ اکبر خان اپنے پالتو بدمعاشوں کے ساتھ اس وقت بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ جمال اچانک ہی ان کے سر پر جا پہنچا اور وہاں موجود تمام افراد پر گولیوں کی بارش کردی۔ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ وہ جنون میں لاشوں کو روندتا ہوا حویلی سے باہر آ گیا۔ وہ وہاں سے سیدھا اس جگہ پہنچا جہاں غلامو، غزالہ اور گلزار کی لاشیں پڑی تھیں۔ لیکن وہاں کا منظر دیکھ کر وہ دہشت زدہ رہ گیا۔ گاؤں کے سب آوارہ کتے وہاں جمع تھے اور لاشوں کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ وہ منظر دیکھ کر جمال نے ایک چیخ ماری اور دیوانہ وار ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اس دن سے آج تک جمال اپنے دوست اور اپنی منہ بولی بہن کی یادوں کو سینے سے لگائے گاؤں کی گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ کاش اسے بھی موت آجائے تو وہ اس دنیا کے دکھوں سے نجات پا جائے۔''

نانی جان یہ خون رنگ داستان سنا کر خاموش ہوئیں تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور میرے دل سے آہ نکلی۔

''بے چارہ جمال۔''

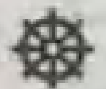
پندرہ دن کے بعد جب میں اور امی واپس جا رہے تھے تو بس اسٹاپ پر مجھے اچانک جمال نظر آیا۔ ہم اس وقت تانگے سے اتر رہے تھے مجھے دیکھ کر جمال تیر کی طرح میری طرف آیا۔

''غزالہ، غزالہ۔'' اس نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔

''گلزار کہاں ہے غزالہ۔ اچھا وہ نہیں آیا۔'' جمال خود ہی مسکرانے لگا۔ ''مصروف ہوگا اچھا تو یہ لے۔'' یہ کہہ کر اس نے منکوں کی ایک مالا اور دس روپے کا ایک مڑا تڑا نوٹ اپنی پھٹی پرانی قمیص کی جیب سے نکال کر مجھے دے دیا۔ میں انکار نہ کرسکی اور وہ چیزیں رکھ لیں۔ جب تک ہماری بس وہاں سے روانہ نہ ہوئی جمال وہیں کھڑا رہا اور چلتے وقت ہاتھ ہلا ہلا کر کہتا رہا۔

''غزالہ گلزار سے کہنا مجھ سے ایک بار ضرور مل لے۔''

بس چلی تو وہ دھول اور مٹی میں میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔



قسط نمبر 4

گنگا کا پجاری

اے حمید

جب بھی بارش اور جنگلات کے ساتھ ہندوستان کا تذکرہ آتا ہے' ذہن میں صرف اور صرف ایک ہی شخصیت کا تصور اور پیکر چھن سے اتر آتا ہے وہ تصور اور پیکر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے' ان کے بارے میں نئے افق کے مدیر اور معروف کہانی کار اظہر کلیم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کی منظر کشی کرتے ہیں تو کمرے میں بند قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ باہر بارش ٹھاٹھ برس رہی ہے اور جب وہ قہوہ کا ذکر کرتے ہیں تو قہوے کی خوشبو چاروں طرف پھیلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ جادو گر تھے جو اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والے کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

زیر نظر ناول بھی اے حمید کا سفر نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں آپ کو ایڈونچر سسپنس کے ساتھ معصوم محبتوں کے فسانے بھی ملیں گے۔

معلوم ہوا کہ دو تین ہفتوں سے رات کو سانپ نہیں آیا۔ کاجل کی صحت ٹھیک ہو رہی تھی مگر اس کی ماتا جی کو افسوس تھا کہ ناگ دیوتا اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ کہنے لگی۔

"سوچتی ہوں کاجل کو ساتھ لے کر بلیشور جی کے مندر میں جا کر اسے اشنان کراؤں۔ ناگ دیوتا کی پوجا کراؤں۔ شاید دیوتا ہم پر مہربان ہو جائیں۔ ہمیں شما کر دیں۔"

کاجل کے پتا جی یا اس کا انکل چندر بابو ہوتا تو میں توہم پرستی کے خلاف کوئی بات بھی کرتا مگر کاجل کی ماتا جی تو توہمات کا پتلا تھیں۔ وہ اپنے خاوند اور کاجل کے پتا جی کی طرح کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ یہ سب کچھ فراڈ ہے اور کسی بنگالی سپیرے نے اپنے طور پر یا کسی پجاری کے کہنے پر سانپ کو کاجل کے کپڑے کسی طریقے سے سنگھا کر سانپ کو اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس اسکیم کے پیچھے ان کا کوئی خاص مقصد چھپا ہوا ہو۔ یہ مقصد ابھی تک نہ میں سمجھ سکا تھا نہ کاجل کے باپ اور اس کے انکل چندر بابو کی سمجھ میں آیا تھا۔ جس شخص نے بھی کاجل کے کپڑے یا اس کی کوئی پرانی ساڑھی سانپ کو سنگھا کر سانپ اس کے پیچھے لگا دیا تھا اسے خوب معلوم تھا کہ کاجل کے گھر والے سانپ کو ناگ دیوتا کا اوتار سمجھتے ہیں سانپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ویسے بھی مشرقی اور جنوبی ہند میں سانپ کو ناگ دیوتا ہی سمجھا جاتا ہے۔ ہاں کسی گھر میں سانپ نکل آئے تو اس کو مارنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جان بچانے کے لیے لوگ گھر سے باہر ضرور آ جاتے ہیں پھر کسی سپیرے کو بلوا کر سانپ اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے کئی جگہوں پر سانپ کے ڈسنے سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ تو ہم پرست ہندو یہی سمجھتے ہیں کہ ناگ دیوتا نے مہربان ہو کر اس عورت یا آدمی کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ ہماری نئی نسل نے تو ہندو کو دیکھا بھی نہیں ہے ان کے گھروں کی معاشرت اور ان کی مذہبی توہم پرستیوں کو اگر دیکھا جائے تو آج بھی اسی شدت سے قائم ہیں تو آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اور ہندو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

اتنے میں کاجل کے پتا جی بھی آ گئے چھتری بند کر کے اسے کونے میں لگاتے ہوئے بولے۔

"بڑا پانی برس رہا ہے۔"

پھر مجھے دیکھا تو مسکرا کر کہا۔

"ارے بھئی کمل ابھی تک نہیں آیا؟ مہمان کے لیے رس گلے منگوانے تھے۔" وہ دھوتی کے پلو کو ٹھیک کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئے اور ماتا جی سے کہا۔

"میرے لیے بھی چائے بنا دو۔"

کاجل کی ماتا نے چائے کی پیالی بنا کر اپنے خاوند کے آگے رکھی اور ساڑھی سنبھالتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ میں نے جان بوجھ کر ناگ دیوتا والا موضوع چھیڑ دیا اور کاجل کے باپ سے کہا کہ میرے خیال میں اب سانپ اس گھر میں کبھی نہیں آئے گا۔ کاجل کے پتا جی نے چائے کا گھونٹ بھرا اور بولے۔

"بھائی تم کاجل کی ماتا جی کو نہیں جانتے۔ اب اسے یہ وہم لگ گیا ہے کہ ناگ دیوتا ہم سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اس لیے وہ کاجل کے پاس نہیں آتے۔ وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی بیٹی سانپ کے نہ سونگھنے سے صحت مند ہو رہی ہے۔ وہ تو پاگل ہو گئی ہے۔ ادھر جاپانی فوجیں آسام کی سرحدوں کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ انڈیمان پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے اور یہ عورت ناگ دیوتا کی پوجا کر رہی ہے۔ مائی فٹ! میں تو کہتا ہوں یہ سب کچھ فراڈ ہے۔"

میں نے انہیں یہ بالکل نہ بتایا کہ کاجل کی ماتا جی کاجل کو بلیشور کے ناگ مندر میں لے جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ میں نے سوچا مجھے ادھر کی بات ادھر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اسے کاجل کو بلیشور کے مندر میں لے جانا ہو گا تو اس کے پتا جی کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔ میں تو وہاں صرف اداس کاجل کے درشن کرنے جاتا تھا۔ اور میں اس کے صرف درشن ہی کرنا چاہتا تھا۔

مزید کچھ روز گزر گئے۔ اب میرا کاجل کے گھر میں باقاعدہ آنا جانا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے کلکتے کے دوست جان کو یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہی بات کہی تھی کہ اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا۔ بنگال کا جادو جس پر چل جائے پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ میں نے اس وقت اپنے دوست کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن بعد میں اس کی بات سچی ثابت ہوئی۔ ایک دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ کلکتے کے آسمان پر ساون کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے کولوٹولہ اسٹریٹ کے چوک میں سے رجنی گندھا کے پھولوں کا گلدستہ خریدا اور کاجل کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہاں صرف کاجل کا باپ اور کاجل کا چھوٹا بھائی کمل ہی تھے۔ معلوم ہوا کہ کاجل کی ماتا جی اپنی بیٹی کو لے کر بلیشور کی بجائے کتھار کے ناگ مندر میں گئی ہوئی ہیں۔ میں نے گلدستہ کمل کو دیا جو اسے لے کر دوسرے کمرے میں گلدان میں لگانے چلا گیا۔ کاجل کا والد کچھ پریشان سا لگ رہا تھا کہنے لگا۔

"کاجل کی ماں کہیں میری بچی کی زندگی برباد نہ کر دے۔ یہی فکر لگی رہتی ہے مجھے......"

میں نے پوچھا کہ یہ کتھار کا ناگ مندر کہاں پر ہے۔ کاجل کے باپ نے کہا۔

"کاکسز بازار کے دکھن میں ہے۔ مجھے تو یہ ڈر لگا ہوا ہے کہ وہاں سے برما کی سرحد شروع ہوتی ہے اور برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ کاکسز بازار میں انگریزوں کی فوج نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر حملہ ہو گیا تو جاپان کاکسز بازار پر منٹوں میں قبضہ کر لے گا۔ یہ لوگ جلتی آگ میں چلے گئے ہیں۔ میں نے لاکھ منع کیا کہ بیٹی کو لے کر وہاں نہ جاؤ مگر میری سنتا کون ہے۔"

"کیا ماتا جی کاجل کو لے کر اکیلی گئی ہیں؟"

"چندر بابو ساتھ گیا ہے مگر وہ کیا کرے گا۔ اگر

جاپانی آگئے تو وہ تو ان تینوں کو پکڑ کر شوٹ کردیں گے یا جزیرہ انڈیمان لے جاکر قید میں ڈال دیں گے۔“

معلوم ہوا کہ ایک روز پہلے شام کے وقت دو بنگالی سپیرے آئے اور کہنے لگے کہ ہمیں کتھار ناگ مندر کے مہنت نے بھیجا ہے۔ مہنت جی کے سپنے میں ناگ دیوتا انسانی روپ میں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ کلکتے جاکر کاجل کے ماتا پتا سے کہو کہ ہم ان سے سخت ناراض ہیں کیونکہ انہوں نے ہماری دیوداسی کاجل کا ڈاکٹری علاج شروع کروادیا ہے۔“

ناگ دیوتا نے مہنت جی کے ذریعے پیغام بھیجا ہے کہ کاجل دیوداسی کو لے کر فوراً ہمارے مندر میں پہنچو۔ اس کے بعد ہم کاجل کی ساری تکلیفیں دور کردیں گے۔ چنانچہ ضعیف الاعتقاد ماتاجی نے اسی وقت کاجل کو ساتھ لیا اور کتھار کی طرف روانہ ہوگئیں۔

کتھار کاکسز بازار کے انتہائی جنوب میں ساحل پر واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اپنے ناگ مندر کی وجہ سے مشہور ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے نقشے پر ایک نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتھار کے آگے برما کے شمالی علاقے اراکان کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ مجھے بھی فکر لگی کہ واقعی کہیں یہ لوگ جاپانیوں کی قید میں نہ پھنس جائیں۔ یہ ساحلی قصبہ ہندوستان کی جنوب مشرقی سرحد کے عین اوپر تھا۔ دوسری طرف برما کے شمالی صوبے اراکان کی سرحد شروع ہوجاتی تھی اور پورے برما پر جاپانی فوجیں قبضہ کرچکی تھیں۔ کاجل کا باپ خود بڑا پریشان تھا مگر اپنی توہم پرست بنگالی بیوی کے آگے مجبور تھا۔ وہ یہی کرسکتا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی چندر بابو کو ساتھ بھیج دیا اور اسے تاکید کردی کہ اگر وہاں حالات تشویش ناک ہوں تو کاجل اور اس کی ماتاجی کو لے کر اسی وقت واپس آجائے مگر حالات جس قسم کی تشویش ناک صورت اختیار کرچکے تھے اس کا کاجل کے باپ کو بھی پوری طرح علم نہیں تھا۔

آخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا نہ چندر بابو کاجل اور اس کی ماتا کو لے کر خود واپس آیا نہ اس کا کوئی خط ہی آیا۔ جب پندرہ بیس دن گزر گئے تو کاجل کے باپ نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔ جنوب میں انگریزوں کی ہندوستانی فوجیں جاپانی یلغار سے شکست کھا کر بھاگ چکی تھیں۔ جاپانیوں نے انڈیمان یعنی کالے پانی کے سارے جزیروں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جاپانی فوجوں کا زیادہ دباؤ اوپر شمال میں آسام کے سرحدی علاقے کوہیما اور امپھال کی طرف تھا۔ پولیس نے رپورٹ تو درج کرلی لیکن کاجل کے باپ سے بنگالی تھانے دار نے یہ ضرور کہا کہ آپ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ نے ان حالات میں اپنی بیٹی اور بیوی کو کتھار کی طرف کیوں بھیج دیا۔ وہاں سے تو لوگ بھاگ کر کلکتے کی طرف آرہے ہیں۔ یہ سن کر کاجل کے باپ کے رہے سہے ہوش بھی گم ہوگئے۔ میں خود کاجل کے لیے سخت پریشان تھا کہ خدا جانے یہ نازک سی اداس چہرے والی بنگالی لڑکی کس حال میں ہوگی۔ طبیعت میں ایڈونچر پہلے سے موجود تھا۔ سر میں کاجل کے عشق کا بھوت بھی تقریباً سوار ہوچکا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے کاجل کے باپ سے کہا کہ میں کاجل اور اس کی ماتا کا پتا کرنے کتھار کے ناگ مندر جاؤں گا۔ کاجل کا باپ میرے اس فیصلے سے متاثر ضرور ہوا مگر اسے یقین نہیں آتا تھا کہ میں ان لوگوں کو تلاش کرسکوں گا۔ خود بھی مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نے کس قدر احمقانہ اور سنگین فیصلہ کیا ہے اور آگے چل کر مجھ پر کیسی بھیانک مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ جب میں نے کاجل کے باپ سے کہا کہ میں ضرور جاؤں گا اور میں فیصلہ کرچکا ہوں تو اس نے مجھے کچھ روپے دیئے اور کہا۔

”بھگوان تیری رکھشا کرے جاتے ہی خط ضرور لکھ دینا۔“

یہاں سے میرے ایک اور ناقابل فراموش اور خطرناک ترین ایڈونچر کا آغاز ہوتا ہے۔

✿ ✿ ✿

مجھ پر اس بنگالی لڑکی کاجل کا جادو چل گیا تھا۔ میں اس کے طلسم میں گرفتار ہوکر ایک بڑے ہی خطرناک سفر پر روانہ ہوگیا۔ جانے سے پہلے میرے کلکتے کے دوست جان نے مجھے سختی سے منع کیا کہ میں عقل سے کام لوں مگر میری عقل تو ہندو بنگالی لڑکی کاجل کے جادو نے ماؤف کردی تھی۔ حاتم طائی کے قصے میں ایک کوہ ندا کا ذکر ہے۔ پورے چاند کی رات کو اس پہاڑ سے ایک آواز آتی ہے اس آواز کو سن کر گاؤں کا ایک نہ ایک آدمی کوہ ندا کی طرف اپنے آپ بڑھتا چلا جاتا تھا۔ وہ پہاڑ کے غار میں داخل ہوجاتا اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ کاجل میرے لیے کوہ ندا تھی اور میں بے اختیار اس کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مہم میں کاجل کے باپ اور بھائی کی پریشانی سے بھی متاثر تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ کاجل کی محبت مجھے کالے پانیوں کے ساحلی جزیروں کی طرف کھینچے لیے جارہی تھی۔

یہ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ تھا۔ سارا بنگال ایک ہی تھا۔ کلکتے سے اس زمانے میں کاکسز بازار تک چھوٹے جہاز چلا کرتے تھے میں بھی ایک چھوٹے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔ یہ جہاز کلکتے کی مشہور بندرگاہ خضر پور جیٹی سے دریائے ہگلی میں ساحل کے ساتھ ساتھ جارہا تھا۔ یہ دریا کے ڈیلٹے کا علاقہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے جہاز کھلے پانیوں میں سفر نہیں کرتے تھے۔ جہاز میں بہت کم مسافر سوار تھے۔ زیادہ تر کاکسز بازار کے مقامی لوگ تھے۔ کاکسز بازار تک پہنچتے پہنچتے سمندر بھی آگیا تھا۔ یہ کالا سیاہ سمندر تھا۔ اس کو کالا پانی کہتے ہیں۔ ویسے تو پانی سفید ہوتا ہے مگر دیکھنے سے وہ تارکول کی طرح کالا سیاہ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ وہاں سمندر کے نیچے کالی سیاہ پہاڑیاں ہیں جن پر کالی گھاس اگی ہوئی ہے اس کی وجہ سے سمندر کا پانی سطح پر سیاہ نظر آتا ہے۔ بہرحال میں کاکسز بازار پہنچ گیا۔

کتھار ناگ مندر یہاں سے آگے ایک سرحدی اور ساحلی گاؤں میں تھا۔ کاکسز بازار کے ایک گھاٹ سے میں ایک سواریوں والی بڑی کشتی میں سوار ہوگیا۔ یہ کشتی بھی ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ جنگ کا کچھ نقشہ میں نے کاکسز بازار میں ہی دیکھ لیا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور اسٹور بند پڑے تھے تاجر لوگ اپنا کاروبار سمیٹ کر کلکتے جاچکے تھے۔ فضا میں خوف وہراس کی کیفیت طاری تھی۔ لوگ یہی کہتے تھے کہ جاپانی فوج کسی بھی وقت کاکسز بازار میں داخل ہوسکتی ہے۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ جاپانی اوپر آسام کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ خلیج بنگال میں ان کے ایک دو بحری جنگی جہاز ضرور دیکھے گئے تھے۔ مگر کاکسز بازار کی طرف جاپانیوں نے ابھی توجہ نہیں دی تھی۔ ویسے بھی یہ علاقہ برما کے بارڈر سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن میں جس جگہ یعنی کتھار گاؤں جارہا تھا وہ برما کے بارڈر کے عین اوپر واقع تھی اور اس کے مغرب کی طرف سمندر تھا اور مشرق کی جانب برما کا بارڈر تھا۔ جہاں جاپانیوں نے قبضہ کیا ہوا تھا۔

ایک طرح سے موت کے منہ کی طرف بڑھ

رہا تھا۔ اگر اس وقت میرے دماغ میں تھوڑی سی بھی عقل موجود ہوتی تو میں کبھی کلکتے سے روانہ نہ ہوتا۔ لیکن مجھ پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ بڑی کشتی میں کچھ اور مسافر بھی بیٹھے تھے۔ یہ سب دیہاتی قسم کے لوگ تھے۔ ان کے لباس برمی اور بنگالی کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ کشتی میں چاول اور دیگر سامان کی بوریاں بھی لدی ہوئی تھیں۔ آسمان پر بادل جھکے ہوئے تھے مگر خدا کا کرم ہی رہا کہ بارش نہ ہوئی۔ ورنہ کشتی میں بارش سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔

کشتی کتھار گاؤں کے چھوٹے سے گھاٹ کے ساتھ جا کر لگ گئی۔ یہ ایک مختصر سا ساحلی گاؤں تھا۔ بانس کے مکان اور جھونپڑے ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک چلے گئے تھے۔ جگہ جگہ کیلے اور شریفے کے درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے مکان بھی زیادہ تر بانس کی دیواروں والے تھے جو زمین سے دو تین فٹ بلند مچانوں پر بنائے گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں کھانے پینے کے سامان کی دو چار دکانیں کھلی تھیں۔ باقی دکانیں بند تھیں۔ مجھے ایک دکان کے اندر سکھ سردار جی بیٹھے نظر آئے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ کم از کم اس سے پنجابی زبان میں تو بات کر سکوں گا۔ دکان کے باہر ہومیو پیتھ ڈاکٹر کا بورڈ لگا تھا۔ سردار جی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔ وہ آرام کرسی پر صرف جانگیہ اور بنیان پہنے بیٹھے تھے۔ عمر پچاس کے قریب ہوگی۔

میں دکان میں داخل ہوا تو سردار جی نے کتاب پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری طرف دیکھا اور بولے۔

"کیوں بابو کیا بات ہے؟"

وہ خالص اردو بنگلہ میں بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے میں نے پنجابی میں کہا کہ یہاں ایک ناگ مندر ہے مجھے اس کی تلاش ہے۔ میری زبان سے پنجابی کے الفاظ سنتے ہی سردار جی مسکرائے کتاب ایک طرف رکھ دی اور بانس کا موڑھا میری طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو بادشاہو۔ تسی اتھے کتھے آ گئے؟"

میں نے انہیں کاجل کے بارے میں ساری بات بیان کر دی اور کہا کہ اس کی ماں اور چچا اسے لے کر یہاں کے ناگ مندر میں آئے تھے پھر واپس کلکتہ اپنے گھر نہیں پہنچے۔ مجھے اس کے باپ نے ان کی تلاش میں بھیجا ہے۔"

سردار جی نے کاجل کے بنگالی باپ کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا اس نے تمہیں بلدی کے ہتھے لگن کے واسطے یہاں بھیج دیا۔"

پھر آنکھ مار کر مجھ سے پوچھا۔

"سچ سچ بتا یار۔ کہیں اس بنگالی لڑکی پر تو عاشق تو نہیں ہو گیا؟ میرا دل کہتا ہے کہ تجھ پر بنگال کے جادو کا اثر ہو گیا ہے۔ گرومہاراج بنگال کے جادو سے بچائیں۔ میری طرف دیکھ ایک بنگالی عورت نے مجھ پر بھی جادو کر دیا تھا۔ وہ خود تو پرلوک سدھار گئی لیکن میں چوبیس برس سے یہاں بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا سردار جی! بات کچھ ایسی ہی ہے۔"

سردار جی نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"پنجابی منڈے عشق کرن توں باز نہیں آ سکدے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری کاجل کا حلیہ کیسا ہے؟"

میں نے سردار جی کو کاجل کا حلیہ بتا دیا تو وہ بنگالی عورتوں کو گالیاں دینے لگے۔ بولے۔

"ساری ہندو بنگالنیں ایسی ہی چپ چپ غم زدہ سی ہوتی ہیں۔ بس ان کی اسی اداسی پر آدمی مارا جاتا ہے۔ یہی بنگال کا جادو ہے۔ ایک بار تم ان عورتوں سے بیاہ کر لو۔ تمہارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ تم چاہے انہیں مار مار کر ادھ موا کر دو۔ یہ آگے سے بولتی ہی نہیں۔ بس ہاتھ جوڑ کر مار کھاتی رہیں گی۔"

پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔

"فکر نہ کرو۔ اگر وہ اس گاؤں میں ہوئے تو میں ان کا پتا لگا لوں گا۔ ایک سپیرا میرا واقف کار ہے۔ میں اسے بلا کر پتا کروں گا۔ ویسے ناگ مندر کا بڑا مہنت اور کچھ پجاری تو جاپانیوں کے ڈر سے بھاگ گئے ہیں۔ مندر میں ناگ دیوتا جی اکیلے ہی رہ گئے ہیں۔"

سردار جی نے مجھ سے پوچھا۔

"تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں؟"

سردار جی نے اسی وقت میرے لیے ایک آدمی کو بھیج کر کچھ کھانے کے لیے منگوایا اور دکان کے کونے میں جا کر کرتا اور چار خانے والی چاٹگامی دھوتی پہننے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ بولتے جا رہے تھے۔

"ابھی تو مون سون شروع ہوا ہے یہاں۔ ذرا وقت گزر جانے دو ایسا حبس ہوتا ہے کہ نانی یاد آ جاتی ہے۔"

میں کھانا کھا رہا تھا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔

"جب سے بنگالی پتنی سورگباش ہوئی ہے بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ ایک عورت گھر کا کام کاج کر جاتی ہے۔ ایک بات ہے یہاں کی دیسی شراب......"

پھر مجھے گھور کر دیکھا اور انگلی نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"خبردار شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ بڑی بری بلا ہے۔ گرومہاراج اس سے بندے کو دور ہی رکھے۔"

میں نے جاپانیوں کے بارے میں پوچھا تو سردار جی نے کہا۔

"جاپانی یہاں سے تھوڑی دور ہی بیٹھے ہیں۔ ابھی ان کا ادھر آنے کا ارادہ نہیں لگتا۔ ان کا سارا زور اوپر امپھال کی طرف ہے۔ یہاں تو وہ جب چاہیں آ کر قبضہ کر سکتے ہیں۔ انگریزوں کی یہاں کوئی ڈیفنس نہیں ہے۔"

پھر خود ہی بے نیازی سے سر جھٹک کر جاپانیوں کو ایک گالی دی اور کہا۔

"مائیں آ جائیں جاپانی بھی۔ میں تو کہہ دوں گا کہ سبھاس چندر بوس میرا دوست تھا میرے پاس ہومیو پیتھی کا علاج کرانے آیا کرتا تھا......"

تھوڑی دیر میں رات کا اندھیرا ہو گیا۔ اس ساحلی گاؤں میں بجلی کہیں نہیں تھی۔ ویسے بھی جاپانیوں کے حملے کے خوف سے رات کو وہاں بلیک آؤٹ کر دیا جاتا تھا۔ سردار جی کا مکان دکان کے پیچھے کچی سڑک کی دوسری طرف تھا۔ بانس کی دیواروں والا دو کمروں کا مکان تھا۔ انہوں نے برآمدے میں مجھے چارپائی ڈال دی۔ مچھر دانی بھی لگا دی۔ ساری رات بارش ہوتی رہی۔ صبح اٹھا تو بارش ہو رہی تھی مگر کہیں بھی پانی نہیں کھڑا تھا۔ زمین اونچی نیچی نیم پہاڑی تھی۔ سردار جی کی نوکرانی آئی ہوئی تھی۔ بارش کی وجہ سے وہ واپس نہ جا سکی اور رات وہیں رہی۔ صبح اس نے ہمیں ناشتہ وغیرہ بنا کر دیا۔

کوئی دس بجے کے قریب بارش رک گئی۔ میں نے سردار جی سے کہا۔

"مجھے ناگ مندر کا پتا بتا دیں۔ میں کم از کم وہاں جا کر بنگالی فیملی کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل کروں۔"

سردار جی بولے۔ "کاکا تمہیں وہاں سوائے پتھر

کے ناگ دیوتا کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ مہنت اور پجاری جاپانیوں کے خوف سے اپنے سارے سانپ دیوتا پٹاریوں میں ڈال کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے ہیں تم گھبراؤ نہیں، میں کسی کو بھیج کر اپنے یار سپیرے کو دکان پر بلاتا ہوں۔ اس سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔"

دکان پر آ کر سردار جی نے ایک آدمی کو سپیرے کی طرف بھیجا۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد سپیرا بھی آ گیا۔ پہلی نظر میں یہ کالا کلوٹا سپیرا مجھے بن مانس لگا۔ اس کے جسم پر کافی بال تھے۔ ناک چوڑی اور آنکھیں سرخ تھیں۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں بانس کی لمبی چھڑی تھی۔ آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر سردار جی کو پرنام کیا اور بولا۔

"ماراج نے بلایا ہے۔ کیا بات ہے؟"

وہ اردو ایسے بولتا تھا جیسے اس نے نئی نئی سیکھی ہو۔ سردار جی نے اس کو کاجل اور اس کے انکل اور ماتا جی کے بارے میں ساری تفصیل بتائی اور کہا۔

"یہ لوگ ایک مہینہ ہوا ناگ مندر میں آئے تھے کلکتے سے۔ تب سے واپس نہیں گئے۔ یہ نوجوان ان کی تلاش میں کلکتے سے یہاں آیا ہے۔ کیا تم ان کے بارے میں کھوج لگا سکتے ہو؟"

اس سپیرے کا نام سردار جی نے مجھے شانچی بتایا تھا کہ یہ سپیرا نسل در نسل یہاں کا رہنے والا تھا اور سانپوں کو جنگل سے پکڑنا اور انہیں ہندوستان کے مختلف ناگ مندروں میں سپلائی کرنا اس کا دھندا تھا۔ شانچی کی عمر کا اس کی شکل اور سوکھا ساکھا جسم دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ کبھی وہ مجھے لگتا کہ اس کی عمر ساٹھ سال کی ہو گی۔ کسی وقت لگتا کہ وہ بیس بائیس سال کا نوجوان ہے۔ اس کے جسم پر جو بال نظر آ رہے تھے وہ سارے کالے تھے۔ شانچی بانس کی چھڑی فرش پر رکھ کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ میں اس کی باتوں کو سلیس اردو میں بیان کرتا ہوں۔

"سردار جی! کبھار کے ناگ مندر میں بنگال آسام سے عورتیں مرد ناگ پوجا کو آتے ہی رہتے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے اب اس مندر میں کوئی نہیں آتا۔"

پھر شانچی سپیرے نے میری طرف سرخ انگارہ ایسی آنکھوں سے دیکھا اور مجھ سے کاجل اس کی ماتا اور چچا کا حلیہ دریافت کیا۔ میں نے اسے بتا دیا۔ وہ فرش کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے فرش پر کوئی شے نظر آ رہی ہے۔ پھر سردار جی کی طرف دیکھ کر اسٹول سے اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"سردار جی! میں کھوج لگا لوں پھر آ کر کچھ بتا سکوں گا۔"

سردار جی نے پوچھا۔

"شانچی! کتنے دن تک کھوج لگاؤ گے؟"

وہ بولا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

اور پرنام کر کے چلا گیا۔ مجھے مایوسی ہوئی۔ دل میں سوچا کہ یہ کام مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔ یہ سوکھا ساکھا سپیرا کیا کرے گا۔ اس کو کاجل اور اس کی ماتا کا حلیہ بھی یاد نہیں رہے گا۔ میں نے سردار جی سے جب اپنی مایوسی کا اظہار کیا تو وہ بولے۔

"کاکا تو اس سانپ کی اولاد کو نہیں جانتا۔ یہ ہر جگہ گھس جاتا ہے۔ زمین کے اندر کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ دو ایک دن ٹھہر جا۔ یہ کچھ نہ کچھ سراغ رسانی ضرور کر کے آئے گا۔ اور ویسے بھی تم اکیلے یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔ تم تو ان لوگوں کی زبان بھی نہیں جانتے۔ یہاں سے ذرا آگے جاؤ گے تو اراکان کی برمی زبان شروع ہو جائے گی۔"

میرا خیال تھا کہ شانچی سپیرا سراغ رسانی کرنے میں چھ سات دن تو ضرور لگائے گا مگر وہ دوسرے ہی دن شام کے وقت سردار جی کی دکان پر آ گیا۔ آتے ہی پہلے اس نے بڑی تیز پتی والی چائے پی۔ بیڑی پی اور دونوں نتھنوں سے دھواں نکالتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں کا پتا چل گیا ہے۔"

میں بڑا خوش ہوا۔ سردار جی میری طرف دیکھ کر بولے۔

"میں نہ کہتا تھا یہ بڑا جبردست قسم کا آدمی ہے۔ یہ تو زمین کے اندر کی بھی خبر لے آتا ہے۔ ہاں تو شانچی کیا خبر ملی ہے ان بنگالیوں کی؟"

شانچی سپیرے نے بتایا کہ کچھ روز پہلے ناگ مندر میں کلکتے سے ایک عورت اور مرد آئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بنگالی لڑکی بھی تھی چونکہ ناگ مندر میں نہ کوئی مہنت تھا نہ پجاری تھا۔ یاتری بھی نہیں تھے۔ یہ لوگ ایک دن اور ایک رات مندر میں رہے اور ناگ دیوتا کی پوجا پاٹھ کرتے رہے پھر ایک آدمی انہیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ چتوار اکھی کی پہاڑیوں میں شیش ناگ کا مندر ہے وہاں ناگ دیوتا رات کو درشن دیتے ہیں۔ یہ لوگ ان کے ساتھ چتوار اکھی کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ میں نے شانچی سپیرے سے پوچھا۔

"اب وہ لوگ کہاں ہیں؟ اگر چتوار اکھی پہاڑی مندر میں ہی ہیں تو مجھے اس مندر کا راستہ بتاؤ۔ میں وہاں جاؤں گا۔"

شانچی کہنے لگا۔

"بابو پہلے میری بات پوری سن لو۔"

شانچی نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے بتایا کہ چتوار اکھی کے شیش مندر میں ناگ دیوتا نے کبھی درشن نہیں دیئے۔ لگتا ہے ان لوگوں کو دھوکے سے وہاں لے جا کر غائب کر دیا گیا ہے۔

"اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں اپنے کسی جاسوس کو شیش مندر میں ان لوگوں کا کھوج لگانے کے لیے بھیجوں اس پر کچھ پیسے خرچ ہوں گے۔"

سردار جی نے کہا۔

"شانچی! تم پیسوں کی فکر نہ کرو۔ جتنا خرچہ ہو گا میں دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "سردار جی! میرے پاس بھی پیسے ہیں۔ مگر میں خود اس آدمی کے ساتھ شیش مندر جانا چاہتا ہوں۔"

سردار جی ہنس پڑے۔ "کاکا! یہ تم نہیں بول رہے تمہارے سر پر جو عشق کا بھوت سوار ہے وہ بول رہا ہے۔"

شانچی سپیرا کہنے لگا۔

"بابو! چتوار اکھی کی پہاڑیاں بڑی خطرناک ہیں وہاں جنگلی جانور اور سانپ بہت ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تم صرف یہ بتا دو کہ ان پہاڑیوں کو کون سا راستہ جاتا ہے اور میں وہاں کیسے پہنچ سکتا ہوں آگے میں جانوں میرا کام۔"

شانچی سپیرا سردار جی کو تکنے لگا۔ بولا۔

"ماراج! لگتا ہے یہ بابو مارا جائے گا۔ اس کو سمجھاؤ۔ یہ اس طرف نہ جائے۔"

سردار جی مجھے سمجھانے لگے۔ جب میں اپنی ضد پر قائم رہا تو انہوں نے شانچی سپیرے سے کہا کہ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں تمہیں سارا خرچہ دے دوں گا۔" شانچی کہنے لگا۔

"چتوار اکھی کی پہاڑیوں میں ایک جگہ سنتھالی سپیروں کا قبیلہ آباد ہے۔ انہوں نے ایک بہت بڑے درخت کے نیچے شیش ناگ کا مندر بنایا ہوا ہے۔ یہ قبیلہ ہمارے قبیلے کا دشمن ہے۔ میں اگر وہاں گیا تو زندہ واپس نہیں آ سکتا۔"

میں نے سردار جی سے کہا۔

"سردار جی آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اس

سپیرے سے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کا پتا لے دیں۔ میں خود وہاں پہنچ جاؤں گا۔ مجھے جنگلوں پہاڑوں کا بڑا تجربہ ہے۔"

سردار جی بولے۔ "کاکا! اگر تو باز نہیں آتا تو جا جو تیرا جی چاہے کر۔"

انہوں نے شانچی سپیرے سے کہا کہ وہ مجھے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کا پتا سمجھا دے۔ کیونکہ شانچی کو یقین تھا کہ کاجل اور اس کی ماتا اور انکل چندر بابو کو سنتھالی سپیروں نے اغوا کیا ہے۔ شانچی نے مجھے سارا راستہ اچھی طرح سے سمجھا دیا۔

سردار جی نے اس سے پوچھا کہ آخر ان سپیروں نے بنگالی خاندان کو کیوں اغوا کیا ہے۔ شانچی کہنے لگا۔

"یہ بڑا قاتل قبیلہ ہے ان کے آدمی یہاں ناگ مندر کے میلے پر اکثر آتے جاتے رہتے ہیں اور یہاں سے کسی نہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ کوئی مرد ہو تو اسے وہ راستے میں ہی ختم کر دیتے ہیں کیونکہ لڑکی کو اپنے قبیلے میں لے جا کر وہ خوب کھلاتے پلاتے ہیں۔ ان کی سپیرن عورتیں لڑکی کو دن میں دو بار ناریل کے دودھ سے نہلاتی ہیں۔ اس کا بناؤ سنگھار کرتی ہیں۔ ایک خاص مدت کے بعد لڑکی کو چھوٹے سانپ سے ڈسوایا جاتا ہے۔ جب سانپ کا زہر لڑکی کے جسم میں پھیلنے لگتا ہے تو ایک خاص دوائی لگا کر زہر کا اثر زائل کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل سات دن تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد لڑکی کو بڑے سانپ سے ڈسوانا شروع کر دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہ زہر کا اثر بھی زائل کرتے جاتے ہیں۔ ایک مہینے کے بعد لڑکی کا جسم سانپ کے زہر کا عادی ہو جاتا ہے پھر اس میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس انسان کو دانت سے کاٹے وہ مر جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سنتھالی سپیرے بنگالی لڑکی اور اس کے ساتھ جو دو مرد عورت تھے انہیں اپنے قبیلے میں لے گئے ہیں۔ انہوں نے مرد عورت کو راستے میں ہی ختم کر دیا ہوگا اور لڑکی پر سانپ ڈسوانے کا کام شروع کر دیا ہوگا۔"

شانچی کی زبان سے یہ باتیں سن کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ کاجل زہریلی لڑکی بن جائے گی اور وہ جس کو کاٹے گی وہ اس کے زہر کے اثر سے مر جائے گا۔ میں نے یہ سوچ کر شانچی سپیرے کی باتوں کو سنی ان سنی کر دیا کہ یہ شخص جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سردار جی سے زیادہ پیسے بٹورنے یا ان پر اپنا اثر ڈالنے کے لیے حالات کو زیادہ سنگین بنا کر پیش کر رہا ہو۔ میرے دماغ میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ آخر وہ کس مقصد کے لیے اغوا کر کے لائی گئی لڑکی کو زہریلا بناتے ہیں؟ سردار جی بھی یہی سوچ رہے تھے انہوں نے یہی سوال شانچی سپیرے سے پوچھ لیا۔

"او کالو تم یہ بتاؤ کہ آخر سنتھالی سپیرے لڑکی کو سانپ سے ڈسوا کر زہریلی کس لیے بناتے ہیں؟"

شانچی کہنے لگا۔

"ایسی لڑکی کو وہ سپیرن بنا لیتے ہیں۔ اسے ساتھ لے کر گاؤں گاؤں شہر شہر پھرتے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں جا کر سانپوں کا تماشا دکھاتے ہیں۔ اپنے خاص مقصد کے لیے کسی لڑکی کو پسند کر لیتے ہیں پھر خیرات میں اس لڑکی کی اتری ہوئی پرانی ساڑھی یا دھوتی لے کر اسے اپنے خاص سانپ کو سنگھاتے ہیں اور رات کو مکان کے آس پاس چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور سانپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ سانپ لڑکی کی اتری ہوئی ساڑھی یا دھوتی میں لڑکی کے جسم کی جو بو ہوتی ہے اس بو کے پیچھے پیچھے لڑکی کے گھر جہاں وہ سو رہی ہوتی ہے پہنچ جاتا ہے اور اس کی پنڈلی پر ڈس

کرآ جاتا ہے۔ یہ سانپ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کے ڈسنے سے آدمی کی موت واقع نہیں ہوتی۔ بس ایک غنودگی اور کمزوری سی آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ لڑکی کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور گھر والوں کو بتاتے ہیں کہ لڑکی پر ناگ دیوتا عاشق ہو گیا ہے اس کو لے کر اس کتھار کے ناگ مندر پہنچو۔ جب گھر والے لڑکی کو لے کر کتھار کے ناگ مندر میں پہنچتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ سپیرے راستے میں ہی لڑکی کو اغوا کر لیتے ہیں اور اس کے آدمیوں کو سانپ ڈسوا کر مار ڈالتے ہیں۔ اگر راستے میں موقع نہ ملے تو ناگ مندر کے پجاری سے مل کر لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔"

سردار جی بڑی دلچسپی سے شانجی سپیرے کی باتیں سن رہے تھے۔ میں بھی یہ سوچ کر اب پریشان ہونے لگا تھا کہ کہیں سچ مچ سنتھالی سپیروں نے کاجل کی ماں اور انکل کو سانپوں سے ڈسوا کر ہلاک نہ کر دیا ہو۔ سردار جی نے کہا۔

"اوئے کالو! تم نے بتایا نہیں پھر اس لڑکی کا انجام کیا ہوتا ہے جس کو سپیرے سانپ ڈسوا کر زہریلی بنا دیتے ہیں۔"

شانجی سپیرے نے بتایا کہ تین ایک مہینے تک مختلف سانپوں سے ڈسوانے کے بعد لڑکی کا رنگ کالا سیاہ پڑ جاتا ہے۔ اس کے جسم میں اتنا زہر پھیل جاتا ہے کہ وہ دشمن قبیلے کی جس عورت جس مرد کا منہ یا جسم کا کوئی حصہ چوم لیتی ہے وہ مر جاتا ہے۔ اس طرح یہ سپیرے لوگ اس زہریلی لڑکی کے ذریعے اپنے دشمنوں سے اپنی دشمنیوں کا بدلہ لیتے ہیں۔ شانجی سپیرے نے بتایا کہ دوسری طرف دشمن قبیلے کے سپیروں نے بھی اس قسم کی کوئی لڑکی یا آدمی اغوا کر کے اسے زہریلا بنا کر تیار رکھا ہوتا ہے اور ان کے دشمن پر حملے بھی جاری ہو جاتے ہیں۔" شانجی بولا۔

"سپیروں کے قبیلوں کی یہ لڑائی اور دشمنیاں پرانے زمانے سے چل رہی ہیں کوئی سال بھر کے اندر سانپوں سے اپنے جسم کو ڈسوانے والی لڑکی کو سانپوں کے زہر کا نشہ ہو جاتا ہے۔ قبیلے کے سپیرے تو اسے ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد ایک خاص اور بے ضرر زہر والے سانپ سے ڈسواتے ہیں مگر زہریلی لڑکی کو سانپ کے زہر کے نشے کی ایسی لت پڑ جاتی ہے کہ وہ جنگل اور پہاڑیوں میں نکل جاتی ہے اور ڈھونڈ کر سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسواتی ہے۔ اس کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ سانپوں کو بھی اس لڑکی کے زہریلے خون کا نشہ چڑھ جاتا ہے۔ جنگلی سانپ دور دور سے اس لڑکی کے جسم کی بو پا کر اس کی طرف آتے ہیں اور اس کے جسم سے جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں ایک روز زہریلی لڑکی مر جاتی ہے اور سانپ اس کے جسم کا گوشت بھی کھا جاتے ہیں۔"

شانجی سپیرے نے کاجل کی اتنی ڈراؤنی تصویر پیش کی کہ میں نے دل میں طے کر لیا کہ خواہ مجھے سنتھالی قبیلے کے سارے سپیروں کو ہی کیوں نہ قتل کرنا پڑے، کاجل کو ان کے چنگل سے ضرور چھڑا کر لاؤں گا۔ میرے دل میں ہندو بنگالی لڑکی کاجل سے محبت کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ آگے چل کر مجھے کس قسم کے خوفناک واقعات سے واسطہ پڑنے والا تھا اس سے میں بالکل بے خبر تھا۔ شانجی سپیرے سے میں نے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کا سارا محل وقوع دریافت کر لیا۔ ان کے رسم و رواج اور پوجا پاٹھ کے طریقوں کے بارے میں بھی ابتدائی معلومات حاصل کر لیں۔ اگلے روز صبح صبح میں اپنی خطرناک مہم پر روانہ ہونے لگا تو سردار جی نے بھی مجھے روکنے کی

کوشش کی لیکن میں نہ رکا اور اللہ کا نام لے کر میں پتوارا کھی کی دشوار گزار پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔

جس علاقے سے میں گزر رہا تھا یہ برما اور بنگال کا سرحدی جنگلوں کا پہاڑی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ شانجی سپیرے نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ مجھے کہاں سے کہاں تک پیدل سفر کرنا ہوگا۔ کہاں سے میں کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کروں گا۔ راستے میں کہاں کہاں پہاڑی گاؤں میرے راستے میں آئیں گے۔ اس نے بتایا تھا کہ اگر میں نقشے کے مطابق چلتا رہا تو دوسرے دن شام سے ذرا پہلے مجھے سبز رنگ کی تین چٹانیں ساتھ ساتھ کھڑی نظر آئیں گی۔ یہاں سے مجھے بائیں جانب مڑ جانا ہوگا۔ آگے ایک برساتی ندی ملے گی۔ اس ندی کے پار پتوارا کھی کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں اور ان ہی پہاڑیوں کی ایک چھوٹی سی وادی میں سنتھالی سپیروں کی بستی ہے اور وہیں ایک گنجان درخت کے تنے میں شیش ناگ کا چھوٹا سا مندر بنا ہوا ہے۔

جنگل تو اس سے پہلے میں نے بہت دیکھے تھے مگر جس علاقے سے میں گزر رہا تھا وہ ایک مختلف جنگلی علاقہ تھا۔ سمندر قریب ہونے کی وجہ سے یہاں زمین تھوڑی تھوڑی ریتلی تھی۔ اونچی گھاس کہیں کہیں بھی نہیں تھی۔ کہیں کہیں جھاڑیوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ اگے ہوئے تھے۔ ناریل اور تاڑ کے درخت دور قطاروں میں کھڑے تھے۔ کھلا میدانی علاقہ کافی دور تک چلا گیا تھا۔ ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ میں اس پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میری نگاہ پہاڑی چوٹیوں پر تھی۔ یہ پتوارا کھی کی پہاڑیاں تھیں۔ مجھے وہیں پہنچنا تھا۔ ان پہاڑیوں کو سامنے رکھ کر میں سمت درست کر لیتا تھا۔ میں نے پرانی پتلون کے اوپر ٹھنڈی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ جیب میں چاقو تھا۔ دوسری جیب میں ڈبل روٹی کے سلائس تھے جن میں سردار جی نے تلی ہوئی مچھلی کے کچھ ٹکڑے رکھوا دیئے تھے۔ میرے سفر اسی طرح شروع ہوتے تھے۔ میں اللہ توکل نکل پڑتا تھا۔ میرے جنگلوں کے تنہا سفر نے مجھ پر ایک بات ضرور ثابت کر دی تھی کہ شہروں میں آدمی بھوکا مر سکتا ہے مگر جنگل کسی آدمی کو بھوکا پیاسا نہیں مرنے دیتا۔ بمبئی اور مدراس ایسے شہروں میں اپنی بے یار و مددگار آوارہ گردیوں کے زمانے میں میں نے دیکھا تھا کہ اگر مجھے پیاس لگتی تھی تو مجھے پانی ملنا دشوار ہو جاتا تھا۔ دکاندار سوڈا واٹر کی بوتل خریدنے کو کہتا مگر سادہ پانی دینے سے صاف انکار کر دیتا تھا۔ یہ بمبئی کا شہر ہی تھا کہ جہاں مجھے دو دن کا فاقہ آ گیا تھا۔ بڑے بڑے شہر سنگدل اور بے فیض ہوتے ہیں مگر جنگل انسانوں کے ساتھ مہربان ماں ایسا شفقت کا سلوک کرتے ہیں۔ پانی کی تلاش میں بعض جنگلوں میں ضرور کچھ دور تک بھٹکنا پڑتا ہے مگر کہیں نہ کہیں کوئی ندی یا جھرنا ضرور مل جاتا ہے اور کچھ نہیں تو چاہے گدلا ہی سہی مگر بانس کے درختوں میں گھرا ہوا تالاب ہی سامنے آ جاتا ہے۔

یقین کریں جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے میں شہروں سے زیادہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا تھا۔ جنگلی درندوں اور سانپوں کا خطرہ ضرور ہوتا تھا مگر تجربے نے یہ بات بھی ثابت کر دی تھی کہ سانپ پر اگر پاؤں پڑ جائے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے حملہ کرتا ہے ویسے آپ قریب سے گزر جائیں تو وہ کچھ نہیں کہتا۔ بس ذرا سی پھنکار مار کر خبردار ضرور کرتا ہے کہ میری طرف مت آنا۔ یہی حال جنگل کے بادشاہ شیر کا ہے۔ اگر شیر کسی شکاری کی حماقت سے آدم خور نہ بن جائے تو وہ آدمی پر کبھی حملہ نہیں کرتا۔ بلکہ بعض شکاریوں نے بتایا کہ اگر شیر راستے میں آ جائے تو وہ

خاموشی سے راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ شیر جنگل میں بھوک سے مارا مارا پھر رہا ہو۔ جنگل میں قدرت نے اس کے لیے خوراک کا بڑا اعلیٰ انتظام کر رکھا ہے۔ اسے بڑی آسانی سے کسی ہرن یا نیل گائے یا جنگلی بھینس کا شکار مل جاتا ہے۔ خود میرے ساتھ ایک بار ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ میں جنگل میں چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ سامنے جھاڑیاں آ گئیں۔ میں نے راستہ تلاش کرنے کی غرض سے جھاڑیوں کو ہٹایا تو سامنے ٹھنڈے نرکلوں میں ایک بہت بڑا شیر لیٹا ہانپ رہا تھا۔ اس نے ایک دم سے اپنا بھاری شاہانہ سر اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں تو دہشت کے مارے وہیں ساکت ہو کر رہ گیا۔ شیر اسی طرح لیٹا رہا۔ صرف گردن جھٹک کر ہلکا سا غرایا۔ یہ اس بات کا انتباہ تھا کہ جدھر سے آئے ہو ادھر ہی واپس چلے جاؤ اور آئندہ اس طرف کا رخ نہ کرنا۔ میں الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ شیرنی اگر پورے دنوں سے ہو یا اس کے بچے پیدا ہو چکے ہوں تو اس کی طبیعت میں غصیلا پن ضرور آ جاتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا اناڑی آدمی ان جھاڑیوں میں چلا جائے جہاں شیرنی نے اپنے بچوں کے لیے مارا ہوا شکار چھپایا ہوتا ہے تو وہ اس پر حملہ کرے گی۔ وہ بھی اسے کھانے کے لیے نہیں بلکہ سبق سکھانے کے لیے کہ وہ اس طرف کیوں آ گیا تھا۔ صرف ایک آدھ ہاتھ ہی مارے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ شیرنی کے پنجے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ آدمی شدید زخمی ہو جاتا ہے یا کبھی کبھی آدمی کی گردن ہی ٹوٹ جاتی ہے۔

لیکن جس جنگلی علاقے میں میں چلا جا رہا تھا وہاں شیر کی موجودگی کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ البتہ ہاتھی یہاں بہت تھے۔ کئی بار ہاتھیوں کا غول میرے آگے سے گزر گیا۔ میں دوڑ کر درخت پر چڑھ گیا۔

اسی طرح میرا سفر جاری رہا۔ راستے میں جنگلی لوگوں کا ایک گاؤں بھی آیا۔ انہوں نے مجھے ابلے ہوئے چاولوں اور کچے کیلوں کا سالن کھلایا۔ یہ لوگ بنگالی اور اراکانی زیادہ لگتے تھے۔ نہ وہ میری زبان سمجھتے تھے نہ میں ان کی زبان سمجھتا تھا مگر انسان ہونے کے ناتے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ راستے میں ایک دریا بھی آیا۔ یہ دریا میں نے ایک ملاح کی کشتی میں بیٹھ کر پار کیا۔ رات ہونے لگی تو میں رات بسر کرنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کرنے لگا۔ سانپوں کی وجہ سے میں کسی درخت پر رات بسر کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ درخت بھی زیادہ تر ناریل، تاڑ اور بانس اور جنگلی کیلے کے تھے جن پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی گاؤں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک پہاڑی کی کھوہ میں کچھ سو کر اور زیادہ جاگ کر میں نے کسی نہ کسی طرح رات بسر کی۔ صبح کی روشنی ہوتے ہی میں اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

قصہ مختصر میں آخر ان تین چٹانوں کے پاس پہنچ گیا جن پر سبز رنگ کی کائی لگی ہوئی تھی۔ یہ زنگار کی سبز گہری تہہ تھی۔ یہی وہ تین سبز چٹانیں تھیں جن کے بارے میں شانچی سپیرے نے بتایا تھا کہ وہاں سے مجھے بائیں طرف مڑنا ہو گا۔ آگے ایک ندی آئے گی۔ ندی کے پار پتوارا کھی کی پہاڑیاں شروع ہو جائیں گی۔

میں سبز چٹانوں کی بائیں جانب مڑا تو آگے واقعی ایک ندی بہہ رہی تھی۔ یہ ندی ہمارے پنجاب کی نہروں ایسی ندی نہیں تھی۔ یہ پہاڑی ندی تھی جو چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان سے اور اوپر سے گزر رہی تھی۔ اس کا پانی تھوڑا گدلا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں عام طور پر اسی قسم کی گدلے پانیوں والی ندیاں بہتی ہیں۔ ہاں اگر کہیں سے آبشار گر رہی ہو تو اس کا پانی ضرور شفاف ہوتا ہے۔ ندی کے پتھروں پر پاؤں رکھتا میں ندی کے دوسرے کنارے پر چلا گیا۔ یہاں سے سامنے کی جانب دیکھا تو ڈوبتے سورج کی ملگجی روشنی میں پہاڑیوں کی چوٹیاں روشن روشن نظر آ رہی تھیں۔ یہی پتوارا کھی کی پہاڑیاں تھیں اور یہی میری منزل تھی۔

شام ہو رہی تھی تھوڑی دیر میں رات کا اندھیرا چھانے والا تھا۔ میں نے رات وہیں کسی جگہ بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ندی میں نہایا، اپنے کپڑے دھوئے فلیٹ کے کینوس کے جوتے اچھی طرح سے دھو کر صاف کیے۔ موسم حبس آلود تھا۔ بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ جب تک میں ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں داخل نہیں ہوا تھا مجھے سمت کا پورا اندازہ تھا۔ جیسے ہی میں ان پہاڑیوں کے اندر آیا مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ یہاں کافی درخت تھے۔ جھاڑیاں اور گھاس بھی تھی۔ ایک جگہ ہاتھیوں سے آمنا سامنا ہوا تو میں ان سے بچنے کی خاطر دوسری طرف کو نکل گیا۔ اوپر سے شام ہو رہی تھی۔ پہاڑی جنگل میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ ایک چھوٹی پہاڑی ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ مجھے شانچی سپیرے نے اس بات کی خاص طور پر تاکید کی تھی کہ کسی پہاڑی کے اوپر مت چڑھنا۔ کیونکہ سنتھالی سپیروں کی بستی پہاڑیوں کے درمیان کسی جگہ کھلی وادی میں ہے۔ جب مجھے احساس ہونے لگا کہ میں ان ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں الجھتا جا رہا ہوں تو میں وہیں ایک جگہ رک کر ایک درخت کے پاس کھڑا ہو گیا۔

یہاں اتنی گہری خاموشی تھی کہ ایسی خاموشی میں نے شام کے وقت کسی جنگل میں نہیں دیکھی تھی۔ حیرانی کی بات تھی کہ کسی درخت پر کوئی پرندہ تک نہیں بول رہا تھا۔ حالانکہ شام کے وقت جنگل میں پرندے بسیرا کرنے آتے ہیں اور بڑا شور مچاتے ہیں۔ میں جس مقام پر کھڑا تھا وہاں سے پہاڑی ایک طرف گھوم جاتی تھی۔ اس کا نشیب بالکل عمودی تھا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ قدم قدم چلتا پہاڑی کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں شام کے گہرے ہوتے اندھیرے میں مجھے ایک جھونپڑا سا دکھائی دیا۔ میں یہ سوچ کر اس کی طرف بڑھا کہ شاید یہاں کوئی جنگلی دیہاتی رہتا ہو۔ اس سے یہ پوچھنے کی کوشش کروں گا کہ سپیروں کی بستی یہاں سے کس طرف ہے۔ میں جھونپڑے سے ابھی دور تھا کہ مجھے ایک باریک سیٹی کی آواز سنائی دی۔ سیٹی کی اس آواز سے میرے کان آشنا تھے۔ یہ سانپ کی سیٹی کی آواز تھی۔ مجھے ایک سپیرے نے ست پڑا کے جنگلوں میں بتایا تھا کہ برسات کے دنوں میں سانپ اپنی ناگن کو بلانے کے لیے یہ آواز نکالتا ہے۔ میں ایک لمحے کے لیے وہیں چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ دوسری تیسری بار جب سانپ کی سیٹی کی آواز آئی تو میں نے محسوس کیا کہ آواز میری دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا بائیں جانب نکل گیا۔ میں نر اور مادہ سانپوں کے ملاپ کے مقام سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اتنے میں خدا جانے کہاں سے بادل آئے اور آسمان پر چھا گئے۔ بادلوں میں بجلی چمکی۔ گرج بلند ہوئی اور ایک دم سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارانی جنگلوں میں میں نے اس طرح یکدم موسلا دھار بارش ہوتے پہلے بھی کئی بار دیکھی تھی۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے بٹن دبایا اور موسلا دھار بارش برسنے لگی ہو۔ میرے سامنے اس وقت بارش

سے بچنے کے لیے وہ جھونپڑا ہی تھا جس کو دیکھ کر اس طرف آ گیا تھا۔ جھونپڑا زمین سے کوئی دو تین فٹ اونچا تھا جیسا کہ عام طور پر ان علاقوں میں جھونپڑے زمین سے دو تین فٹ اونچی مچان پر بنائے جاتے ہیں تاکہ بارشوں میں سیلاب کا پانی جھونپڑے میں نہ آ سکے۔ کیونکہ ان علاقوں میں دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا سال ہی بارشیں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ جھونپڑا ایک چھوٹے سے کیبن کی شکل کا تھا۔ اس کی دیواریں بانس جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ چھت ناریل کی شاخوں، ٹہنیوں کی ڈھلواں تھی اور آگے چھوٹا سا برآمدہ بھی تھا۔ یہ کسی دیہاتی کا جھونپڑا نہیں لگتا تھا۔ ہو سکتا ہے کسی وقت یہاں لکڑی کی کٹائی کا کام ہوتا ہو اور ٹھیکیدار کے آدمیوں نے اپنے رہنے کے لیے یہ کیبن بنا لیا ہو۔

کیبن کے برآمدے میں ایک اسٹول پڑا تھا۔ اس کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ مگر یہ گہری ہوتی شام کا اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں مجھے تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ کیبن کے فرش پر درختوں کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں باہر برآمدے میں آ کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بارش بڑے زور سے ہو رہی تھی۔ اس کی پھواریں برآمدے میں میرے اوپر بھی پڑ رہی تھیں۔ میں نے اسٹول کو ذرا پیچھے کر لیا۔ بارش کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی بہت بڑی آبشار پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے رات کا اندھیرا چھا گیا۔ پہلے مجھے سامنے اور دائیں بائیں اونچے اونچے درخت نظر آ رہے تھے۔ اب صرف بجلی چمکتی تو وہ دم بھر کے لیے نظر آ کر غائب ہو جاتے۔ میرے پاس کھانے پینے کو اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے کچھ جنگلی کیلے توڑ کر کھا لیے تھے اور ندی کے پانی سے پیاس بھی بجھا لی تھی۔ مجھے اس وقت بھوک پیاس بھی نہیں تھی۔

بارانی گھنے جنگلوں کی ایک خاص دہشت ہوتی ہے۔ شہر کا آدمی نیا نیا ایسے جنگلوں میں سفر کر رہا ہو اور رات آ جائے تو خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ شروع شروع میں مجھ پر بھی یہ دہشت طاری ہو جایا کرتی تھی لیکن وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ یہ دہشت دور ہو گئی اور مجھے ان جنگلوں کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ میں جنگل کی مختلف آوازیں پہچاننے لگا تھا۔ درندوں، پرندوں اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آوازوں کے علاوہ جنگل کی ایک اپنی آواز بھی ہوتی ہے۔ یہ آواز عام طور پر اس وقت سنائی دیتی ہے جب رات کا وقت ہو۔ ہوا بالکل بند ہو۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی ہو۔ ایسے میں اس قسم کی آواز اچانک سنائی دیتی ہے جیسے کوئی شخص آپ کے قریب سے سرگوشیوں میں بات کرتا گزر گیا ہو۔ ایک جنگلی نے مجھے بتایا تھا کہ جنگل میں رات کے وقت بعض پودے بڑی تیزی سے ایک دم بڑھتے ہیں اور یہ آواز ان پودوں کی کسی شاخ کے بڑھنے کی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے شخص نے مجھے اس سے زیادہ رومانٹک بات بیان کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آدھی رات کے بعد اگر ہوا اچانک بند ہو جائے تو جنگل کے بعض درخت ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہیں۔ یہ سرگوشیوں ایسی آواز ان درختوں کے بات کرنے کی ہوتی ہے۔

بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو میرے دل سے جنگل کی راتوں کی دہشت اور ان کا ڈر بالکل اتر چکا تھا۔ اگر کوئی ڈر ہوتا تھا تو صرف جنگلی درندوں اور سانپوں کا ڈر ہوتا تھا کہ کسی طرف سے اچانک نکل کر حملہ نہ کر دیں۔ اس وقت بھی جبکہ میں بانس کے جھونپڑا نما کیبن کے برآمدے میں بیٹھا تھا تو مجھے اس سانپ کا ڈر لگا ہوا تھا جس کی سیٹی کی آواز سن کر میں یہاں آ گیا تھا۔ ڈر یہی تھا کہ کہیں وہ سانپ اپنی مادہ کو لے کر بارش سے بچنے کے لیے اس کیبن میں نہ آ جائے۔ کیوں کہ بارش اتنے زور و شور سے ہو رہی تھی کہ لگتا تھا درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر بہا لے جائے گی۔

میں اسٹول پر بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر برآمدے میں بانس کی جو ریلنگ لگی تھی اس کے پاس آ گیا۔ یہاں بارش کی پھوار میرے منہ پر پڑی تو مجھے جنگل کی گرمی اور حبس والی شام کے بعد یہ ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار بڑی خوشگوار لگی۔ بارش کا پانی بڑے شور کے ساتھ کیبن کی مچان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اندھیرے میں مجھے یہ سیلابی پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر اس کی آواز بارش کی آواز سے الگ سنائی دے رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ کیبن بھی بارش کے سیلاب میں نہ بہہ جائے۔ مگر پانی مچان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ ابھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ برآمدے کے لکڑی کے فرش پر لیٹ کر تھکان دور کرنی چاہیے لیکن سانپوں کے جوڑے کے خوف سے میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ میں واپس اسٹول پر آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد موسلا دھار بارش کا زور ٹوٹ گیا۔ بارش کی آواز بھی ہلکی ہو گئی۔ کوئی ایک منٹ بعد بارش بالکل رک گئی۔ یہ تماشا میں جنگلوں میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ بارش ایک دم شروع ہوتی اور پھر جب رکتی تو ایسے رکتی کہ بادلوں میں سے ایک بوند بھی نیچے نہ گرتی تھی۔ درخت ضرور بارش کے بعد ٹپکتے رہتے تھے۔

بارش کی آواز کے علاوہ مجھے بارش رکنے کے بعد درختوں کے ٹپکنے کی آواز بھی بڑی اچھی لگتی تھی۔ چنانچہ اس وقت بھی جب کہ بارش یکدم رک گئی تھی درختوں پر بارش کا رکا ہوا پانی ٹپکنے لگا تھا اور میں اس آواز کو بڑے شوق سے سن رہا تھا۔ بارش کا سیلابی پانی کا ریلا جو مچان کے نیچے سے بہہ رہا تھا اب اس کی آواز بھی بہت ہلکی ہو گئی تھی۔

اتنے میں مجھے ایک اور آواز سنائی دی جو ان آوازوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس الگ آواز کو کوئی ماہر شکاری کوئی جنگل کا باسی یا میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔ میں جلدی سے اسٹول سے اٹھا اور کیبن کی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ میں برآمدے میں کونے میں تھا جہاں سے کیبن کی دیوار کے ساتھ نیچے اترنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں دیوار کے کونے کے پاس بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ مجھے درختوں کے ٹپکنے اور مچان کے نیچے سے برساتی پانی کے ریلے کے گزرنے کی آوازوں کے علاوہ جو آواز سنائی دی تھی اور جس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا وہ آواز بارش کے پانی میں انسانی قدموں کی آواز تھی۔ کوئی شخص درختوں کے نیچے سے گزر کر کیبن کی طرف آ رہا تھا۔

یہ خاص آواز مجھے کیبن کی طرف آتی سنائی دی تھی۔ مجھے جنگل کی تاریک راتوں کا اندھیرا اب گہرا سیاہ نہیں بلکہ کاسنی رنگ کا لگتا تھا۔ ایسے اندھیرے میں میری آنکھیں بہت کچھ دیکھ لیتی تھیں۔ مجھے اندھیرے میں ایک انسانی سایہ کیبن کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا تاکہ میرے سانس کی آواز پیدا نہ ہو۔

پراسرار سایہ کیبن کی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے سے گزرتا ہوا کیبن کے اندر داخل ہو گیا۔ میں جہاں بیٹھا تھا وہیں دبک کر بیٹھا رہا۔ بانس کی دیوار میرے ساتھ ہی لگی تھی۔ بانسوں کے درمیان جو درزیں ہوتی ہیں میں نے ان کے ساتھ آنکھیں لگا دیں مگر کیبن کے اندر گھپ اندھیرا تھا مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب یہ انسانی سایہ کیبن کے اندر داخل ہوا تھا تو مجھے کچھ ایسا نظر آیا تھا جیسے اس شخص کے ہاتھ میں لمبی رسی ہے جسے وہ بار بار جھٹک رہا تھا۔ میری آنکھیں بانسوں کی دیوار کی ایک درز پر لگی تھیں کہ اچانک کیبن میں روشنی ہوگئی۔ پراسرار انسان نے ایک دیا روشن کر کے فرش پر رکھ دیا تھا۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ انسانی سایہ ایک عورت تھی جب وہ جلتا ہوا دیا فرش پر رکھ رہی تھی تو اس کے سر کے بال نیچے لٹک رہے تھے۔ پھر اس نے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور جلتے ہوئے دیے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اچانک اس نے بائیں ہاتھ کو اوپر کیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کالا سانپ تھا جس چیز کو میں رسی سمجھ رہا تھا وہ سانپ تھا۔ اس عورت نے جو دبلی پتلی تھی اور جس کے جسم پر مجھے صرف ایک ساڑھی نما دھوتی ہی دکھائی دے رہی تھی سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے اپنا دایاں بازو آگے کیا۔ سانپ کے منہ کو اپنے بازو کے قریب لے گئی۔ سانپ نے وہاں بھی ڈس دیا میرے دیکھتے ہی دیکھتے سانپ نے عورت کے جسم کے مختلف حصوں پر چار پانچ مرتبہ ڈسا۔ ہر بار عورت کے حلق سے ہلکی سی آہ نکل جاتی تھی۔ اس کے بعد اس عورت نے اپنی زبان باہر نکالی۔ سانپ کے منہ کو اپنی زبان کے پاس لے گئی۔ سانپ نے اس کی زبان پر بھی ڈس دیا۔ عورت نے زبان اندر کرلی۔ مستی کے عالم میں ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جو مجھے بالکل کسی بچے کے معصوم قہقہے جیسا لگا۔ پھر ایک دم سے اس نے سانپ کی گردن پر زور سے کاٹا۔ سانپ کو دم سے پکڑ کر جھٹکے دیتی ہوئی اٹھی۔ دروازے سے باہر برآمدے میں آئی۔ میں نے چہرہ دیوار کی اوٹ میں کرلیا۔ اس عورت نے برآمدے میں کھڑے ہوکر زور سے سانپ کو جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ کھلے دروازے میں سے آتی دیئے کی مدھم روشنی میں مجھے وہ عورت کسی دوسری دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے۔ سر کے کھلے بالوں کو حال کھیلنے کے انداز میں تین چار مرتبہ آگے پیچھے جھٹکے دیئے اور پھر جیسے نشے میں جھومتی ہوئی واپس کیبن کے اندر چلی گئی۔ میں ایک بار پھر بانسوں کی درمیانی درز میں سے اندر دیکھنے لگا۔

وہ فرش پر جلتے دیئے کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی وہ آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھوم رہی تھی۔ دیئے کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے جسم کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ اچانک مجھے سنتھالی سپیروں کے قبیلے کی زہریلی عورتوں کا خیال آ گیا جن کے بارے میں شاچی سپیرے نے رونگٹے کھڑے کردینے والی باتیں بیان کی تھیں۔ میں نے غور سے آنکھیں درز کے قریب کر کے اسے دیکھا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ لڑکی کلکتے کی بنگالی لڑکی کاجل نہیں تھی جس کی تلاش میں میں جان پر کھیل کر وہاں آیا تھا۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لہرا گیا۔

یہ عورت اگر واقعی سنتھالی سپیروں کی زہریلی لڑکی تھی جسے اپنا مطلب نکل جانے اور لڑکی کے بیکار ہوجانے کے بعد سنتھالی سپیروں نے مرنے کے لیے جنگل میں چھوڑ دیا تھا یا وہ خود ہی سانپوں کو ڈسوانے کی خاطر جنگل میں نکل آئی تھی تو ہوسکتا ہی اسے بنگالی لڑکی کاجل کے بارے میں کچھ پتا ہو اور اس سے مجھے کاجل کا سراغ مل جائے۔ مجھے اتنا اطمینان تھا کہ اس عورت کے پاس اب کوئی سانپ وغیرہ نہیں ہے۔ اگر خطرہ تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ کہیں یہ مجھ پر حملہ نہ کردے۔ کیونکہ شاچی سپیرے نے بتایا تھا کہ سانپوں سے بار بار ڈسوانے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے کہ لڑکی کے سارے جسم میں سانپ کا زہر سرایت کرجاتا ہے۔ اس کا رنگ گہرا سیاہ پڑ جاتا ہے اور پھر کاٹنا تو دور کی بات ہے اگر وہ صرف کسی کا منہ چوم لے تو وہ شخص اس کے زہر کے اثر سے مرجاتا ہے۔ یہ سارے امکانات اور خدشے اور خطرے میرے ذہن میں تھے۔ جب میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس زہریلی لڑکی کے سامنے جانا چاہیے یا نہیں۔ وہ جلتے ہوئے دیئے کے سامنے فرش پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھوم رہی تھی۔ موسلا دھار بارش کے بعد جنگل پر ڈراؤنا سناٹا چھا گیا تھا۔ اس سناٹے میں صرف درختوں کے ٹپکنے کی آواز آرہی تھی۔ بارش کا پانی جو مچان کے نیچے نشیب میں بہہ رہا تھا اس کی آواز بھی مدھم پڑ گئی تھی۔

اس لڑکی کی شکل شباہت سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان کی ہی رہنے والی ہے۔ برما کی رہنے والی نہیں چنانچہ وہ اردو میں نہ سہی مگر ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں مجھ سے ضرور بات کرلے گی اور میری بات سمجھ لے گی۔ اب میں اس زہریلی لڑکی کے سامنے جانے کے لیے تیار تھا۔ میں آہستہ آہستہ سے اٹھا اور کیبن کی دیوار کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ میرے پاؤں میں کینوس کے اس زمانے کے فلیٹ شوز تھے جن کی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر سے دیئے کی دھندلی سی روشنی باہر آرہی تھی۔ میں نے سر آگے کر کے اندر دیکھا۔ زہریلی لڑکی نے گردن گھما کر دروازے کیطرف دیکھا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ لڑکی چیخ مار کر اٹھی اور مجھے کاٹنے کے لیے اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے اس کی کلائیوں کو پکڑ کر اوپر کردیا تا کہ وہ مجھے اپنے دانت بھی نہ مار سکے۔ زہریلی لڑکی کے حلق سے چیخ کی ایسی ہیبت ناک آواز نکلی کہ سارا جنگل لرز گیا۔

میں نے زہریلی لڑکی کو دھکا دے کر نیچے گرادیا اور جیب سے چاقو نکال کر کھول لیا۔ زہریلی لڑکی ہاتھ جوڑ کر کانپنے لگی۔ اس نے بنگلہ اردو کی ملی جلی زبان میں کہا کہ مجھے نہ مارنا میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ کھلا چاقو میرے ہاتھ میں تھا اور میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دیئے کی روشنی میں میرا سایہ بھوت کی طرح دیوار پر پڑ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ میں نے تمہیں اپنے آپ کو سانپ سے ڈسواتے دیکھ لیا ہے۔ کیا تم سنتھالی سپیروں کی عورت ہو؟''

حالانکہ میں جان گیا تھا کہ یہ لڑکی سنتھالی سپیروں کے ظلم وستم کی ستائی ہوئی لڑکی ہے مگر میں اس کی زبان سے اس کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ زہریلی لڑکی بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ سخت ڈری ہوئی تھی۔ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں ایک بدقسمت عورت ہوں۔ چاقو ہٹالو پھر تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔''

میں نے چاقو بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ لڑکی ساڑھی سے اپنے سیاہ بدن کو ڈھانپتے ہوئے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میں بھی اس سے تین چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

''اب بتاؤ تم کون ہو اور اس جنگل میں کیسے آ گئی ہو۔ تمہاری زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ تم بنگال کے کسی شہر کی رہنے والی ہو۔''

زہریلی لڑکی اپنے بالوں کو پیچھے باندھتے ہوئے بولی۔

''میرا نام پاروتی ہے۔ میں کلکتے کے پاس ایک قصبے درگاپور میں اپنے ماتا پتا کے گھر میں رہتی تھی اور اسکول میں ٹیچر تھی۔ ایک روز ہمارے محلے میں ایک

سنتھالی سپیرا آیا۔ وہ سانپوں کا تماشا دکھاتا تھا۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا کہ تم پر ناگ دیوتا مہربان ہوگئے ہیں۔ تم بڑی بھاگیہ وتی ہو۔ یہ سپیرا ہمارے گھر آ کر میرے ماتا پتا جی سے بھی ملا اور انہیں بھی بتایا کہ ناگ دیوتا نے مجھے پسند کرلیا ہے۔ میرے ماتا پتا پڑھے لکھے ہونے کے باوجود سخت توہم پرست تھے۔ انہوں نے سنتھالی سپیرے کی بڑی آؤ بھگت کی اور کہا کہ ناگ دیوتا سے کہہ کر ہماری بیٹی کی کسی اچھی جگہ شادی کرادو۔ سنتھالی سپیرے نے کہا کہ لڑکی کو درگا پور کے ناگ مندر میں لے جا کر پرارتھنا کرانی ہوگی۔ وہ مجھے ناگ مندر میں لے گیا۔ میرے ماتا پتا بھی ساتھ تھے۔ سپیرے نے انہیں مندر کی ڈیوڑھی میں بٹھا دیا اور مجھے ایک کوٹھڑی میں لے جا کر کوئی چیز سنگھائی جس سے میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں ایک بیل گاڑی میں بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ ایک سنتھالی سپیرا اور دو عورتیں میرے پاس بیٹھی میری نگرانی کر رہی تھیں۔ بیل گاڑی ایک جنگل سے گزر رہی تھی میں بہت روئی۔ بہت چیخی چلائی۔ ان لوگوں نے مجھے زبردستی کوئی چیز سنگھا کر دوبارہ بے ہوش کردیا۔ یہ سنتھالی سپیرے تھے۔ یہ مجھے اپنے ڈیرے پر لے آئے جو اس جنگل میں پتوارا کھی کی پہاڑیوں میں ہے۔ یہاں لا کر انہوں نے مجھے نشے پر لگا دیا۔ پہلے وہ مجھے کچھ پلاتے تھے پھر ہر ہفتے ایک سانپ سے مجھے ڈسواتے۔ ہوتے ہوتے میں بھی نشے کی عادی بن گئی۔ دن میں دو بار مجھے سانپ سے ڈسوانے لگے۔ پھر میری ایسی حالت ہوگئی کہ میں رو رو کر ہاتھ جوڑ کر انہیں کہتی کہ مجھے سانپ سے ڈسواؤ۔ مجھے سانپ سے ڈسوا کر وہ مجھ سے ہر قسم کی مشقت لیتے تھے مگر مجھے کوئی ہوش نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح تین برس بیت گئے۔ میرا سارا جسم سانپوں کے زہر سے سیاہ پڑ گیا۔ میرے جسم پر سانپوں کے کاٹنے کے بے شمار نشان پڑ گئے۔ میرا خون زہر بن گیا۔ تب ان سپیروں نے مجھے ڈیرے سے نکال کر جنگل میں پھینک دیا۔ اب میں دن رات اس جنگل میں بھٹکتی پھرتی ہوں اور سانپوں کو تلاش کرتی رہتی ہوں۔ جہاں کہیں کوئی سانپ نظر آتا ہے وہیں اس کو پکڑ لیتی ہوں۔ پہلی بار وہ مجھے خود ڈستا ہے دوسری بار میں خود اسے ڈسواتی ہوں۔ دن میں دس دس بارہ بارہ سانپ مجھے ڈستے ہیں۔ مجھے بھوک زیادہ لگے تو میں سانپ کو ہی کھا جاتی ہوں......"

وہ اپنی دردناک کہانی سناتے سناتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ مگر معاملہ حد سے گزر چکا تھا۔ اب میں اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا پھر بھی میں نے ازراہ ہمدردی اس سے کہا۔

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں تمہارے ماں باپ کے پاس پہنچا دوں؟"

لڑکی روتے روتے چپ ہوگئی۔ ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"اب میں گھر جانے کے لائق نہیں رہی میں ایک ایسی ناگن بن گئی ہوں جو دوسری ناگنوں اور سانپوں کو کھا کر زندہ رہ رہی ہے۔ میں واپس انسانوں کی دنیا میں نہیں جاسکتی۔"

اور وہ لڑکی سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ میں اسے کیا تسلی دیتا؟ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ انسانوں کی دنیا میں جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک زہریلی ناگن بن گئی تھی اور اسے کچھ روز بعد انہی جنگلوں میں اپنے ہی زہر سے مر جانا تھا۔ شانجی سپیرے نے مجھے بتایا تھا کہ ایسی زہریلی عورتوں کی پھر یہ حالت ہوجاتی ہے کہ ان پر سانپ کے زہر کا بھی نشہ نہیں ہوتا۔ پھر وہ بچھوؤں سے ڈسوانے لگتی ہیں۔ تب ان کے خون میں اتنا زہر بھر جاتا ہے کہ ان کا جسم اچانک پھٹ جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہیں۔

رونے سے اس لڑکی کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"تم کون ہو؟ تم بھی اپنی بھاشا سے ادھر کے آدمی نہیں لگتے۔ ان جنگلوں میں کیسے آئے ہو؟ کیا تم کوئی شکاری ہو؟"

اب میں نے اسے ساری کہانی بیان کردی اور اسے کہا کہ میں کلکتے کی بنگالی لڑکی کاجل کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ زہریلی لڑکی نے میری بات سن کر کہا۔

"کچھ دن ہوئے سنتھالی سپیرے ایک بنگالی لڑکی کو پکڑ کر لائے تھے۔ دو راتیں اسے برگد کے درخت والے ناگ دیوتا کے مندر کی کوٹھڑی میں بند رکھا۔ پھر اسے اراکان کے بڑے ڈاک بنگلے کی طرف لے گئے تھے۔ وہ لڑکی کاجل ہی ہوگی۔"

جب میں نے اسے کاجل کا حلیہ بتایا تو وہ کہنے لگی۔

"ہاں اس لڑکی کا یہی حلیہ تھا۔ مگر اس کے ماتا پتا اس کے ساتھ نہیں تھے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ اراکان کا بڑا ڈاک بنگلہ کہاں ہے اور وہاں کون رہتا ہے۔ سنتھالی سپیرے کاجل کو وہاں کس لیے لے گئے ہیں؟"

زہریلی لڑکی نے حلق سے سانپ کی پھنکار ایسی آواز نکالی۔ کہنے لگی۔

"سنتھالی سپیروں نے مجھ پر بھی بڑے ظلم کیے ہیں۔ اراکان کے ڈاک بنگلے میں بھی اس لڑکی پر ظلم و تشدد کیا جائے گا۔"

میں نے پوچھا یہ ڈاک بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہ بولی۔

"تم اتنی دور کلکتہ شہر سے اس لڑکی کی تلاش میں آئے ہو۔ کیا تم اس سے پریم کرتے ہو؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"یہی سمجھ لو کہ میں اس سے پریم کرتا ہوں۔"

زہریلی لڑکی سر جھکا کر فرش پر جلتے چراغ کی لو کو تکنے لگی۔ پھر چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"میں تمہیں خود لے کر ڈاک بنگلے جاؤں گی۔ وہ پہاڑیوں میں ایسی جگہ پر ہے جہاں تم اسے تلاش نہیں کرسکو گے۔ میں وہاں تین بار جاچکی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم اتنا خطرناک پہاڑی راستہ میرے ساتھ کیسے چلو گی؟ تمہارے تو پاؤں میں جوتا بھی نہیں ہے؟"

زہریلی لڑکی مسکرائی، کہنے لگی۔

"میرے پاؤں انہی جنگلوں میں پھرتے پھرتے پتھر کے مافق سخت ہوگئے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میرا تمہارے ساتھ جانا ضروری ہے۔ تم اکیلے گئے تو پہاڑیوں میں بھٹک جاؤ گے۔"

میں نے سوچا کہ اگر یہ میرے ساتھ چلنے پر ضد کر رہی ہے تو اس میں میرا ہی فائدہ ہے۔ کم از کم یہ مجھے صحیح جگہ پر تو پہنچا دے گی۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے پاروتی! تم میرے ساتھ چلو گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کیبن کے دروازے کی طرف بڑھی اور کہا۔

"تم یہیں رہنا۔ میں صبح کو آؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ کیبن کے فرش پر دیا جل رہا تھا۔ رات کافی باقی تھی۔ میں وہیں لکڑی کے فرش پر لیٹ گیا۔ بارش میں بھیگے ہوئے جنگل میں گہری خاموشی طاری

تھی کسی پتے کے ہلنے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں کاجل کے بارے میں سوچنے لگا کہ خدا کرے وہ مجھے اراکان کے ڈاک بنگلے میں مل جائے۔ یہی سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا مجھے بازو سے ہلا کر جگا رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ زہریلی لڑکی پاروتی تھی وہ میرے لیے دو چار جنگلی کیلے اور اناس لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ کھالو۔ پھر ہم چلیں گے۔"

میں نے چاقو سے اناس چھیل کر کھایا اور تین کیلے کھائے۔ پاروتی سے پوچھا کہ اس نے بھی کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔ وہ بڑے پراسرار انداز میں بولی۔

"میں جو کھاتی ہوں وہ میں نے کھالیا ہے تم اب میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر پہاڑی سفر پر چل پڑی۔ وہ سارے پہاڑی راستوں کو جانتی تھی۔ رات بھر کی بارش کی وجہ سے گھاس گیلی ہو رہی تھی۔ بانس کے درختوں پر سے بارش کا رکا ہوا پانی ابھی تک ٹپک رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ مرطوب فضا میں طرح طرح کے جنگلی سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ یہ سارا نیم پہاڑی علاقہ تھا اور جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ انڈیا کے شمالی بارڈر کے ساتھ ملا ہوا برما کا پہاڑی علاقہ تھا۔ یہ اراکان کی پہاڑیاں تھیں اور یہاں کئی مسلمان قبیلے آباد تھے۔ یہ قبیلے جنگلوں میں رہتے تھے۔ ابھی تک ہمیں اس قبیلے کا کوئی آدمی نہیں ملا تھا۔

زہریلی لڑکی شارٹ کٹ راستوں پر جا رہی تھی۔ وہ میرے آگے آگے تھی۔ اس کے بال پیچھے گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ جسم پر کاسنی رنگ کی ساڑھی تھی۔ دن کے اجالے میں دیکھا تو اس لڑکی کا رنگ گہرا جامنی تھا۔ بازوؤں پر جگہ جگہ سانپوں کے ڈسوانے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ ایک بات کا مجھے خطرہ شروع ہی سے لگا ہوا تھا' یہ دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام تھے۔ برما پر جاپان کا قبضہ تھا اور شمال میں جاپانی فوجیں آسام کی سرحدوں پر انگریزوں کی انڈین فوجی یونٹوں سے گھمسان کی جنگ کر رہی تھیں۔ ہم برما کی سرحد کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں غلطی سے ہم جاپانی فوج کے مورچوں کی طرف نہ نکل جائیں۔

جب میں نے پاروتی سے اس خطرے کا ذکر کیا تو اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"ادھر جنگ وغیرہ کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم مت گھبراؤ۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ زہریلی لڑکی دنیا کے جنگی اور سیاسی حالات سے بالکل بے خبر ہے۔ بہر حال میں بہت چوکنا ہو کر چل رہا تھا۔ چھریرے بدن کی یہ دبلی پتلی زہریلی لڑکی پاروتی بغیر تھکے چلی جا رہی تھی۔ پہاڑی راستوں پر چلتے ہوئے آدمی بہت جلدی تھک جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں اترائیاں چڑھائیاں بہت ہوتی ہیں۔ ایک پہاڑی وادی سے نکل کر ہم دوسری وادی میں داخل ہوئے تو میں نے پاروتی سے پوچھا کہ ابھی ڈاک بنگلہ کتنی دور ہے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی' پھر بولی۔

"کیا تم تھک گئے ہو؟"

پھر اس نے سامنے والی پہاڑی کی نشیب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ڈاک بنگلہ وہاں ہے۔ ہم شام ہونے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔ کیا تمہیں بھوک پیاس لگی ہے؟"

میں بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔

"بھوک تو نہیں لگی مگر ہاں پیاس ضرور لگ رہی ہے۔"

زہریلی لڑکی نے ادھر ادھر دیکھا پھر بولی۔

"میرے ساتھ آؤ وہاں پانی کا تالاب ضرور ہوگا۔ مجھے اسی طرف سے پانی کی ٹھنڈی ہوا آتی محسوس ہوتی ہے۔"

اس لڑکی کو جنگل نے شاید اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ جنگل اسے اپنی تمام نعمتوں' اپنے تمام خطروں سے آگاہ کر دیتا تھا۔ ہم ایک طرف درختوں کی جھنڈ میں گئے تو وہاں واقعی ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی بہہ رہی تھی۔ بڑا شفاف پانی تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا۔ سیر ہو کر پانی پیا۔ زہریلی لڑکی بھی منہ ہاتھ دھونے لگی پھر اس نے ہرنی کی طرح ندی کی سطح سے منہ لگا کر پانی پیا۔ میں نے کہا۔

"پاروتی! تم اس طرح کیوں پانی پیتی ہو؟"

وہ بولی۔

"جنگل کی دھرتی میری ماتا ہے۔ جس طرح بچہ ماتا کے سینے سے منہ لگا کر دودھ پیتا ہے اسی طرح میں دھرتی ماں کے سینے پر منہ رکھ کر پانی پیتی ہوں۔"

پانی پی کر وہ میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔ جس طرح جنگل میں میں محتاط ہو کر چل رہا تھا پاروتی اس کے مقابلے میں ایک جنگلی ہرنی کی طرح پوری آزادی اور بے فکری سے چل رہی تھی۔ وہ مجھ سے کاجل کے بارے میں پوچھنے لگی کہ اس کی عمر کتنی ہے؟ کیا اس کے بال بھی میری طرح لمبے ہیں؟ تم اس سے کتنا پریم کرتے ہو؟ مجھے اس کے اس قسم کے سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بس ہوں ہاں کہہ کر جواب دیئے جا رہا تھا۔ اتنے میں وہ بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا کہ یہ اچانک چپ کیوں ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اتنے میں درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں ان میں سے کالے رنگ کا ایک لمبا سانپ نکل کر میری طرف بڑھا۔ زہریلی لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

"اپنی جگہ سے ہلنا مت۔ نہیں تو یہ بھاگ جائے گا۔"

سانپ نے اپنی گردن گھاس میں تھوڑی سی اوپر اٹھا رکھی تھی اور لہراتا ہوا آہستہ آہستہ رینگتا میری طرف آرہا تھا۔ خدا جانے وہ میری ہی طرف کیوں آرہا تھا۔ جب وہ مجھ سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر آ گیا تو اس نے گردن اوپر اٹھا کر اپنا پھن پھیلا دیا۔ اب سانپ نے اپنا منہ زہریلی لڑکی کی طرف پھیر لیا تھا۔ زہریلی لڑکی کے چہرے پر ایسی مسرت اور خوشی کے اثرات تھے جیسے اسے کوئی انمول شے مل گئی ہو۔ سانپ اپنی جگہ پر پھن اٹھائے کنڈلی مارے بیٹھا زہریلی لڑکی کو مسلسل تک رہا تھا۔

میرے دیکھتے دیکھتے زہریلی لڑکی نے اپنا ہاتھ سانپ کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے اسے پیار کرنا چاہتی ہو۔ سانپ نے بھی ایسی تیزی کے ساتھ زہریلی لڑکی کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ لڑکی نے اپنا ہاتھ پیچھے نہ کیا بلکہ دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف کر دیا۔ سانپ نے اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی ڈس لیا۔ اب اس نے سانپ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زمین پر سے اٹھا لیا اور اسے اپنی گردن کے قریب لے آئی۔ سانپ نے اس کی گردن پر بھی ڈس لیا۔ مجھے نہیں معلوم سانپ ایک بار ڈس کر زہر خارج کرتا ہے کہ دوسری بار ڈس کر زہر خارج کرتا ہے یا نہیں لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ سانپ زہریلی لڑکی کے جسم پر بار بار ڈس رہا تھا اور لڑکی خوش ہو کر مسکرائے جا رہی تھی اور

سانپ سے پیار و محبت کی باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ یہ بڑا دہشت ناک منظر تھا۔ میں پیچھے ہٹ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس منظر کو خوفزدہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔ جب سانپ ڈستے ڈستے نڈھال ہوگیا تو زہریلی لڑکی پاروتی نے سانپ کو اپنی گردن میں ڈالا۔ اس کا سر ہاتھ میں پکڑا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

اور وہ سانپ کو لے کر درختوں کے پیچھے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کا منہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں مزید خوفزدہ ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی نے سانپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ کہنے لگی۔

"میں تمہارے سامنے سانپ کو کھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اسے لے کر درختوں کے پیچھے چلی گئی تھی۔"

میں بت بنا اس لڑکی کا منہ تک رہا تھا جس کو سپیروں نے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے بعد انسان سے حیوان بلکہ حیوان سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ کہنے لگی۔

"اگر میں تمہارے پاس نہ بیٹھی ہوتی تو اس سانپ نے تمہیں ڈس لینا تھا۔ یہ بڑا زہریلا سانپ تھا۔ ٹھہرو میں پانی پی کر ابھی آتی ہوں۔ میرے جسم میں اس زہریلے سانپ نے آگ سی لگا دی ہے۔"

وہ دوڑ کر ندی کی طرف چلی گئی۔ پانی پی کر واپس آئی تو اپنے بالوں کا جوڑا باندھتے ہوئے کہنے لگی۔

"اب مجھے رات تک بھوک نہیں لگے گی۔ ایسا سانپ اس جنگل میں کبھی کبھار ہی ہاتھ آتا ہے۔ چلو آگے چلتے ہیں۔"

وہ آگے آگے اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

ہم گھاٹیوں اور کھڈوں میں سے گزرتے ہوئے دوپہر کے وقت اس پہاڑی کی نشیب میں آ گئے جہاں اراکان والا ڈاک بنگلہ تھا۔ بنگلے کی ڈھلانی سرخ چھت دور سے نظر آ رہی تھی۔ زہریلی لڑکی نے اس طرف اشارہ کیا۔

"وہ ہے ڈاک بنگلہ۔ اگر تمہارے بھاگ میں ہوگا تو کاجل تمہیں وہاں مل جائے گی مگر میں جانتی ہوں وہ جس حالت میں تمہیں ملے گی شاید تم اسے قبول نہ کر سکو گے۔"

میں نے چلتے ہوئے کہا۔

"سوال میرے قبول یا نہ قبول کرنے کا نہیں ہے میں تو اس لڑکی کو کلکتے اس کے گھر واپس لے جانا چاہتا ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے جنگل میں بڑا حبس تھا۔ بادل جھکے ہوئے تھے۔ پھر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ زہریلی لڑکی نے درختوں میں سے نظر آنے والے بادلوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"شاید بادل برسیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں جلدی ڈاک بنگلے تک پہنچ جانا چاہیے۔"

وہ ہنس کر بولی۔

"کیوں؟ کیا تمہیں جنگل کی برکھا اچھی نہیں لگتی؟ مجھے تو برکھا بڑی اچھی لگتی ہے۔ جنگل میں جب بارش ہوتی ہے تو میں بارش میں نکل آتی ہوں۔"

ہم اس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جس کے نشیب میں تھوڑا اوپر جا کر ڈاک بنگلہ بنا ہوا تھا۔ چڑھائی زیادہ دشوار نہیں تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرنا پڑ رہا تھا جب ہم ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں آئے تو سامنے کھلی جگہ میں ڈاک بنگلے کا برآمدہ اور لکڑی کے کیبن نما کمروں کی کھڑکیاں اور دروازہ نظر آیا۔ میں آگے بڑھنے لگا تو زہریلی لڑکی نے مجھے

کلائی سے پکڑ کر پیچھے کر لیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے پاروتی؟ کیا پھر کوئی سانپ نظر آیا ہے؟"

پاروتی خود بھی درختوں کے پیچھے ہوگئی اور مجھے بھی قریب کر لیا۔ وہ درخت کے تنے کی اوٹ میں ڈاک بنگلے کے برآمدے اور سامنے جو چھوٹا سا صحن تھا اسی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے ڈاک بنگلے سے کسی انسان کی بو نہیں آ رہی۔"

زہریلی لڑکی پاروتی میں سانپوں سے ڈسواتے ڈسواتے سانپوں ایسی خصوصیات پیدا ہوگئی تھیں۔ جس طرح سانپ کو دور سے انسان کی موجودگی کا احساس ہو جاتا ہے اسی طرح پاروتی بھی دور سے اجنبی یا غیر اجنبی انسان کی بو سونگھ لیتی تھی۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے کاجل کو سپیرے کسی دوسری جگہ لے گئے ہوں اور کچھ دیر بعد واپس ڈاک بنگلے میں آ جائیں۔ ہمیں چل کر دیکھنا چاہیے۔"

زہریلی لڑکی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"سپیرے کاجل کو ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے کسی سرکاری عہدے دار کے پاس ہی لائے تھے وہ اسے یہاں سے کہیں اور کہاں لے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی ہمیں ڈاک بنگلے میں جا کر دیکھنا چاہیے۔"

اس نے کہا۔ "پہلے میں جاتی ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ مجھے اندر کوئی خطرہ لگتا ہے۔"

بہرحال میں وہیں رک گیا۔ پاروتی درختوں کے عقب سے ہو کر ڈاک بنگلے کی طرف نکل گئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ صحن میں سے گزر کر برآمدے میں آئی۔ سامنے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر دروازے کو کھول کر اندر چلی گئی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے واپس برآمدے میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ زہریلی لڑکی پاروتی کمرے سے باہر آئی۔ اس نے دور سے مجھے چلے آنے کا اشارہ کیا۔ میں جلدی جلدی چلتا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے کہا۔

"ڈاک بنگلہ خالی پڑا ہے۔ چلو کچن میں چل کر دیکھتے ہیں۔ وہاں اندازہ ہوگا کہ یہاں کوئی آدمی رہتا ہے یا نہیں۔"

کچن ڈاک بنگلے کے پیچھے عمارت کے احاطے میں الگ کیبن کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ کچن بھی خالی تھا۔ ایسے کوئی آثار نہیں تھے کہ وہاں کسی نے کھانا وغیرہ پکایا ہو۔ چولہا بھی ٹھنڈا تھا۔ ہم واپس ڈاک بنگلے میں آ گئے۔ ڈاک بنگلے کے چار چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ پرانا فرنیچر ہر کمرے میں موجود تھا۔ بیڈروم میں بڑا سا پلنگ بغیر بستر کے خالی تھا۔ ہم خالی ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے زہریلی لڑکی سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔ کاجل یہاں لائی بھی گئی ہے یا نہیں؟"

وہ کہنے لگی۔ "اسے دو سنتھالی سپیرے یہاں ضرور لائے تھے۔ اس کا مجھے یقین ہے۔"

"تو پھر وہ کہاں غائب ہوگئی؟"

میں نے حیرانی سے سوال کیا۔ زہریلی لڑکی اس طرح بار بار اوپر کو سانس کھینچنے لگی جیسے فضا میں کسی خاص شے کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کیا بات ہے پاروتی؟"

پاروتی نے آہستہ سے کہا۔

"میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

اور وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔
میں زہریلی لڑکی پاروتی کے پیچھے پیچھے تھا۔
وہ اسی طرح فضا میں کسی چیز کی بو سونگھتی برآمدے کے کونے والی کوٹھڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ کہنے لگی۔
"اس کوٹھڑی کے اندر سنتھالی سپیروں کا کوئی سانپ موجود ہے۔ میں اپنے سانپوں کی بو پہچانتی ہوں۔"
میں نے کہا۔ "کوٹھڑی کے دروازے پر تالا پڑا ہے۔"
وہ بولی۔ "اسے توڑ دو۔"
میں ایک پتھر ڈھونڈھ کر لے آیا پھر پتھر کو تالے پر دو تین بار زور سے مارا۔ تالا ٹوٹ گیا۔ زہریلی لڑکی نے مجھے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔
"تم آگے مت آنا۔"
اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی اندر سے کسی سانپ کے پھنکار مارنے کی آواز بلند ہوئی۔ میں مزید ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ زہریلی لڑکی کوٹھڑی میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک سانپ پکڑا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔
"یہ ہمارے سنتھالی سپیروں کا سانپ ہے۔ میں اس کی بو پہچانتی ہوں۔ ہمارے سپیرے جب کسی اغوا کی ہوئی لڑکی کو یہاں لے کر آتے ہیں تو جاتے وقت اپنا ایک سانپ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ سانپ اس لڑکی کی رکھوالی کرتا ہے اور اگر لڑکی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے ڈس لیتا ہے۔"
میں نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے مگر سوال یہ ہے کہ کاجل کہاں ہے؟"
زہریلی لڑکی نے سانپ کو اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ سانپ اسے بالکل نہیں ڈس رہا تھا۔ وہ مجھے واپس دوسرے کمرے میں لے آئی۔ ہم بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے کہنے لگی۔
"مجھے ایسے لگتا ہے کہ کاجل کو کسی دوسرے جنگلی قبیلے کے سپیرے اٹھا کر لے گئے ہیں۔"
میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔
"یہ تم نے کیا ایک نئی کہانی شروع کر دی ہے۔" زہریلی لڑکی نے کہا۔
"مجھے تو ایسے ہی لگتا ہے جاتے جاتے وہ لوگ باہر والی کوٹھڑی کو تالا لگا گئے۔ یہ سانپ اسی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ وہ وہیں بند ہو گیا۔"
میں نے اس سے پوچھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بولی۔
"ہمیں اس قبیلے کی تلاش میں جانا پڑے گا۔ جس کے لوگ تمہاری کاجل کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔"
"اتنے لمبے چوڑے پہاڑی علاقے میں ہم ان لوگوں کو کیسے تلاش کریں گے؟"
میں نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ وہ کہنے لگی۔
"تم کاجل سے پریم کرتے ہو۔ تمہیں تو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اب میں اپنی سانپ کی سونگھنے کی طاقت سے کام لوں گی اور وہ لوگ جہاں کہیں ہوں گے انہیں ڈھونڈھ لوں گی۔"
ہم باتیں کر رہے تھے کہ بادلوں میں ہلکی گرج پیدا ہوئی۔ وہ کہنے لگی۔
"بڑے زور کی بارش آ رہی ہے۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے لیے جنگل سے کچھ کھانے کو لے کر آتی ہوں۔ میرے لیے تو یہ سانپ کافی ہو گا۔"
وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میں دروازے میں آ کر اسے دیکھنے لگا۔ سانپ اس کی گردن میں لپٹا ہوا تھا اور وہ جنگل کی ہرنی کی طرح لمبی لمبی چھلانگیں لگاتی درختوں جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ اتنے میں بادل زور سے گرجا اور درختوں کے پتوں اور ڈاک بنگلے کی کھپریل کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے کی آواز آنے لگی۔ میں برآمدے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن کی روشنی آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگی تھی۔ بارش شروع ہو گئی۔ جنگلوں پہاڑوں کی بارش نے مجھے ہمیشہ مسحور کیا ہے۔ برآمدے کی چھت پر جو پتھر کی سلیٹیں لگی ہوئی تھیں ان پر بارش کی آواز زیادہ شور مچا رہی تھی۔ زہریلی لڑکی کو گئے دس پندرہ منٹ گزر گئے تھے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ جنگلی حیوانوں کی طرح کی ہو گئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہی خطرہ ہو سکتا تھا کہ کوئی سانپ بچھو نہ اسے کاٹ لے۔ وہ اس خطرے سے بے نیاز تھی اور سانپ بچھو خود اس کی خوراک بن چکے تھے۔
بارش خوب برس رہی تھی کہ میں نے زہریلی لڑکی کو درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں جنگلی کیلوں کا پورا گچھا پکڑ رکھا تھا۔ جامنی رنگ کی لڑکی، کاسنی رنگ کی ساڑھی اور زرد رنگ کے کیلوں کا گچھا...... یہ پال گوگین کی کلر اسکیم تھی۔ وہ مجھے تہیٹی کے جزیرے میں پال گوگین کی بنائی ہوئی کوئی تصویر لگ رہی تھی۔
وہ بارش میں بھیگتی ہوئی بڑے آرام سے چلتی تھوڑا تھوڑا مسکراتی برآمدے میں آ گئی۔ کیلے کا گچھا اس نے برآمدے کے لکڑی کے فرش پر رکھ دیا اور اپنے بال نچوڑتے ہوئے بولی۔
"یہاں سوائے جنگلی کیلوں کے مجھے اور کچھ نہیں ملا۔ ویسے کچن میں میں نے ایک مرتبان میں کچے چاول دیکھے تھے۔ میں تمہیں رات کو چاول بھی بنا دوں گی۔" میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ بدقسمتی اسے کہاں سے کہاں لے آئی ہے۔ اگر اس کے ماتا پتا توہم پرست نہ ہوتے اور سنتھالی سپیروں کی جاہلانہ باتوں میں نہ آتے تو یہ لڑکی آج درگاپور کے کسی کالج سے بی اے کر چکی ہوتی ہو سکتا ہے اس کی شادی ہو گئی ہوتی اور یہ اپنے خاوند اور بچے کے ساتھ خوشی خوشی اپنے گھر میں زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ یہ ایک بچے کی ماں ہوتی۔ ایک خدمت شعار بیوی ہوتی لیکن اس کے ماں باپ کی جہالت نے اس کو اس حال میں پہنچا دیا ہے کہ یہ حیوانوں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہی ہے اور کوئی پتا نہیں اس کے جسم میں رچا ہوا زہر کب اسے ہلاک کر ڈالے۔ زہریلی لڑکی برآمدے کے فرش پر بیٹھی اپنے گیلے بالوں کو جھٹک کر سکھا رہی تھی۔ اس نے بالوں کو گردن کے پیچھے باندھ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سانپ وہ لے کر گئی تھی وہ اب اس کے پاس نہیں ہے۔
میں نے سانپ کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولی۔
"مجھے بھوک لگی تھی۔"
میں ڈر گیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں ایک ناگن خور عورت کے پاس نہیں بیٹھا ہوں بلکہ آدم خور ناگن کے پاس بیٹھا ہوا ہوں اور یہ آج رات جب میں سو جاؤں گا تو مجھے بھی کھا جائے گی۔
دیکھتے دیکھتے دن کی روشنی ڈوب گئی اور شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔
"آج کی رات تو ہمیں اسی ڈاک بنگلے میں بسر کرنی پڑے گی۔ کل موسم ٹھیک ہوا تو کاجل کی تلاش میں آگے چلیں گے۔"
وہ گردن جھکائے میری طرف بڑی پراسرار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔
"ہاں..... آج کی رات یہیں رہنا ہو گا۔"
میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کچھ کیلے کھا کر جو تھوڑی بہت بھوک لگی تھی اسے ختم کیا اور اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔ ہر کمرے میں مٹی کے

تیل کا بڑی چمنی والا لیمپ پڑا تھا۔ میں لیمپ جلانے لگا تو زہریلی لڑکی نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا۔

"لیمپ نہ جلاؤ۔ اس کی روشنی دور سے نظر آ جاتی ہے۔ مجھے اب بھی یہاں خطرہ لگتا ہے۔"

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اسے خالی ڈاک بنگلے میں ابھی تک کون سا خطرہ نظر آ رہا ہے۔ بہرحال مجھے اس کی چھٹی حس کا اعتبار تھا۔ میں نے کہا۔

"اگر لیمپ نہ جلایا تو اندھیرا ہو جائے گا۔"

وہ کہنے لگی۔ "کچن میں چل کر دیکھتے ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی موم بتی ضرور مل جائے گی۔"

ہم کچن میں آ گئے۔ یہ پرانے ٹائپ کا کچن تھا۔ دیوار میں ایک جانب پتھر کے شیلف بنے ہوئے تھے۔ یہاں ایک ڈبے میں ہمیں تین چار موم بتیاں مل گئیں۔ ہم انہیں لے کر بیڈروم میں آ گئے۔ میں نے ایک موم بتی جلا کر کارنس پر لگا دی اور زہریلی لڑکی سے کہا۔

"تم پلنگ پر سو جانا۔ میں دوسرے کمرے میں سوفے پر جا کر سو جاتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔ "تم نئے نئے شہر سے آئے ہو۔ اس قسم کی تکلیفوں کے عادی نہیں ہو۔ تم پلنگ پر سونا۔ میں تو جنگل میں بھی جا کر رات کاٹ لوں گی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کے باوجود بھی مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ برآمدے میں یا دوسرے کمرے میں سوفے پر رات کو سوئے۔ وہ پہلے تو ضد کرتی رہی پھر میرے اصرار پر مان گئی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے کہا۔

"اندر سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا لینا۔"

یہ کہہ کر میں دوسرے کمرے میں آ کر سوفے پر لیٹ گیا۔ یہاں میں نے کھڑکی کے نیچے دیوار کے ساتھ اس طرح موم بتی روشن کر دی تھی کہ باہر سے اس کی روشنی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے سوفا کھلے دروازے کے آگے کر لیا۔ یہاں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی آ رہے تھے اور بارش کی آواز بھی زیادہ قریب سے سنائی دیتی تھی۔ میرا ذہن کاجل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سپیرے اگر اسے اس ڈاک بنگلے میں لائے تھے تو پھر یہاں سے آگے اسے کہاں لے گئے ہیں۔ اگر بقول زہریلی لڑکی کے اسے سنتھالی سپیرے نہیں بلکہ کسی دوسرے قبیلے کے لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں تو وہ کس حال میں ہوگی۔

یہی سوچتے سوچتے اور بارش کی آواز سنتے سنتے مجھ پر نیند طاری ہونے لگی۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ نہ جانے میں کتنی دیر سویا رہا تھا کہ اچانک کسی نے میرا بازو ہلا کر مجھے جگا دیا۔ میں نے کونے والی موم بتی کی روشنی میں دیکھا کہ زہریلی لڑکی پاروتی مجھے جگا رہی تھی۔

"جلدی سے اٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔"

اس کے بعد اس نے دوڑ کر کونے والی موم بتی بجھا دی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں سوفے پر سے اٹھ کھڑا ہو سوچنے لگا۔ خدا جانے کیا مصیبت آ گئی ہے۔ بارش کی آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ اندھیرے میں پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس کے کمرے کی موم بتی بجھی ہوئی تھی۔ وہاں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"بات کیا ہوئی ہے؟ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

وہ آہستہ سے بولی۔

"میں نے کچن کی پچھلی طرف دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنی ہے۔ وہ کسی اور ہی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔"

میرے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے ایک دم تیز ہو گئی۔ جس بات کا مجھے شروع ہی سے دھڑکا لگا ہوا تھا وہ بات پوری ہو رہی تھی۔ یہ لوگ سوائے جاپانی سپاہیوں کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی کو یہ بات بالکل نہ بتائی۔ میں نے اسے کہا۔

"تم جلدی سے سانپ والی کوٹھڑی میں چلی جاؤ۔ میں وہیں آتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ مگر میں نے اسے زبردستی اس کوٹھڑی کی طرف بھیج دیا جہاں سے سانپ نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بیڈروم کے عقبی دروازے سے نکل کر ڈاک بنگلے کے پچھلے برآمدے میں آ کر ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ مجھے کسی انسانی قہقہے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ کسی دوسرے نے جواب میں کچھ کہا۔ یہ اجنبی زبان تھی۔ میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچن کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ یہ آوازیں کچن کی طرف سے آ رہی تھیں۔ پھر اچانک کچن میں روشنی ہو گئی۔ میں جلدی سے دروازے کے اندر ہو گیا۔ کسی نے کچن میں پیٹرومائٹ کا لیمپ جلا دیا تھا۔ کچن کی کھلی کھڑکی کا رخ برآمدے کی طرف تھا۔ کھڑکی میں سے مجھے دو جاپانی سپاہی نظر آئے جو ادھر ادھر چیزوں کی تلاشی لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ میں وہیں سے واپس مڑا اور بیڈروم کے اندھیرے میں دبے پاؤں مگر تیز تیز چلتا سامنے والے برآمدے میں سے گزر کر سانپ والی کوٹھڑی میں آ گیا۔ یہاں بھی اندھیرا تھا۔ زہریلی لڑکی اندر موجود تھی۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"جاپانی فوج اس علاقے میں داخل ہو گئی ہے کچن میں دو جاپانی سپاہی موجود ہیں۔ ہمیں یہاں سے ابھی بھاگ جانا چاہیے۔"

زہریلی لڑکی بولی۔

"اس کوٹھڑی کے پیچھے برساتی نالا ہے۔ وہاں چٹانوں کے اندر ایک سرنگ ہے۔ میں نے وہ سرنگ دیکھی ہوئی ہے۔ ہم وہاں جا کر چھپ جاتے ہیں۔ جب یہ جاپانی یہاں سے چلے جائیں گے تو ہم باہر نکل آئیں گے۔"

اس وقت میری عقل پر بھی پردہ پڑ گیا۔ میں نے بھی یہی سمجھا کہ یہ دو جاپانی سپاہی شاید رات کی رات یہاں رکیں گے۔ صبح ہوتے ہی کسی دوسری طرف نکل جائیں گے۔ ان سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ نیچے برساتی نالے کی سرنگ میں جا کر چھپ جائیں۔ میں نے زہریلی لڑکی سے کہا۔

"نیچے کس طرف سے جائیں؟"

لڑکی نے میری کلائی پکڑ لی اور مجھے کھینچتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل کر برآمدے کی لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے لے گئی۔ نیچے ڈاک بنگلے کے برآمدے کے چبوترے کے قریب ہی پتھر کی کچھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہلکی بارش اور اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر گئے۔ نیچے برساتی نالا زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اس کا پانی اندھیرے میں دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

زہریلی لڑکی مجھے نالے کے کنارے کنارے چلاتی جھاڑیوں کو پکڑتی ایک پہاڑی کے نشیب میں لے آئی۔ یہاں پہاڑی کے اندر ایک قدرتی سرنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ سرنگ کوئی پندرہ بیس فٹ لمبی تھی اور آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ زہریلی لڑکی پاروتی کو اس سرنگ کا پتا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کوئی سانپ نہ

نکل آئے۔ جب میں نے پاروتی سے اپنے اس ڈر کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"تم کیوں فکر کرتے ہو۔ سانپ آیا تو میں اسے پکڑ کر کھا جاؤں گی۔ مجھے اس کی بو پہلے سے آ جاتی ہے۔"

میں نے پاروتی سے کہا۔

"ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ جاپانی فوج اس طرف چلی آ رہی ہے یہ جاپانی سپاہی یونہی ادھر نہیں آ گئے۔"

زہریلی لڑکی کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جاپانیوں کی اتنی فکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ پکڑی بھی گئی تو جو جاپانی سپاہی اس پر تشدد کرنے کی کوشش کرے گا اس کے زہر سے زندہ نہ بچ سکے گا لیکن میں جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ان کا جنگی قیدی بننا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کلکتے میں جاپانیوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ جنگی قیدیوں کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کرتے ہیں۔ چنانچہ میں وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ جاپانی اس سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ میں اگر اکیلا بھاگتا ہوں تو کسی بھی جگہ پکڑا جا سکتا تھا۔ میرے لیے زہریلی لڑکی کی راہ نمائی بڑی ضروری تھی۔ کیونکہ وہ کم از کم ان پہاڑیوں کے تمام نشیب و فراز سے واقف تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کسی حالت میں بھی جاپانیوں کا قیدی نہیں بننا چاہتا تو وہ کہنے لگی۔

"میں بھی قیدی نہیں بنوں گی۔ ہم سویرا ہونے سے پہلے یہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ یہ برساتی نالا آگے چٹانوں والی پہاڑیوں کی طرف جاتا ہے۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے ایک دریا ہے۔ ہم دریا پار کر کے آسام کی طرف نکل جائیں گے۔"

سرنگ میں اندھیرا تھا۔ مچھر بہت تھے۔ میں مچھر مارتے مارتے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی سے پوچھا۔

"تمہیں مچھر نہیں کاٹتے؟"

اندھیرے میں اس لڑکی کی آنکھیں ہی مجھے چمکتی نظر آ رہی تھیں مجھے اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ کہنے لگی۔

"جو مچھر مجھے کاٹتا ہے وہ مر جاتا ہے۔"

سرنگ کے باہر بارش کی آواز بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ برساتی نالے کا شور بھی تقریباً تھم گیا تھا۔ میں وہاں سے نکل جانے کو بے تاب تھا۔ میں نے زہریلی لڑکی سے کہا کہ ہو سکتا ہے کچھ دیر بعد یہاں اور بھی جاپانی سپاہی آ جائیں۔ اس لیے ہمیں فرار ہو جانا چاہیے۔ وہ بولی۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو تو چلو۔ نکل چلتے ہیں۔"

ہم سرنگ سے نکل کر برساتی نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ زہریلی لڑکی میرے آگے آگے چل رہی تھی۔ میری آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ راستہ جنگلی جھاڑیوں اور چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہمارے ایک طرف پہاڑی تھی۔ دوسری طرف نیچے برساتی نالا بہہ رہا تھا۔ چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جس پر ہم چل رہے تھے۔ نالا ایک طرف مڑ گیا۔ یہاں نالے کا پانی پگڈنڈی کے پتھروں تک آیا ہوا تھا۔ زہریلی لڑکی پاروتی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں سے گزارا۔ تھوڑی دور چل کر پہاڑی پیچھے رہ گئی۔ ہم ایک کھلی جگہ پر آ گئے۔ یہاں نالے کا پاٹ پھیل گیا تھا اور اس میں بڑی بڑی چٹانیں اور پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ سارا راستہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ میں تھک گیا۔ زہریلی لڑکی پر تھکاوٹ کا ذرا سا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ سانپوں کے زہر کا اثر تھا جن کا زہر اس کے جسم میں دوڑ رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔

پاروتی کو میں نے دیکھا کہ وہ اندھیرے میں ایک طرف منہ کیے کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا معلوم کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا۔

"میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آگے جدھر ہم جا رہے ہیں ادھر آدمی تو نہیں ہیں مگر ہوا ہمارے پیچھے سے آگے کی طرف چل رہی ہے۔ میں آدمیوں کی موجودگی کو محسوس نہیں کر سکتی۔"

میں نے پوچھا۔ "کالی چٹانوں والی پہاڑی ابھی کتنی دور ہے؟"

وہ اندھیرے میں میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ مجھے اس کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ اس کا رخ ابھی تک شمال مغرب کی طرف تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ پہاڑی زیادہ دور نہیں ہے۔ مگر ہمیں ہوشیار ہو کر چلنا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے کہ آگے کچھ گڑبڑ ہے۔"

میں اس زہریلی لڑکی کی چھٹی حس کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آگے ضرور کوئی خطرہ ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ ہم برساتی نالا پار کر کے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ وہ کہنے لگی۔

"اس نالے کی دوسری طرف گئے تو ہم برما کی سرحد میں داخل ہو جائیں گے۔ وہاں تم کہتے ہو کہ جاپانیوں کا قبضہ ہے۔ وہ تو ہمیں پکڑ لیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یقین کریں اب میں پچھتانے لگا تھا کہ میں کلکتے سے کیوں نکل پڑا۔ بنگالی لڑکی کاجل کا عشق جو بھوت بن کر میرے سر پر سوار ہو گیا تھا اب بھاگ چکا تھا۔ مجھے بڑی شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ میں کاجل کی تلاش میں جوان خطرناک جنگلوں میں نکل آیا ہوں یہ میری زندگی کی شاید سب سے بڑی غلطی اور حماقت تھی۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ اس سارے علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ تھا اور ہمارا کسی بھی مقام پر جاپانی سپاہیوں سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ہم جاپانیوں کی قید میں آ جاتے اور ہمارا جو حشر ہوتا اس سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں نے لمبا سانس بھر کر کہا۔

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ہم کس طرف جائیں؟ تھوڑی دیر میں دن کی روشنی ہو جائے گی۔ پھر تو ہم ضرور پکڑے جائیں گے۔"

پاروتی یعنی زہریلی لڑکی میرے پاس ہی پتھروں پر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

"میں جانتی ہوں تم کاجل سے پریم کرتے ہو۔ مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ مجھ سے تو کوئی پریم نہیں کرے گا۔ میں اس لائق ہی نہیں رہی پھر بھی میں تمہیں اچھا سمجھنے لگی ہوں۔ میں زندہ رہوں چاہے زندہ نہ رہوں۔ مگر تمہیں اس خطرے والے علاقے سے ضرور نکال دوں گی۔"

زہریلی لڑکی کے ہاتھ مزدوروں کے ہاتھوں کی طرح کھردرے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ اس لڑکی کا دل کس قدر نرم و نازک ہے اور انسانی ہمدردی سے لبریز ہے۔ اس بدقسمت لڑکی کے ساتھ یہ کتنی بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی کہ وہ دنیا کے کسی مرد سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے زہریلے ہونٹوں کا ذرا سا لمس اس کے محبوب کو موت کی نیند سلانے کے لیے کافی تھا۔ میں اس کی شکستہ دلی کی باتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ میں نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

"پاروتی! اس جنگل میں ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ اگر میں یہاں سے زندہ بچ کر نکل گیا تو تمہیں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک نہ بھلا سکوں گا۔"

مجھے ایسے لگا جیسے پاروتی نے ہلکی سی سسکی بھری

ہو۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب یہاں سے نکل چلو۔"

ہم برساتی نالے سے ہٹ کر بائیں جانب چلنے لگے۔ اس طرف ناریل کے اونچے اونچے چھتریوں والے درختوں کے بڑے بڑے جھنڈ تھے۔ ہم ان درختوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہے تھے۔ اس وقت آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں دھندلی دھندلی سی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ یہ پو پھٹنے کی روشنی تھی۔ اندھیرے میں سے درختوں جھاڑیوں اور پہاڑیوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ ہم ناریل کے جھنڈوں سے باہر آئے تو ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے درمیان ایک راستہ آگے کو جاتا دکھائی دیا۔ زہریلی لڑکی کہنے لگی۔

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ یہاں سے آگے کالی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پھر وہ دریا آئے گا جس کے پار آسام کا صوبہ ہے۔"

مجھے اطمینان ہوا کہ ہم جاپانیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم چھوٹے سے جنگلی راستے پر چل پڑے۔ لگتا تھا کہ اس راستے پر بیل گاڑیاں چلتی رہی ہیں۔ دونوں جانب پہیوں کے گہرے نشان تھے اور درمیان میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے دن کی سفیدی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ یہ جنگلی راستہ بائیں طرف مڑ گیا تھا۔ جیسے ہی ہم بائیں طرف مڑے اچانک کسی موٹر انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پاروتی مجھے کھینچ کر ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے پیچھے لے گئی۔ موٹر گاڑی کی آواز قریب آ رہی تھی۔ پھر ایک فوجی ٹرک ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ جس میں جاپانی فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹرک کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ جب جاپانی فوجی ٹرک کافی آگے نکل گیا تو میں نے پاروتی سے کہا۔

"ہم کسی جاپانی فوجی کیمپ میں تو نہیں آ گئے؟"

پاروتی بڑے غور سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے میری طرف دیکھا ہی تھا کہ اچانک چار پانچ جاپانی فوجی جھاڑیوں سے نکل کر رائفلیں تانے ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ جاپانی فوجی خدا جانے کہاں سے نکل آئے تھے۔

انہوں نے ہمیں پکڑ لیا اور آگے لگا کر فوجی کیمپ میں لے آئے۔ یہ عارضی فوجی کیمپ قریب ہی جنگل میں درختوں جھاڑیوں کو صاف کر کے بنایا گیا تھا۔ چاروں طرف خاردار تار لگی تھی۔ درمیان میں آمنے سامنے دو بارکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پتھروں کو جوڑ کر چبوترہ بنایا گیا تھا جس پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ دو تین فوجی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ جاپانی سپاہی ایک جگہ پی ٹی کر رہے تھے۔ دن کی روشنی کافی نکل آئی تھی۔ ان سپاہیوں نے ایک بارک میں لے جا کر ہمیں کیمپ کمانڈر کے آگے پیش کر دیا۔

یہ جاپانی فوجی افسر تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کا رینک کیپٹن کا تھا۔ وہ بانس کی چھت اور بانس کی دیواروں والے چھوٹے سے کیبن میں میز کرسی لگائے فل وردی میں بیٹھا تھا۔ کیبن کی بائیں جانب خاردار تاروں والا دروازہ تھا جس کے باہر مشین گن کا مورچہ بنا ہوا تھا۔ جاپانی افسر نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور زہریلی لڑکی پاروتی کو گھور کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ مجھے اپنا اور پاروتی کا دردناک انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ جاپانی افسر نے کرخت لہجے میں مگر صاف ہندوستانی زبان میں پوچھا کہ برٹش آرمی کے مورچے آگے کہاں کہاں

ہیں۔ ہمارا برٹش آرمی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کے مورچے جنگل میں کہاں کہاں ہیں۔ اگرچہ خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا لیکن میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے ہندوستانی زبان میں جواب دیا کہ ہم ہندوستانی شہری ہیں۔ ہمیں برٹش آرمی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ جاپانی افسر نے اپنا بید زور سے میز پر مارا اور ہندوستانی میں ہی ہمیں گالی دے کر کہا۔

"تم جھوٹ بولتا ہے۔ ہم کو مالوم ہے تم لوگ برٹش ملٹری انٹیلی جنس کا آدمی ہے۔ تم ہماری پوسٹوں کی جاسوسی کرنے ادھر آیا ہے۔ اگر تم نے سیدھی طرح ہمیں نہ بتایا تو ہم کو تمہارے پیٹ سے راز باہر نکالنا آتا ہے۔"

میرے ساتھ زہریلی لڑکی بھی لکڑی کے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میری طرح خوف زدہ نہیں تھی۔ بالکل سیدھی ہو کر بیٹھی تھی اور بانس کی دیوار پر لگے ہندوستان کے نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ جاپانی افسر نقشے کی طرف اس کو متوجہ دیکھ کر کرسی سے اٹھ کر ہمارے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بید کی چھڑی سے زہریلی لڑکی کا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"تم نقشے کو دیکھ رہی ہو۔ تم کو ضرور معلوم ہو گا کہ برٹش آرمی کی پوزیشنیں کہاں کہاں ہیں۔ بتاؤ بولو۔"

زہریلی لڑکی ہنسنے لگی۔ جاپانی افسر نے زور سے اس کی پیٹھ پر بید کی ضرب لگائی۔ زہریلی لڑکی کے حلق سے غصیلی ناگن کی پھنکار ایسی آواز نکلی۔ ایک بار تو جاپانی افسر بھی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے فوراً ہولسٹر میں سے ریوالور نکال لیا اور باہر کھڑے جاپانی گارڈ کو آواز دی۔ جاپانی سپاہی نے دوڑ کر اندر آتے ہی سلیوٹ کیا۔ جاپانی افسر نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی نے زہریلی لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ زبان میں زہریلی لڑکی سے کہا کہ بھگوان کے لیے سپاہی کو نہ کاٹنا۔ یہ مر گیا تو ہم بھی مارے جائیں گے۔ زہریلی لڑکی پاروتی اگر جاپانی سپاہی کو صرف اپنا ناخن چبھو دیتی تو وہ وہیں مر جاتا اور یقین کریں کہ وہ ایسا کرنے ہی والی تھی کہ میری بات سن کر وہیں اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دو اور جاپانی سپاہی اندر آ گئے۔ وہ مجھے اور زہریلی لڑکی پاروتی کو گھسیٹتے دھکیلتے گھونسے اور لاتیں مارتے سامنے والی بارک میں لے گئے اور وہاں الگ الگ کوٹھڑیوں میں بند کر دیا۔ بانس کی کوٹھڑی کی کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا جس کے باہر سنتری فوجی انداز میں چل پھر کر پہرہ دے رہا تھا۔ کوٹھڑی بالکل خالی تھی۔ میں فرش پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میرا انجام کیا ہونے والا ہے۔ انجام ظاہر تھا۔ اگر میں جاپانیوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوتا تو میرا انجام ایک المناک موت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے پاروتی کی بھی فکر تھی۔ جاپانی سپاہیوں کے بارے میں میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ وہ جس علاقے میں قبضہ کرتے ہیں وہاں کی تمام خوب صورت عورتیں اپنے ساتھ فوجی بارکوں میں لے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ حیوانی سلوک کرتے ہیں۔ پاروتی کی طرف سے مجھے صرف ایک تسلی تھی کہ اس پر اگر تشدد ہوا تو صرف ایک بار ہی ہو گا۔ اس کے بعد اگر زہریلی لڑکی پاروتی خود زندہ نہ رہ سکی تو اس پر تشدد کرنے والا بھی زندہ نہیں رہے گا۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ وہی جاپانی افسر دو سپاہیوں کے ساتھ میری بارک میں آ گیا۔ اس کے لیے باہر سے اسٹول لا کر رکھ دیا گیا۔ وہ اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھ سے اس علاقے یعنی آسام

میں برٹش آرمی کی پوزیشن کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ وہ بڑی صاف ہندوستانی بول لیتا تھا۔ پہلے تو اس کا میرے ساتھ بڑا نرم رویہ رہا۔ میں نے بار بار یہی کہا کہ میں برٹش فوجوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور میں کاجل نام کی لڑکی کی تلاش میں ادھر آ گیا تھا جسے سنتھالی سپیرے اٹھا کر لے گئے تھے۔ جاپانی افسر نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ ایک سپاہی کے ہاتھ میں رسی تھی۔ اس نے رسی اچھال کر چھت کے ساتھ باندھی اور مجھے رسی کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ میرے دونوں پاؤں رسی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ مجھے الٹا لٹکا کر چلے گئے۔ میری حالت خراب ہونا شروع ہوگئی۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں تو سر چکرانے لگا۔ بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری ٹانگوں میں سے جان نکل گئی ہے۔ آنکھوں کے آگے لال لال اندھیرا چھا گیا۔ میرے حلق سے بلبلاہٹ کی ڈراؤنی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس قسم کے تشدد کا مجھے اس سے پہلے کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میں بے اختیار ہو کر چیخنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ وہی جاپانی افسر سپاہیوں کے ساتھ اندر آیا۔ مجھے یہ تینوں الٹے نظر آ رہے تھے۔ میں نے چلا کر کہا۔ ”مجھے نیچے اتاردو۔ مجھے نیچے اتاردو۔ تم جو پوچھو گے بتادوں گا۔“

اسی وقت مجھے نیچے اتار دیا گیا۔ میں فرش پر بے سدھ ہو کر گر پڑا تھا۔ جاپانی افسر نے میری پسلیوں میں فوجی بوٹ کی نوک مارتے ہوئے کہا۔

”بولو۔ یہاں برٹش فوجیں کہاں کہاں ہیں؟“

میرے خون کی گردش نارمل ہوگئی تھی۔ آنکھوں کے آگے جو لال لال تارے ناچ رہے تھے وہ غائب ہوگئے تھے۔ ہاتھوں میں جو سوئیاں چبھنے لگی تھیں وہ ختم ہوگئی تھیں۔ میں نے پانی مانگا ایک سپاہی میرے لیے پانی لے آیا۔ میں نے پانی ایک ایک گھونٹ کر کے پیا۔ اس دوران میں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ میں نے کہا۔

”مجھے برٹش آرمی کے ایک یونٹ کمانڈر نے ادھر ایڈوانس کرتی جاپانی فوجوں کی جاسوسی کے لیے یہاں بھیجا تھا۔ یہ لڑکی سپیرن ہے۔ یہ مجھے جنگل میں ملی تھی۔ یہ جاسوس نہیں ہے۔“

جاپانی افسر نے بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے میرا منہ اوپر کیا اور چیخ کر کہا۔

”برٹش فوجیں کہاں کہاں ڈیپلائے ہیں؟“

مجھے اب جھوٹ بولنا تھا۔ ایک جھوٹ میں نے بول دیا تھا۔ آگے اب جھوٹ بولتے چلے جانا تھا۔ جاپانی افسر کو یقین آئے چاہے نہ آئے۔ اس کے سوا میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں کاکسز بازار کے جس ساحلی گاؤں سے چلا تھا میں نے اس کا نام لے کر کہا کہ برٹش انڈیا کی فوج کا پورا ڈویژن وہاں پہنچ چکا ہے۔ ایک جنگی جہاز سمندر میں بھی کھڑا ہے۔

”یہاں سے پیچھے جنگل میں برٹش آرمی نے کالی چٹانوں والی پہاڑیوں میں اپنا گریزن قائم کرلیا ہے۔ ان ہی پہاڑیوں میں ایمونیشن اور پٹرول کا بھاری ذخیرہ بھی موجود ہے۔“

جاپانی افسر کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس کو میری باتوں پر یقین آ رہا ہے کہ نہیں آ رہا۔ اس نے جاپانی سپاہی کو مخاطب کر کے تیز لہجے میں جاپانی زبان میں کچھ کہا۔ جاپانی سپاہی نے ایڑیاں موڑ کر زور سے سیلوٹ مارا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد جاپانی افسر بولا۔

”تم نے جو کچھ بتایا ہے ہمارے جاسوس اس کی

پوری پوری چھان بین کریں گے۔ اگر تمہارا بیان جھوٹ نکلا تو تمہیں اسی وقت شوٹ کردیا جائے گا۔“

جاپانی افسر دوسرے سپاہی کو ساتھ لے کر بارک سے نکل گیا۔ میں سوچنے لگا کہ میرے جھوٹ کا پول ضرور کھل جائے گا اور یہ جاپانی مجھے فوراً گولی ماردیں گے۔ پھر خیال آیا کہ کاکسز بازار وہاں سے کافی دور ہے۔ ان کے سراغ رسانوں کو وہاں تک جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ اس دوران میں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ یہ اپنے آپ کو جھوٹی تسلیاں دینے والی بات تھی۔ جاپانیوں کی قید سے فرار ہونا اتنا آسان نہیں تھا۔ جس کوٹھڑی میں میں قید تھا اس کے باہر ایک مسلح فوجی ہر وقت پہرے پر موجود رہتا تھا۔ کیمپ کے چاروں طرف خاردار تار لگی تھی۔ گیٹ پر مشین گن پوسٹ تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ میں زہریلی لڑکی پاروتی کو جاپانیوں کی قید میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

میری چھوٹی بارک یا کوٹھڑی کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ جاپانی سپاہی جو سیلوٹ مار کر باہر چلا گیا تھا میرے لیے ایک ڈونگے میں کالے رنگ کی چائے اور آدھی ڈبل روٹی لے آیا۔ اس نے تیز آواز میں کچھ کہا اور ڈونگا اور ڈبل روٹی میرے پاس فرش پر رکھ کر چلا گیا۔ ڈبل روٹی پتھر کی طرح سخت تھی۔ مگر مجھے اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسے بہت بڑی نعمت سمجھ کر کھا گیا۔ کالی کڑوی گرم چائے نے بھی میرے اعصاب کو کافی سکون پہنچایا۔ اب میں سوچنے لگا کہ جب تک جاپانیوں پر میرے جھوٹ کا پول نہیں کھلتا اس دوران مجھے فرار ہونے کی کیا کوشش کرنی چاہیے اور میں کیا کرسکتا ہوں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ میں اٹھ کر بانس کی دیواروں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ موٹے موٹے بانسوں کو اس طرح جوڑا گیا تھا کہ ان کے درمیان کہیں ذرا سی بھی درز نہیں تھی۔ میں دبے پاؤں چل کر دروازے کے پاس آ گیا۔ دروازہ بند تھا۔ باہر برآمدے کے لکڑی کے فرش پر جاپانی سنتری کے فوجی بوٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ چابی والے کھلونے کی طرح نپے تلے قدم اٹھاتا اور دروازے کے آگے سے گزر کر چھ سات قدم بائیں جانب جاتا۔ وہاں سے واپس مڑتا اور دروازے کے آگے سے گزرتا ہوا چھ سات قدم دائیں طرف چلا جاتا۔ پھر وہاں سے واپس مڑ آتا۔ باہر ہلکی ہلکی رم جھم ہو رہی تھی۔ سامنے والی بارک کے برآمدے میں بھی دو جاپانی سنتری گارڈ ڈیوٹی پر کھڑے تھے۔ بارک کے کونے میں ایک ٹرک میں سے کوئی سامان اتارا جارہا تھا۔ جاپانی سپاہی سامان اتارتے ہوئے اونچی آواز میں آپس میں باتیں بھی کررہے تھے۔

میں پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب ہمیں جاپانی فوجی افسر کے کمرے سے باہر نکالا گیا تھا تو دو جاپانی سپاہی مجھے اس بارک میں لے آئے تھے اور دو سپاہی پاروتی یعنی زہریلی لڑکی کو لے کر اسی بارک میں آگے چلے گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاروتی اسی بارک کے کسی اگلے کیبن یا کوٹھڑی میں بند تھی۔ میں فرار کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہ کوئی باقاعدہ جنگی قیدیوں کا کیمپ نہیں تھا۔ آسام کی طرف ایڈوانس کرتی جاپانی فوجوں نے یہاں عارضی کیمپ بنایا ہوا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے مواقع زیادہ تھے۔ بشرطیکہ میں کسی طرح بارک سے نکل سکوں مگر سوال یہ تھا کہ میں پاروتی کو ساتھ کیسے لے جاسکتا تھا۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ پاروتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ لڑکی ایسی تھی کہ

دشمن کے لیے ہلاکت کا باعث بن سکتی تھی۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے رات کا وقت ہی بہترین تھا۔ یہاں جنگی قیدیوں کے کیمپ کی طرح مچان پر کوئی سرچ لائٹ بھی نہیں لگی تھی جو اندھیرے میں مجھے تلاش کر لیتی۔ یہاں فرار ہونے کے لیے حالات بڑے سازگار تھے۔ صرف باہر ایک گارڈ تھا۔ دروازہ اگرچہ بانس کا تھا مگر میں نے محسوس کیا تھا کہ جب جاپانی سپاہی مجھے چائے کا مگ دے کر واپس گیا تھا تو اس نے دروازہ بند کر کے باہر کوئی زنجیر سی چڑھائی تھی۔ ظاہر ہے اس زنجیر نے دروازے کو بند کر دیا ہوگا۔ اگر رات کے وقت میں کسی طرح بارک سے باہر نکل جاؤں تو آگے کیمپ کا خاردار تاروں والا دروازہ پار کرنا تھا اور اس کے بعد میں جنگل میں گم ہو سکتا تھا لیکن خاردار تار والا دروازہ رات کو ضرور بند کر دیا جاتا ہوگا اور اس کے آگے مشین گن کی پوسٹ بھی تھی جہاں دو سپاہی ہر وقت موجود رہتے تھے۔

ابھی مجھے یہاں آ کر یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ رات کے وقت یہاں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ باہر بارکوں کے اوپر ضرور لائٹیں روشن ہوتی ہوں گی۔ کیونکہ یہاں ان جاپانیوں کو برطانوی بمبار جہازوں کی بمباری کا خطرہ بالکل نہیں تھا۔ سارے علاقے پر جاپانی پھیلے ہوئے تھے اور جب سے میں ان جنگلوں میں داخل ہوا تھا میں نے برٹش ایئر فورس کا ایک بھی بمبار طیارہ آسمان پر اڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دوپہر کو مجھے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تو بارک کے اندر ایک کمزور روشنی والا بلب اپنے آپ جل اٹھا۔ مجھے بڑی بھوک اور پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے میں دروازے کی زنجیر کھلی۔ وہی جاپانی سپاہی ٹین کی تھالی میں تھوڑے سے چاول لے کر آ گیا۔ ٹین کے ڈونگے میں پانی بھی تھا۔ میں نے صبر شکر کر کے پیٹ کی آگ بجھائی۔ اس کے بعد ایک بار پھر بند دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور درز میں سے باہر کا جائزہ لینے لگا۔

برآمدے میں جاپانی سنتری باقاعدہ ٹہل رہا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ آمنے سامنے والی بارکوں اور کیمپ کے احاطے کے بڑے گیٹ کے اوپر کافی روشنی والے بلب روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی میں کیمپ کے اندر کی ہر شے صاف نظر آ رہی تھی۔ خاردار تار والا گیٹ بند تھا۔ اس کے باہر بھی ایک سپاہی ڈیوٹی پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس دوران مجھ سے کسی نے پوچھ گچھ نہ کی۔ میں نے برطانوی فوجوں کے بارے میں جھوٹی اطلاعات دی تھیں میرے خیال کے مطابق جاپانی کیمپ کمانڈر کو اس کی تصدیق یا تردید کی کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ یہ اطلاع صبح تک پہنچ سکتی تھی اور اس کے بعد مجھ پر اذیت ناک تشدد کا سلسلہ بھی شروع ہونے والا تھا۔

میں نے کافی غور کیا۔ کئی تدبیریں سوچیں مگر وہاں سے فرار ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن میں ماحول کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ رات میں باہر گارڈ ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ پہلے والا جاپانی سنتری چلا گیا تھا اور اس کی جگہ دوسرا جاپانی آ گیا تھا۔ میں نے گارڈ ڈیوٹی بدلتے دروازے کی درز میں سے دیکھی تھی۔ مگر اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جیسا پہلے والا سنتری تھا ویسے ہی دوسرا سنتری آ گیا تھا۔ بانس کی بنی ہوئی کوٹھڑی میں حبس تھا۔ مچھر بھی تھے۔ میں کچھ دیر تک کوٹھڑی میں ادھر سے ادھر ٹہلتا اور سوچتا رہا پھر فرش پر لیٹ گیا۔ مچھر سونے نہیں دیتے تھے۔ میری جیبوں میں جو تھوڑے بہت پیسے اور ایک چاقو تھا وہ جاپانیوں نے تلاشی لیتے وقت نکال لیا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے فرش پر پڑا تھا۔ ایک ہاتھ سے مچھر بھی مار رہا تھا۔

فضا میں گھٹن تھی۔ نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ باہر خاموشی تھی۔ صرف برآمدے کے فرش پر جاپانی سنتری کے بھاری بوٹوں کی آواز آ رہی تھی۔

اچانک باہر شور بلند ہوا۔ بہت سے سپاہی ایک دوسرے کو آوازیں دیتے برآمدے کے سامنے سے گزر گئے۔ باہر جو سنتری پہرے پر تھا اس کے دوڑنے کی بھی آواز آئی۔ میں جلدی سے اٹھ کر دروازے کی درز کے ساتھ لگ گیا۔ باہر روشنی میں میں صرف سامنے ہی دیکھ سکتا تھا۔ میرے سامنے والی بارک کے باہر ایک ٹرک اور دو تین فوجی جیپیں کھڑی تھیں۔ ایک جیپ تیزی سے بارک کے دوسرے کونے کی طرف نکل گئی۔ اس طرف سپاہیوں کا کافی شور تھا۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے فوجی بوٹوں کی آوازیں اپنی کوٹھڑی کی طرف آتی سنائی دیں۔ میں جلدی سے دروازے سے ہٹ کر کونے میں بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا۔ تین جاپانی سپاہی تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی مجھے زدوکوب کرنا شروع کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ مجھے گھونسے اور لاتیں مارتے ہوئے کھینچ کر کوٹھڑی سے باہر لے آئے اور اسی طرح زدوکوب کرتے سامنے والی بارک میں لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے ایک لوہے کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا۔ ایک ناٹے قد کا جاپانی افسر اندر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے دو تین تھپڑ مارے اور ہندوستانی میں پوچھا۔

”تمہارے ساتھ جو لڑکی تھی وہ تمہیں کہاں ملی تھی؟“

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یعنی مجھے کچھ شک پڑا کہ ضرور زہریلی لڑکی نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔ میرا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ میں نے اپنا پہلے والا بیان دہرایا کہ وہ سنتھالی سپیرن تھی اور میری منگیتر کاجل کی تلاش میں میری راہ نمائی کے لیے میرے ساتھ ہو گئی تھی۔ یہ پہلے والا جاپانی افسر نہیں تھا۔ اس نے مجھے زور سے تھپڑ مارا اور کہا۔

”تم بکتے ہو۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم دونوں برٹش آرمی کے جاسوس ہو۔“

اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے میرے سارے کپڑے اتروا کر میرے کپڑوں کے علاوہ میرے جسم کی بھی تلاشی لی۔ میرا منہ کھلوا کر دانتوں کے آگے پیچھے انگلیاں ڈال کر دیکھا۔ خدا جانے وہ کونسی چیز تلاش کر رہے تھے۔ جب انہیں اپنی مطلوبہ شے نہ ملی تو مجھے کپڑے پہننے کا حکم ہوا۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہن لیے۔ جاپانی افسر نے اب باقاعدہ مجھ سے زہریلی لڑکی پاروتی کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ جب میں اپنے بیان پر قائم رہا تو جاپانی افسر نے مجھ سے پوچھا۔

”اس لڑکی کو زہر والا انجکشن کس نے دیا تھا؟“

(باقی آئندہ)

اقبالِ جرم

محترم مدیر نئے افق'
السلام علیکم!
ایک سچی آپ بیتی حاضر ہے مجرم خواہ کتنا ہی چالاک ہوشیار ہو اسے اپنے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے اور ضمیر کی عدالت بھی اسے سچ بولنے پر مجبور کردیتی ہے امید ہے ہمیشہ کی طرح مہربانی فرما کر اس تحریر کو قریبی اشاعت میں جگہ عنایت فرمائیں گے۔

والسلام
راوی: مرزا سعید بیگ ایڈوکیٹ
تحریر: انجم فاروق ساحلی
لاہور

میں دو مختلف نظریات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بیمہ زندگی کے بارے میں۔ متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے حرام قرار دیتے ہیں اور کچھ حلال۔ حرام قرار دینے والوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ زندگی ایک ایسی چیز ہے جو کلی طور پر خالق کل کے قبضے واختیار میں ہے۔ لہٰذا اسے درمیان میں رکھ کر کسی قسم کی سودے بازی کرنا گناہ ہے۔ دوسری دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ بیمہ زندگی سے بعض صورتوں میں قتل کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ جو لوگ بیمہ زندگی کو حلال قرار دیتے ہیں وہ معاشی دلیل لاتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اس سے انکم ٹیکس میں چھوٹ ملتی ہے' لازمی بچت ہوجاتی ہے۔ حادثاتی موت کی صورت میں پسماندگان غیروں کی محتاجی سے بچ جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ فائدہ ہوتا ہے کہ بیمہ کمپنیوں کے پاس جمع ہونے والا سرمایہ ملک کے ترقیاتی منصوبوں میں کام آتا ہے۔ سردست قانون میں ایسی کوئی دفعہ موجود نہیں ہے جو بیمہ زندگی کو حرام قرار دیتی ہو۔ باقی رہا انفرادی فیصلہ تو اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ البتہ آپ اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ بعض صورتوں میں بیمہ پالیسی سے قتل کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔ مغرب میں اس قسم کے واقعات عام سننے میں آتے ہیں۔ تاہم ہمارے ہاں بھی کبھی کبھی ایسا کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے۔

ایسے ہی ایک واقعے کی مجھے بھی پیروی کرنا پڑی۔ میں ایک پیشہ ور وکیل ہوں مشکل اور الجھے ہوئے کیسوں میں بھی میرا نام اکثر پیش کیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل ایک تیس بتیس سالہ شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ وہ ضمانت قبل از گرفتاری کروانا چاہتا ہے۔ وہ ایک دبلا پتلا اور کم گو قسم کا شخص تھا۔ اس نے صاف اور بے داغ سوٹ پہن رکھا تھا۔ پیشانی کشادہ تھی۔ چہرے پر ذہانت پائی جاتی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے اپنا نام دبیر الحسن بتایا اور یہ کہ ایک مقامی اسپننگ مل (سوت کاتنے والی) کا مالک ہے۔ یہ فیکٹری ملتان روڈ پر منصورہ ہسپتال سے کچھ فاصلے پر مین روڈ پر ہی واقع ہے۔

''ہم زیادہ تر بڑی بڑی ٹیکسٹائل ملوں کے لیے آرڈر پر یارن (دھاگا) تیار کرتے ہیں۔ تین ہفتے قبل میری بیوی عالیہ میری ایک گاڑی سے ٹکرا

کر ہلاک ہوگئی وہ ہفتے کا دن تھا اور ہم ایک دعوت میں مدعو تھے۔ مجھے فیکٹری میں کام کی زیادتی کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ میں نے عالیہ کو فون پر کہا کہ وہ تیار ہو کر فیکٹری ہی آجائے۔ ہم وہاں سے سیدھے دعوت میں چلے جائیں گے۔ ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیج دیا۔

عالیہ تقریباً پونے آٹھ بجے تیار ہو کر فیکٹری پہنچ گئی اور دفتر کے باہر ہی ٹہلنے لگی۔ اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی میں کام سمیٹ کر باہر نکلا اور اپنی کار کی طرف بڑھا لیکن میری کار دو گاڑیوں کے درمیان کھڑی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اس کا ڈرائیور نظر نہیں آیا۔ اتفاق سے لینڈ روور کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ میں نے سوچا کہ خود ہی اسے ایک طرف کردیتا ہوں۔ میں دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھا اور انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ دقت پیش آئی۔ انجن کی ٹیوننگ ٹھیک نہیں تھی اور وہ خود بخود بند ہوجاتا تھا۔ لہٰذا تیسری یا چوتھی کوشش کے دوران میں نے انجن کو ریس دیتے ہوئے گیئر میں ڈال دیا۔ گاڑی ایک دم اچھل کر آگے بڑھی۔ عین اس وقت میری بیوی عالیہ سامنے آگئی۔ میں نے فوراً ہی بریک لگائی لیکن اس وقت تک عالیہ بمپر سے ٹکرا کر گر چکی تھی۔ اگرچہ چوٹ زیادہ گہری نہیں تھی تاہم اس نے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا۔''

''دبیر الحسن صاحب یہ اچانک سامنے آجانے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔ ''ایک کھڑی ہوئی گاڑی کے سامنے اگر کوئی آجائے تو ایکسیڈنٹ نہیں ہوسکتا۔ کم از کم مہلک ایکسیڈنٹ نہیں۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں تھا کہ آپ کی بیوی سامنے آرہی ہے۔''

''دراصل عالیہ ایک طرف کھڑی تھی اور میں اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ غالباً اس نے یہی اندازہ لگایا ہوگا کہ انجن ایک بار پھر بند ہوجائے گا۔ اس لیے وہ گاڑی کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف جانے لگی۔ اس وقت میں گیئر لگا کر کلچ چھوڑ چکا تھا۔ سب کچھ ایک سیکنڈ کے اندر ہوگیا۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''وہ گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسے پولیس نے فوراً اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ تفتیشی افسر کسی ایکسپرٹ سے انجن کا معائنہ کرانا چاہتا ہے۔''

''تاکہ آپ کے بیان کی تصدیق ہوسکے؟''

''بیان کی تصدیق تو اسی دن ہوگئی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''ایس ایچ او نے بذات خود انجن اسٹارٹ کرکے دیکھا تھا۔ انجن کی ٹائمنگ میں گڑبڑ تھی۔ لیکن اب پولیس والے رشوت مانگ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر میں نے رشوت نہ دی تو وہ گاڑی ٹھیک کروا کر میرے خلاف قتل کا مقدمہ بنادیں گے۔''

''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ زیادہ تر لوگ یہی کہتے ہیں پولیس کا مطالبہ پورا کردو۔ میرے خیال میں بھی اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں چند ذاتی قسم کے سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اگر ان سوالات سے میرا بھلا ہوسکتا ہے تو ضرور کریں۔'' میں دراصل یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ خود ملوث تو نہیں۔

''آپ کے گھریلو حالات کیسے تھے؟'' میں نے پہلا سوال کیا۔ ''آپ کا اپنی بیوی سے کوئی

اختلاف یا تنازعہ تو نہیں تھا؟“

”جی نہیں‘ کوئی اختلاف نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھار چھوٹی موٹی نوک جھونک تو ضرور ہو جاتی تھی۔“

”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا تھا؟“

”اگلے ماہ دو سال ہو جائیں گے۔“

”کیا آپ کی بیوی آپ کے خاندان میں سے تھی؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا پھر بولا۔ ”میں سمجھتا ہوں اس تفصیل میں جانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ میں نے بظاہر سوالات کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے کیا آپ کا کوئی بچہ ہے۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بچہ کوئی نہیں اور یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہے۔ ورنہ وہ ماں کی کمی کو شدت سے محسوس کرتا۔ اس کے علاوہ اس کی پرورش کا بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا۔“

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”خیر اتنا بھی مسئلہ نہ ہوتا آج کل ماؤں سے زیادہ نانیاں اور دادیاں بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش کرتی ہیں پھر بڑھاپے میں ان کا دل بھی لگا رہتا ہے۔“

اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔ ”میری والدہ کا کافی عرصہ قبل انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے بڑی ہی پیار کرنے والی مشفق ہستی تھیں۔ البتہ میری ساس زندہ ہیں لیکن میرا ان سے زیادہ میل جول نہیں۔ چھوڑیے وکیل صاحب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“ میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ جس بات کا وجود ہی نہ ہو اس کے امکانات پر بحث کرنا فضول ہے۔ ویسے آپ کے سسرال والوں کا اس ضمن میں کیا ردعمل ہے۔“ وہ قدرے تامل کرتا ہوا بولا۔

”ان کا ردعمل شروع ہی سے خراب ہے دراصل......“ اس نے ایک بار پھر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ یا تو ان لوگوں میں سے تھا جو عام طور پر اپنے گھر کی باتیں بتانا پسند نہیں کرتے اور یا پھر کوئی بات چھپانا چاہتا تھا۔ ایک سوال بار بار میرے ہونٹوں پر آ کر رک جاتا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اپنی بیوی کی موت سے کوئی بڑا فائدہ تو نہیں ہوا تھا؟ لیکن فی الحال میں نے یہ سوال نہ کیا کیونکہ یہ سوال سن کر وہ ناراض ہو جاتا اور میں موکل سے محروم ہو جاتا۔

اگلے روز میں نے اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کرا دی اور فیس جیب میں ڈالنے کے بعد اس کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ چند روز بعد پتا چلا کہ اس کی ضمانت منسوخ ہو گئی ہے اور پولیس نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ میں متعلقہ پولیس اسٹیشن سمن آباد جا کر اس سے ملا اور صورت حال کے بارے میں دریافت کیا وہ کافی پریشان تھا اور کھل کر بات کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ کیونکہ ایک سپاہی میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

”لینڈ روور کے بارے میں پولیس کی کیا رپورٹ ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”ان کا خیال ہے کہ میں نے جان بوجھ کر گاڑی کا انجن خراب کیا تھا۔ اب وہ بات نہیں رہی معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ میرے سسرال والے بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔“

”کیا موقع پر کوئی گواہ موجود تھا؟“ میں نے استفسار کیا۔

”حادثے کے وقت کوئی موجود نہیں تھا لیکن حادثے کے فوراً بعد جائے وقوعہ پر رات کی ڈیوٹی والا اسٹاف پہنچ گیا تھا۔“

”ان لوگوں نے کیا بیانات دیئے ہیں؟“

”ان لوگوں کے بیانات پولیس فائل میں موجود ہیں۔ کچھ نے میرے خلاف بیانات دیئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آج کل کاریگر اور مزدور مالک سے خوش نہیں ہوتے۔ آپ انہیں کچھ بھی دے دیں ان کے مطالبات ختم نہیں ہوتے۔“ اس نے کہا اور سر جھکا لیا۔

میں نے ایس ایچ او کے پاس جا کر کیس فائل دیکھی۔ پولیس نے کم از کم ایک درجن گواہوں کے بیانات قلم بند کیے تھے لیکن میں پہلے اس گفتگو کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو اس ضمن میں ایس ایچ او کے ساتھ ہوئی۔

”آپ کے خیال میں قتل کا محرک کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سبحان اللہ...... یہ آپ نے سو باتوں کی ایک بات کی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جب تک ہمیں قتل کا محرک معلوم نہیں ہوا تھا‘ ہم نے ملزم پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ شروع میں ہم نے بھی واردات کو حادثہ ہی سمجھا تھا لیکن جب انشورنس کے بارے میں پتا چلا تو ہماری آنکھیں کھل گئیں۔“

”انشورنس؟“ میں نے حیرانی سے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے موکل نے آپ کو بھی پوری بات نہیں بتائی۔“

اس نے کہا۔ ”صرف دس ماہ قبل ملزم نے اپنی بیوی عالیہ حسن کی پچاس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی خریدی تھی۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب ملزم نے انشورنس کلیم داخل کیا اور بیمہ کمپنی نے اس سے مقتولہ کا حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کیا۔“

”لیکن یہ تو کوئی ثبوت نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ اس بات کو کسی ٹھوس ثبوت کی حمایت میں تو پیش کر سکتے ہیں لیکن صرف اس بات کو ثبوت کے طور پر نہیں پیش کر سکتے کہ حادثے میں ہلاک ہونے والی عورت کی دس ماہ قبل بیمہ پالیسی خریدی گئی تھی۔“

”اس بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ آپ کے موکل نے ہمیں پچاس ہزار روپے بطور رشوت پیش کیے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سرسری تفتیش کر کے عالیہ کی موت کو حادثہ قرار دے دیں اور حادثے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیں۔“

”میں نے اس کے برعکس بات سنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے مطالبہ آپ کی طرف سے کیا گیا تھا۔“

”وکیل صاحب! پولیس پر رشوت کا الزام دراصل فیشن بن گیا ہے۔“

”ہوں...... ہو سکتا ہے‘ لیکن آپ اس بات سے انکار بھی نہیں کر سکتے۔“

”جس طرح آپ میری بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ وکیل الفاظ کی ہیرا پھیری سے مجرموں کو بے گناہ اور بے گناہوں کو مجرم ثابت کر دیتا ہے تو اس کی فیس بھی رشوت بن جاتی ہے۔ یعنی وہ فیس نہیں لیتا رشوت لیتا ہے اور سچی بات بتاؤں‘ حقیقت یہ ہے کہ پولیس پر باقاعدہ سازش کے تحت رشوت کا شوشہ مسلط کیا جاتا ہے۔“

”اور یہ سازش کس نے کی ہے؟“

”کام کی بات کریں وکیل صاحب! کیوں ہماری نوکری کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اگر ملزم بے گناہ ہوتا تو وہ سرٹیفکیٹ کے لیے پچاس ہزار روپے رشوت نہ پیش کرتا۔“

"یہ محض ایک قیاس آرائی ہے اور قانون قیاس آرائیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ بہرحال آپ ملزم کا چالان کب پیش کریں گے؟"

"جب تفتیش مکمل ہو جائے گی۔" تھانے سے رخصت ہونے سے پہلے میں دبیر الحسن سے ملنے کے لیے حوالات کے دروازے پر گیا وہ دوسرے حوالاتیوں سے الگ تھلگ گھٹنوں میں سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ میں نے آواز دے کر قریب بلایا اور پوچھا۔ "آپ کے اوپر پولیس نے کوئی تشدد تو نہیں کیا؟" جواب دینے سے پہلے اس نے مسلح گارڈ کی طرف دیکھا جو برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ پھر بولا۔ "نہیں میرے اوپر کوئی تشدد نہیں کیا گیا۔"

"زیادہ فکر نہ کرنا' میں نے پوری فائل دیکھ لی ہے' سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہاں کیس کے سلسلے میں بعض اوقات مشورے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ آپ اپنے کسی عزیز کا پتا بتا دیں تاکہ بوقت ضرورت ان سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔"

اس نے اپنے گھر کا پتا بتا دیا۔ "مطلوبہ مقام اچھرہ مین مارکیٹ کے پاس واقع تھا۔ دستک کے جواب میں ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا اور تعارف کے بعد مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہ دبیر الحسن کی بیوہ خالہ تھیں۔ ان کا نام شاکرہ خاتون معلوم ہوا۔ اس نے بتایا کہ دبیر کے والد مختار الحسن کہیں گئے ہوئے ہیں اور تھوڑی دیر میں ان کی واپسی متوقع ہے۔ باتوں باتوں میں شاکرہ خاتون نے گھر کا پورا نقشہ بتا دیا۔ دبیر الحسن کی دو بہنیں تھیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی تھی اور چھوٹی ابھی کنواری تھی۔ مختار الحسن ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے اور ایک معمولی سرکاری اہلکار تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکی چائے بنا کر لے آئی۔

شاکرہ خاتون نے بتایا کہ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اس کا نام شمائلہ ہے۔ وہ ایک گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میں دبیر الحسن کا وکیل ہوں تو اس نے مجھے سلام کیا اور مقدمے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ دبیر الحسن کی گرفتاری کے سبب سے خاصی پریشان تھی۔

"فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے امید ہے کہ دبیر الحسن بری ہو جائے گا۔" وہ چائے رکھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد شاکرہ خاتون دھیمے لہجے میں بولی۔ "یہ نادان لڑکی اب تک اس کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ حالانکہ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں' ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ایسے دغاباز آدمی کو یہی سزا ملنی چاہیے۔"

گو اس نے مبہم انداز میں بات کی تھی' لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے پوچھا۔ "کیا آپ کی بیٹی دبیر الحسن سے منسوب تھی؟"

"ہاں اس کمبخت سے منسوب تھی۔ شمائلہ تو اب بھی اپنے آپ کو اس سے منسوب سمجھتی ہے حالانکہ جو شخص ایک بار دھوکا کر سکتا ہے وہ دوسری بار بھی کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔"

"منگنی ٹوٹنے کا سبب کیا ہوا تھا؟"

"ہماری حماقت کہ ہم نے ساری دولت کا اختیار اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جس شخص نے زندگی میں کبھی پیسہ نہ دیکھا ہو اگر اس کے ہاتھ اچانک دولت آ جائے تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔"

"کیا آپ نے دبیر الحسن کے کاروبار میں کچھ رقم لگائی ہے۔"

"رقم۔" اس نے حیرانی سے کہا۔ "سارا کاروبار ہی ہمارا ہے یہ فیکٹری شمائلہ کے والد نے بنائی تھی۔ چونکہ دبیر الحسن میری بہن کا بیٹا اور ہونے والا داماد تھا اس لیے ہم نے سارا کاروبار اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے کبھی اس سے حساب نہیں مانگا۔ یہ مکان جس میں آپ بیٹھے ہیں یہ بھی ہماری ملکیت ہے لیکن اس لڑکے نے ہماری مہربانیوں کا یہ صلہ دیا کہ ایک آوارہ لڑکی سے شادی کر لی۔"

"اس کے باوجود آپ نے اپنا کاروبار اس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔" وہ گہرا سانس لیتی ہوئی بولی۔

"بات صرف کاروبار کی نہیں رشتے داری کی بھی ہے۔ جہاں یہ دو چیزیں اکٹھی ہو جائیں وہاں بڑی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے مختار بھائی کا بہت سہارا ہے۔ وہ سچے اور کھرے آدمی ہیں۔ ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں۔"

"اب جبکہ دبیر الحسن کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے تو کیا آپ اسے اپنا داماد بنا لیں گی۔"

"میں تو اس کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ مسئلہ شمائلہ کا ہے وہ اس معاملے میں بہت جذباتی ہے۔ اچھے وقتوں میں دونوں کے درمیان جو عہد و پیمان ہوئے تھے وہ انہیں ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ اس نے تو کئی اچھے اچھے رشتے ٹھکرا دیے ہیں۔ کہتی ہے دبیر کے نام پر یونہی ساری زندگی گزار دوں گی۔"

"میرا خیال ہے اب دبیر کو نصیحت ہو گئی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"اگر وہ عالیہ سے شادی نہ کرتا تو یہ نوبت نہ آتی۔"

تھوڑی دیر بعد مختار الحسن بھی وہاں آ گئے۔ وہ سنجیدہ طبع بارلیش انسان تھے۔ عمر پینسٹھ برس کے قریب ہو گی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور رسمی کلمات کے بعد کہا۔ "آپ کے بیٹے نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا ہے۔ اس کے کیس کی پیروی کے لیے آپ کے تعاون کی ضرورت ہو گی۔" ان کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو گئے۔ پھر وہ ناگواری سے بولے۔

"مجھے اس کے بارے میں کچھ مت بتائیے۔ میرے اندر اب مزید تکلیف برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ جس دن یہ سانحہ پیش آیا اس دن سے میں نے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو میری ایک ہی دعا ہے خدا بیٹے کے فیصلے سے پہلے ہی مجھے اپنے پاس بلا لے۔"

"صورت حال اتنی خراب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ آپ کا بیٹا بری ہو جائے گا۔"

"میرے سامنے اس کی کوئی بات یا تذکرہ نہ دہرائیں۔ اس نے ہم سب کے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ میرے وقار کو خاک میں ملا دیا ہے۔ نظر کو جھکایا ہے۔ آج وہ ان ہی زیادتیوں کا حساب چکا رہا ہے۔ خدا سب کے حال پر رحم کرے لیکن انسان بہت ناشکرا اور احسان فراموش واقع ہوا ہے۔ میں تو اب بھول جانا چاہتا ہوں کہ میرا کوئی بیٹا بھی تھا۔"

یہ کہتے ہوئے افسردگی کے عالم میں مختار صاحب اندر چلے گئے۔

جب میں جانے لگا تو شمائلہ دروازے کے قریب آ کر بولی۔

''اگر آپ کی دبیر سے ملاقات ہو تو اسے میرا ایک پیغام دے دیں۔''

''کیا پیغام ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اسے کہہ دیں کہ اس کی بریت کے لیے صبح وشام دعا کر رہی ہوں امید ہے کہ......'' اچانک اس کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ لیکن جو کچھ اس نے کہا وہ میری سمجھ میں آ گیا۔ دبیر الحسن کے لیے اس کی چاہت اور محبت عقل کی حدود پار کر چکی تھی وہ ان محبت کرنے والوں میں سے تھی جو یا تو اپنے مطلوب کو پا لیتے ہیں یا اس کی جستجو میں خود کو فنا کر دیتے ہیں۔

میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دبیر الحسن نے کیوں اس لڑکی کو نظر انداز کیا تھا۔ حالانکہ وہ خوب صورت تھی، تعلیم یافتہ تھی، صاحب جائیداد تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی منگیتر بھی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ اس نے اسے چھوڑ کر ایک معمولی حیثیت اور معمولی شکل وصورت کی لڑکی کو اپنا لیا تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے واقعی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عالیہ سے شادی کی تھی......؟

پولیس نے اس کا ایک ہفتے کا ریمانڈ لیا تھا۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد انہوں نے ریمانڈ میں مزید ایک ہفتے کی توسیع کی درخواست دی۔ میں نے ضمانت کرانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ عدالت نے پولیس کی ریمانڈ کی درخواست منظور کر لی۔ یہ مدت پوری ہونے کے بعد عدالت نے ملزم کو پچاس ہزار کے ذاتی مچلکہ پر رہائی کا حکم جاری کر دیا۔

کارروائی مکمل ہوتے ہوتے ایک بج گیا۔ میں دبیر الحسن کو ساتھ لے کر لنچ کے لیے ایک قریبی ریستوران میں چلا گیا تھا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میں اس کے گھر گیا تھا۔ جہاں اس کے والد، خالہ اور شمائلہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جب بیرا کھانا لگا کر چلا گیا تو میں نے کہا۔

''آپ کی منگیتر نے ایک پیغام دیا تھا۔'' وہ قدرے چونک کر بولا۔

''میری منگیتر؟''

''میں آپ کی خالہ کی بیٹی شمائلہ کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ۔'' اس نے گہرا سانس لیا۔ ''وہ کسی زمانے میں میری منگیتر تھی۔''

''اور اب؟''

''اب نہیں ہے۔''

میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیوں؟''

''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کیا پیغام دیا ہے؟''

''مجھے اس کے پیغام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر آپ بتانا چاہیں تو بتا دیں۔ تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' مجھے اس کا یہ جواب اچھا نہیں لگا۔ لیکن میں نے اپنے جذبات کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ معاملہ بہر حال اس کا ذاتی تھا۔ لہٰذا میں نے غیر جانبدارانہ لہجے میں کہا۔

''شمائلہ نے کہا تھا کہ وہ صبح وشام آپ کی بریت کی دعا مانگ رہی ہے۔''

''اسے میرے لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ خود کو آپ کی امانت سمجھتی ہے۔'' وہ کچھ نہیں بولا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی خالہ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ کچھ بزنس کا بھی ذکر آیا تھا۔''

''یقیناً انہوں نے کہا ہوگا کہ یہ سارا بزنس ان کا ہے اور میں ان کی دولت پر چھرے اڑا رہا ہوں۔ یہ بات سن کر آپ کو خود سمجھ جانا چاہیے تھا کہ میں نے ان کی بیٹی کے ساتھ منگنی کیوں توڑی ہے۔''

''انہوں نے اس انداز میں بات نہیں کی۔''

''آپ میرے وکیل ہیں۔'' اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''آپ کو میری وکالت کرنا چاہیے۔ خالہ مجھے بدنام کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خالو کی وفات کے وقت فیکٹری میں چند مشینوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے بھی آدھی مشینیں خراب پڑی تھیں۔ اگر میں فیکٹری کا انتظام نہیں سنبھالتا تو آج وہاں دھول اڑ رہی ہوتی۔ میں خالہ سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ ان کی فیکٹری کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا لیکن پتا نہیں بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔''

پہلی ملاقات میں میرے ذہن میں اس کا جو اچھا تصور بنا تھا، وہ بدلنا شروع ہو گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو خود کو آزاد، خود مختار اور بے نیاز سمجھتے ہیں۔ دوسروں کا احسان بھی لیتے ہیں لیکن احسان مندی کے اظہار میں اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔

''یہ آپ کا خاندانی مسئلہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا دخل دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جہاں تک وکالت کا تعلق ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ آپ کا یہاں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں آپ کی وکالت عمدہ طریقے سے کر رہا ہوں اور وکالت کے ذکر سے یاد آیا کہ پولیس آپ کی بیوی کی بیمہ پالیسی کو بہت اہمیت دے رہی ہے۔ آپ نے اتنی بھاری بیمہ پالیسی کیوں خریدی تھی؟''

''بیمہ پالیسی خریدنا کوئی جرم نہیں اور جس پالیسی کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ ڈبل پالیسی ہے، یہ میاں بیوی کی اکٹھی پالیسی ہے۔ کاروباری لوگ عموماً انکم ٹیکس بچانے کے لیے بیمہ پالیسی خریدتے ہیں اور میرا بھی یہی مقصد تھا۔''

شروع میں مجھے اس کے چہرے پر جو ذہانت دکھائی دی تھی۔ اب اس میں مکاری کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اس نے اپنی خالہ کی بیٹی کو اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ بیچ میں جائیداد کی الجھن پیدا ہو گئی تھی لیکن جائیداد کو پھر بھی نہیں چھوڑا۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ پہلے اپنی خالہ کی جائیداد ان کے حوالے کرتا پھر منگنی توڑتا۔ پانچ چھ ہفتوں بعد پولیس نے کیس کا چالان پیش کر دیا اس کے بعد چند ماہ تک یونہی تاریخیں پڑتی رہیں پھر بالآخر گواہوں کے بیانات کی باری آ گئی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ استغاثہ کی طرف سے جو پہلا گواہ پیش ہوا اس کا نام الطاف خان تھا۔ اور وہ دبیر الحسن کا ڈرائیور تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ عرصہ سات سال سے ملزم کے پاس کام کر رہا تھا۔ اسے فیکٹری کے اصل مالک دبیر الحسن کے خالو شوکت علی نے ملازم رکھا تھا۔ شروع میں وہ شوکت علی کا ڈرائیور تھا لیکن پانچ سال قبل شوکت علی کا انتقال ہو گیا تو اس کی ڈیوٹی تبدیل ہو گئی۔ اسے اسٹاف کا ڈرائیور بنا دیا گیا۔ وکیل استغاثہ کے استفسار پر اس نے بتایا کہ لینڈ روور اسٹیشن ویگن کو اسٹاف کار کہا جاتا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اسٹیشن ویگن کے انجن کی خرابی کی وجہ سے وہ کچھ روز سے

دبیرالحسن کی کار اسٹاف کار کے طور پر استعمال کررہا تھا۔

حادثے والے روز وہ عالیہ حسن کو گھر سے لے کر آیا تھا اور پھر چائے پینے کے لیے کینٹین میں چلا گیا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹیشن ویگن کے پیچھے کھڑی کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے شور کی آواز سنی تو دوڑ کر باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ عالیہ حسن اسٹیشن ویگن کے سامنے زمین پر پڑی تھی اور دبیرالحسن اسے اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''تم عالیہ حسن کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟''

''تقریباً تین سال سے۔'' وکیل استغاثہ اپنی فائل پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔

''میری معلومات کے مطابق دبیرالحسن اور عالیہ حسن کی شادی تقریباً دو سال پہلے ہوئی تھی۔ تم مقتولہ کو پہلے سے کیسے جانتے تھے؟''

''عالیہ حسن پہلے فیکٹری میں ملازمت کرتی تھی۔ ٹائپسٹ تھی۔ بعد میں اس نے دبیرالحسن صاحب سے شادی کرلی۔''

''اسٹیشن ویگن کتنے دنوں سے خراب تھی؟''

''تقریباً پانچ چھ روز سے۔''

''اسے ٹھیک کیوں نہیں کرایا گیا تھا۔''

''میں نے دبیرالحسن صاحب کو بتادیا تھا کہ گاڑی خراب ہے۔''

''اس پر دبیرالحسن صاحب نے کیا جواب دیا؟''

''انہوں نے کہا کہ وہ خود ہی گاڑی ورکشاپ لے جائیں گے۔''

''کیا ملزم ہمیشہ خود ہی گاڑی کو ورکشاپ لے جاتا تھا؟''

''کبھی خود لے جاتے تھے اور کبھی مجھے لے جانے کا کہہ دیتے تھے۔''

''ملزم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ انجن کی ٹائمنگ ٹھیک نہیں تھی کیا اس خرابی کی وجہ سے حادثہ پیش آسکتا ہے؟''

میں نے فوراً کھڑے ہوکر اعتراض کیا اور کہا۔ ''جناب عالی حادثہ ہوچکا ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک امر واقعہ ہے اور امر واقعہ کے امکان کے بارے میں سوال کرنا بے معنی بات ہے۔'' جج نے اعتراض درست تسلیم کیا۔ وکیل استغاثہ نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ملزم کے ساتھ ہسپتال گئے تھے؟'' ''جی ہاں دبیرالحسن صاحب نے اپنی بیوی کو گاڑی میں ڈالا اور مجھے کار ڈرائیو کرنے کا حکم دیا۔ قادری صاحب کو بھی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ قادری صاحب اکاؤنٹنٹ ہیں۔''

''کیا اس وقت عالیہ ہوش میں تھی؟''

''ان کی آواز نہیں آرہی تھی۔ دبیر صاحب نے انہیں سیٹ پر لٹا رکھا تھا۔ اور مجھے تیز گاڑی چلانے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن میں نے ان کے اس حکم پر عمل نہیں کیا کیونکہ ایسے موقع پر اگر ڈرائیور ہوش کھو بیٹھے تو حادثہ بھی ہوسکتا ہے۔''

وکیل استغاثہ کے سوالات ختم ہوئے تو میں جج کی اجازت سے گواہ پر جرح کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔

''الطاف خان! تم نے بتایا ہے کہ حادثے کے وقت تم کینٹین میں تھے۔'' میں نے کہا۔ ''کینٹین جائے حادثہ سے کتنی دور تھی؟''

''میں ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ہوگی۔''

''جب تم شور سن کر باہر نکلے تو تم نے کیا دیکھا؟''

''میں نے دیکھا کہ عالیہ حسن زمین پر پڑی ہیں اور دبیر صاحب انہیں اٹھانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''تم نے جب کار اسٹیشن ویگن کے پیچھے کھڑی کی تھی تو دونوں گاڑیوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟''

''تقریباً ایک فٹ کا ہوگا۔''

''ایکسیڈنٹ کے بعد درمیانی فاصلہ کتنا ہوگیا ہوگا؟''

''اس پر تو میں نے غور نہیں کیا۔''

''ہوسکتا ہے تم نے غور نہ کیا ہو لیکن دیکھا ضرور ہوگا' کیونکہ تم نے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا کہ تمہیں کار نکالنے میں دقت پیش آئی تھی۔''

وہ سوچتا ہوا بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس وقت درمیانی فاصلہ چار یا پانچ فٹ کے قریب ہوگا۔''

اس سوال پر میں نے جرح ختم کردی۔

❀......❀......❀

دیگر گواہوں کا ذکر کرنے سے پہلے ایک بات عرض کروں کہ ان بیانات کے درمیان کئی کئی ماہ کا وقفہ ہے لیکن میں اس وقفے اور اس دوران ہونے والی کارروائیوں کا ذکر نہیں کررہا کیونکہ ڈرتا ہوں کہ آپ بور نہ ہوجائیں۔ یوں بھی قارئین ڈائجسٹ کوئی ڈائجسٹو (Digestive) یعنی زود ہضم شے مانگتے ہیں اور قارئین کی پسند کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے اور شاید ثواب کا کام بھی۔ بشرطیکہ ضرورت اور پسند ناجائز نہ ہو۔

اس مختصر تمہید کے بعد آیئے اب اگلے گواہ سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس کا آدھا نام آپ سن چکے ہیں۔ پورا نام اشفاق احمد قادری ہے۔ یہ دبیرالحسن کی فیکٹری کا اکاؤنٹنٹ تھا۔ ابتدائی بیان میں اس نے بھی وہی کچھ کہا جو ڈرائیور الطاف خان نے کہا تھا۔

البتہ چند اضافی باتیں بھی بتائیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ عالیہ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی ایک عام سی لڑکی تھی۔ شکل وصورت بھی بس واجبی سی تھی۔ دفتر کے کلرک بھی اس پر نظر التفات ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن جب دبیر صاحب نے انہیں پسند کیا تو سب کو تعجب ہوا۔ حالانکہ انہیں اس سے لاکھ درجے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔

اشفاق قادری بیان جاری رکھتے ہوا بولا۔ ''جب دبیرالحسن نے اپنی بیوی کی پچاس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی خریدی تھی تو اس بے جوڑ شادی کا کچھ کچھ مقصد میری سمجھ میں آگیا تھا اور جب عالیہ حسن دبیر صاحب کی گاڑی کے نیچے آکر ہلاک ہوگئی تو ساری بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔''

اس نے بیان میں اور بھی کچھ کہا تھا لیکن میں نے اس پر سیلف سنسر کی قینچی چلادی ہے۔ اشفاق احمد قادری کا بیان ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے اس سے چند سوالات کیے اس کے بعد میری باری آئی۔

''قادری صاحب! کیا آپ مسلمان ہیں؟'' جواب ملا۔

''الحمدللہ۔''

''کیا آپ اس عدالت کو بتائیں گے کہ اسلام نے نچلے اور اوپر والے طبقے کی کیا تعریف کی ہے؟'' وکیل استغاثہ نے جلدی سے اٹھ کر کہا۔

''جناب والا! مجھے اعتراض ہے یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے۔''

جج نے مجھے سوال کی وضاحت کرنے کے لیے

کہا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ جنابِ عالی! گواہ نے کہا ہے کہ عالیہ حسن نچلے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ گواہ کے نزدیک نچلے طبقے کی کیا تعریف ہے۔ جج نے اعتراض مسترد کردیا اور گواہ کو جواب دینے کے لیے کہا۔

"جناب میں اتنا عالم فاضل نہیں ہوں۔" قادری نے کہا۔

"میں نے عام فہم معنوں میں نچلے طبقے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔"

"قادری صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ نے کہا ہے کہ عالیہ حسن کی شکل وصورت واجبی سی تھی اور دفتر کے کلرک بھی اس پر نظر التفات ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیا آپ عدالت کو بتائیں گے کہ نظر التفات سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اس کے پرکھنے کا کیا پیمانہ ہے اور اس بات کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ دفتر کے لوگ عالیہ حسن پر نظر التفات نہیں ڈالتے تھے اور کیا اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ آپ کے دفتر کے کلرک ہر خوب صورت لڑکی پر نظر التفات ڈالتے ہیں؟"

"آپ تو بہت زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"قادری صاحب! میں تو آپ کے سامنے فرش پر کھڑا ہوں۔"

حاضرین نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"آرڈر پلیز!" جج صاحب نے کہا پھر گواہ سے مخاطب ہوکر بولا۔ "آپ سے جو سوال کیا گیا ہے اس کا جواب دیں۔" قادری بغلیں جھانکتا ہوا بولا۔ "میں نے صرف اپنے تاثرات بیان کیے ہیں۔ میں کوئی ثبوت پیش نہیں کرسکتا۔"

"آپ نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ جب ملزم نے عالیہ سے شادی کرلی تو سب کو تعجب ہوا تھا' کیونکہ اسے عالیہ سے لاکھ درجے اچھی لڑکی مل سکتی تھی کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عالیہ ایک بری لڑکی تھی؟"

"جی نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"آپ نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ جب ملزم نے اپنی بیوی کی انشورنس کروائی تو آپ کو اس بے جوڑ شادی کا مقصد سمجھ میں آ گیا۔ کیا آپ اپنی اس بات کی تشریح کریں گے۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے وہی میرا مطلب ہے اس سے زیادہ میں تشریح نہیں کرسکتا۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم نے عالیہ کو قتل کرنے کے لیے شادی کی تھی؟"

"آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔" جج نے گواہ کو مخاطب کرکے کہا۔

"اشاروں میں بات نہ کریں' جو سوال آپ سے کیا جاتا ہے اس کا صاف اور سیدھا جواب دیں۔"

"میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ملزم نے عالیہ کو قتل کرنے کے لیے اس سے شادی کی تھی۔"

"جج نے پوچھا۔ "تو پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

قادری الجھن میں پھنس گیا۔ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ملزم کی نیت ٹھیک نہیں تھی لیکن میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

جج نے غصے سے کہا۔ "اس عدالت کو آپ کے خیالات سننے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ اپنے بیان کو واقعات اور حقائق تک رکھیں جس بات کا آپ ثبوت پیش نہیں کرسکتے اس کا ذکر نہ کریں۔" پھر جج صاحب مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

"بیگ صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔"

میں نے گواہ سے مخاطب ہوکر کہا۔ "قادری صاحب! آپ نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ عالیہ حسن ملزم کی گاڑی کے نیچے آکر ہلاک ہوئی تھی' جبکہ گواہوں کے بیانات سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ عالیہ حسن گاڑی کے نیچے نہیں آئی بلکہ وہ بمپر سے ٹکرا کر ہلاک ہوئی تھی۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"بمپر سے ٹکرانا اور گاڑی کے نیچے آنا دوسرے لفظوں میں گاڑی کے نیچے کچلے جانا دو مختلف باتیں ہیں۔"

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔"

میں نے جج سے مخاطب ہوکر کہا۔ "جنابِ عالی! گواہ نے حقائق کم اور اپنے خیالات زیادہ بیان کیے ہیں جیسا کہ آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ گواہ کا بیان جانبداری اور بدنیتی پر مبنی ہے سبب اس کا یہ ہے کہ میرے موکل نے اسے بعض بدعنوانیوں کے الزام میں ملازمت سے جواب دے دیا تھا۔ میرے ریمارکس پر وکیل استغاثہ نے سخت احتجاج کیا اور کہا کہ گواہ کو سچ بولنے کے جرم میں ملازمت سے برخاست کیا گیا ہے۔"

اس کے بعد استغاثہ کی طرف سے چند اور گواہ پیش کیے گئے جن کے بیانات اور جرح وغیرہ پر کئی مہینے ضائع ہوئے لیکن ان کے بیانات میں کوئی ٹھوس بات نہ تھی۔ آخر میں استغاثہ کی طرف سے چند گواہ پیش کیے گئے جو جائے حادثہ پر موجود نہیں تھے۔ ان میں عالیہ کی چھوٹی بہن فرزانہ بھی تھی۔ وہ عالیہ سے دو سال چھوٹی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور چہرے پر پختگی پائی جاتی تھی۔

تعارفی کلمات کے بعد اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "جنابِ عالی! میں ایک گھریلو لڑکی ہوں۔ میں نے پہلی بار عدالت کے اندر قدم رکھا ہے۔ میں یہاں کے آداب سے واقف نہیں نہ ہی مجھے قانونی موشگافیوں کی سوجھ بوجھ ہے۔ میں توہین عدالت کا ارتکاب کرنے نہیں آئی لیکن اگر میری زبان سے کوئی ایسا کلمہ ادا ہوجائے جو اس زمرے میں آتا ہو تو براہ مہربانی میری نادانی سمجھ کر معاف کردیا جائے۔"

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یونیورسٹی کے ڈبیٹ اور مقدمے کی سماعت میں بہت فرق ہوتا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ جج اس کے فن تقریر سے خاصا محظوظ ہورہا تھا اس لیے میں نے اعتراض اٹھانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔

فرزانہ بیان جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جنابِ عالی! کہنے والے کہتے ہیں کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے ہر انسان کی موت کا وقت مقرر ہوتا ہے' پہلے میں اس مقولے پر یقین رکھتی تھی۔ لیکن جب میری پیاری بہن عالیہ کو اس سفاک انسان نے حصول زر کی خاطر موت کی نیند سلا دیا تو میرے دل میں بے شمار سوالات پیدا ہوئے۔" اس نے ہاتھ لمبا کرکے دبیر الحسن کی طرف اشارہ کیا جو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ اگر موت کا وقت مقرر ہوتا ہے تو پھر ملک کے ضابطہ فوجداری سے قتل سے متعلق تمام قوانین خارج کردینے چاہیے کسی کو سزا نہیں ملنی چاہیے کیونکہ قاتل تو محض خدا کے فیصلے پر عمل کرتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک جلاد عدالت کے فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے قاتل کو پھانسی دے دیتا ہے۔ لیکن جب غور کیا تو مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ اس مقدمے میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سورہ بقرہ کی ایک آیت میں لکھا ہے اور اے عقلمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ یعنی قتل کے بدلے قتل کرنے میں

زندگی ہے۔ موت کا اگر وقت مقرر ہوتا تو انسان کسی جانور کے ہاتھوں ہلاک نہ ہوتا اور نہ ہی خدا کو قتل کے بدلے قتل کا قانون مقرر کرنا پڑتا۔ اس بات کا ادراک حاصل ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ خود عدالت جاؤں گی اور اپنی بہن کے قاتل کو سزائے موت دلوانے کی پوری کوشش کروں گی۔" جج نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"بی بی جو کچھ تم نے کہا ہے وہ ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں تم وہ بات بتاؤ جو ہم نہیں جانتے' ملزم کا قاتل ہونا ثابت کرو۔ اس کے بعد قصاص کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

"جناب والا! یہ بات تو ثابت شدہ ہے کہ عالیہ دبیر الحسن کے ہاتھوں ہلاک ہوئی۔" فرزانہ نے کہا۔ "اب صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اس معاملے میں اس کی نیت شامل تھی یا وہ واقعی حادثہ تھا۔" یہ نکتہ خاصا وزنی تھا لیکن کسی کی نیت کے بارے میں اندازہ لگانا آسان کام نہیں تھا۔ فرزانہ بیان جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "چونکہ ہمارے مالی حالات اچھے نہیں ہیں اس لیے عالیہ کو ملازمت کے لیے گھر سے نکلنا پڑا۔ ملازمت کے چند ماہ خیریت سے گزر گئے۔ ایک دن عالیہ نے مجھے بتایا کہ اس کا باس اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ اس کا باس کوئی معمر اور عیال دار شخص ہوگا لہٰذا میں نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ ایک دن یہ شخص" اس نے پھر انگلی سے اشارہ کیا۔ "عالیہ کو اپنی کار میں چھوڑنے آیا۔ امی نے اسے اخلاقاً اندر بلا لیا اور چائے پلائی۔ اس کے اخلاق اور انکسار نے سب کو متاثر کیا اور ہم جیسے غریب تو امیروں کی ایک مسکراہٹ پر ہی پگھل جاتے ہیں۔ ہم اس شخص کے مکر و فریب کو اخلاق سمجھتے رہے۔ اور بیوقوف بنتے رہے۔ عالیہ کو شروع میں اس کی محبت کا یقین نہیں آتا تھا لیکن جب اسے یقین آ گیا تو وہ پاگل سی ہوگئی۔ اس نے ہم سب سے کہہ دیا کہ وہ دبیر سے شادی کرے گی یا اپنی جان دے دے گی۔

اس شخص نے عالیہ سے کہا کہ وہ اپنا آدھا بزنس عالیہ کے نام کر دے گا۔ لیکن شادی کے بعد انکشاف ہوا کہ سارا بزنس اس کی خالہ کا ہے۔ اور یہ کہ دبیر اپنی خالہ کی بیٹی سے منسوب ہے۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ خالہ نے اپنا کاروبار اس کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے کچھ رقم ادا کر چکا ہے اور تقریباً پچاس لاکھ روپیہ باقی ہے۔ جب مجھے عالیہ نے بتایا کہ دبیر نے اس کی پچاس لاکھ روپے کی بیمہ پالیسی خریدی ہے تو میرے دل میں فوراً خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں دبیر چالاکی سے عالیہ کو ٹھکانے نہ لگا دے۔ میں نے اپنے خیال سے عالیہ کو آگاہ کیا۔ یہ سن کر وہ گھبرا کر بولی کہ مجھے بھی دبیر کی بعض باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی باتوں سے مصنوعی پن چھلکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دبیر مجھ سے محبت نہیں کرتا بلکہ محبت کی اداکاری کر رہا ہے۔"

بیمہ کے بارے میں اس نے کہا کہ "دبیر نے یہ پالیسی عالیہ کے تحفظ کے لیے خریدی تھی لیکن جیسا کہ حالات سے ظاہر ہے کہ دبیر نے یہ پالیسی اپنے تحفظ کے لیے خریدی تھی فیکٹری خریدنے کے لیے خریدی تھی۔"

فرزانہ کا بیان خاصا طویل تھا لیکن اس میں کوئی ٹھوس بات نہیں تھی۔ کم از کم قانونی نقطۂ نظر سے کوئی قابل ذکر مواد نہ تھا۔ اس کا بیان ختم ہوا تو جج نے مجھے جرح کرنے کے لیے کھڑا کیا۔

میں نے کٹہرے کے قریب جا کے کہا۔ "فرزانہ بی بی! تم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ مسئلہ واردات کو ثابت کرنے کا نہیں نیت ثابت کرنے کا ہے۔ میں اس بات سے پوری طرح متفق ہوں۔ تاہم تم نے اپنے بیان میں کوئی ایسی ٹھوس شہادت پیش نہیں کی جس سے یہ اندازہ ہو کہ ملزم دبیر الحسن اپنی بیوی کو قتل کرنے کی نیت رکھتا تھا۔ جہاں تک انشورنس پالیسی کا تعلق ہے تو ہم کیوں نہ تمہاری مرحومہ بہن کی اس بات سے اتفاق کریں کہ ملزم نے وہ پالیسی اس کے تحفظ کے لیے خریدی تھی؟" وہ پر جوش لہجے میں بولی۔

"کیا آپ کو یہ بات نظر نہیں آتی کہ اس نے ایک خوب صورت اور صاحب جائیداد لڑکی کو چھوڑ کر ایک غریب اور معمولی لڑکی سے شادی کر لی آخر اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟"

"بی بی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے' تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ یہاں تک کہ بعض وارثان تخت نے معمولی لڑکیوں کی خاطر تخت و تاج ٹھکرا دیا۔ اس ضمن میں ایک اصولی بات بیان کرنا چاہتا ہوں' جب بات رشتے ناتے کی ہو تو لڑکی کو پرکھنے کے دو معیار سامنے آتے ہیں۔ ایک معیار کو عمومی اور دوسرے کو خصوصی کہا جاتا ہے۔ عمومی معیار یہ ہے کہ لڑکی خوب صورت ہو صاحب جائیداد ہو' اعلیٰ نسب ہو اور عمر زیادہ نہ ہو۔ خصوصی معیار کا تعلق انفرادی پسند سے ہے۔ بعض مرد منفرد طبیعت کے مالک ہوتے ہیں' وہ شریک حیات کے انتخاب میں عمومی معیار کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور عموماً ایسی لڑکیوں کا انتخاب کرتے ہیں جو بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ دراصل یہ منفرد لوگ بڑے باریک بین ہوتے ہیں۔ ان کی نظر باطنی خوبیوں کو دیکھتی ہے' یہی وجہ ہے کہ ان کی پسند عام ڈگر سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔"

جج نے اس بحث کو ختم کر دیا اور مقدمے کی سماعت کی اگلی تاریخ تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

❀......❀......❀

فرزانہ کی گواہی کے بعد دو گواہ اور پیش ہوئے۔ میں نے کوئی گواہ صفائی کا پیش نہیں کیا۔ بعد ازاں وکیل استغاثہ نے ملزم کے خلاف دلائل پیش کیے اور سزائے موت کا مطالبہ کیا۔

میں نے صفائی کے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! استغاثہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ملزم نے طے شدہ منصوبے کے مطابق عالیہ سے شادی کی تھی تاکہ بعد میں اس کی بیمہ پالیسی کی رقم وصول کرنے کے لیے اسے قتل کر دے لیکن استغاثہ اپنے موقف کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام رہا ہے۔

اس ضمن میں ایک اہم پوائنٹ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب کوئی شخص سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کسی کو قتل کرتا ہے تو وہ ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جس میں ناکامی کا کوئی اندیشہ نہ ہو لیکن یہاں پر حادثے کی جو نوعیت بیان کی گئی ہے وہ قطعی ناقص اور غیر یقینی ہے جیسا کہ گواہوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹیشن ویگن جھٹکا کھا کر چار پانچ فٹ آگے گئی تھی۔ اتنے فاصلے تک ٹکر کی قوت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات لوگ پوری رفتار سے چلنے والی گاڑی سے بھی ٹکرا کر بچ جاتے ہیں۔ ایسی بیسیوں مثالیں پولیس اور اسپتالوں سے مل جائیں گی۔ لہٰذا ایک قاتل جو کئی سالوں سے قتل کی منصوبہ بندی کر رہا ہو اتنا ناقص طریقہ استعمال نہیں کر سکتا۔"

چونکہ یہاں میاں بیوی ایک دوسرے کے

معمولات اور کمزوریوں سے واقف ہوتے ہیں اس لیے اگر وہ ایک دوسرے کو قتل کرنا چاہیں تو کوئی سہل اور یقینی طریقہ اختیار کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پولیس نے اپنی رپورٹ میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسٹیشن ویگن کے انجن میں خرابی پائی جاتی تھی۔ گواہوں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ ملزم نے اپنی بیوی کو اسپتال پہنچانے میں ہرگز دیر نہیں لگائی۔ لہٰذا میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ ملزم کو باعزت بری کیا جائے۔''

جج نے مقدمے کے فیصلے کی تاریخ دے دی۔ اگلی تاریخ پر مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے فریقین کے اعزاء کے علاوہ کافی تعداد میں اخباری نمائندے بھی موجود تھے۔ جج نے صرف پانچ منٹ میں فیصلہ سنادیا۔ دبیر الحسن کو ناکافی ثبوت کی بناء پر بری کردیا گیا۔

برآمدے میں فرزانہ عثمان نے عدالت کے فیصلے کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور دبیر کے علاوہ وکیلوں کو بھی کھری کھری سنائیں۔ لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ تقریباً چھ سات ماہ بعد ایک روز ایک پچیس چھبیس سالہ خاتون میرے دفتر میں آئی اس کے بال کٹے ہوئے اور وہ وضع قطع سے ماڈرن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

اس نے پرس سے میرا کارڈ نکالا اور میرے سامنے کرتی ہوئی بولی۔ ''کیا یہ کارڈ آپ ہی کا ہے؟'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر وہ بولی۔ ''میرا نام غزالہ حسن ہے۔ میرے شوہر کو تھوڑی دیر پہلے پولیس نے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔ انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا آپ پہلے بھی ایک کیس میں ان کی وکالت کرچکے ہیں۔''

''آپ کے شوہر کا نام کیا ہے؟''

''دبیر الحسن۔''

''اوہ...... کیا پولیس نے انہیں دوبارہ گرفتار کرلیا ہے۔'' مجھے خیال آیا شاید عالیہ کے ورثاء عدالت چلے گئے ہوں، ہائی کورٹ نے کسی پوائنٹ کی بناء پر دوبارہ کیس کی سماعت کرنے کا حکم دے دیا ہو۔ میں نے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں اس کے ہونٹ حرکت میں آئے۔ ''نہیں...... نہیں یہ دوسرا معاملہ ہے۔ پولیس نے اسے اپنی خالہ زاد بہن شمائلہ کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔''

''اوہ میرے خدا یہ کب کی بات ہے؟''

''تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہیں۔''

''تم نے کیا کہا دبیر الحسن تمہارے شوہر ہیں؟''

''جی ہاں ہماری حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔''

''واردات کہاں ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اور اس کی تفصیل کیا ہے؟''

''لیکن ٹھہریے بات صرف واردات کی نہیں ہے آپ یقیناً یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ غزالہ حسن کون ہے؟ اور وہ دبیر الحسن کی بیوی کیسے بنی؟'' وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکی پھر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔

''میں ایک انشورنس کمپنی کے کلیم ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتی ہوں۔ دبیر الحسن سے میری پہلی ملاقات اپنے دفتر میں ہوئی تھی وہ ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے دفتر میں آتا تھا اور کئی کئی گھنٹے وہاں بیٹھا رہتا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک کم گو اور حساس شخص ہے۔ ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو لڑکیوں سے بے تکلف ہونے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ وہ گفتگو کرتا تو نہایت نرمی اور شائستگی کے ساتھ۔ اس کے لہجے میں ایک طرح کی شفقت پائی جاتی تھی۔ چند روز کے بعد میں نے اسے اپنا آئیڈیل سمجھنا شروع کردیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی بیوی کے انشورنس کلیم کے سلسلے میں وہاں آتا ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس کی بیوی ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی تھی۔ اس کا کلیم تقریباً منظور ہوگیا تھا لیکن اچانک محکمے نے اس کی بیوی کا حادثاتی موت کا سرٹیفکیٹ طلب کرلیا۔ اس کے بعد اس کا آنا جانا بند ہوگیا۔ جب وہ سرٹیفکیٹ لے کر آیا تو پہلے سے کمزور نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے انجانی سی خوشی محسوس کی جیسے اچانک کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔'' میں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔ ''دبیر صاحب آپ کہاں غائب ہوگئے تھے؟'' یہ بھی خیال نہیں رہا کہ ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں تھی۔

''میں ایک مقدمے میں پھنس گیا تھا۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''پولیس کا خیال تھا کہ میں نے اپنی بیوی کو خود ہلاک کیا ہے۔''

پتا نہیں کیوں میں فکر مندی ہوگئی۔ میں نے سوچا اتنا شائستہ اور نفیس آدمی کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا مقدمہ ختم ہوگیا؟''

''ہاں عدالت نے مجھے باعزت بری کردیا ہے۔'' میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اوہ خدا کا شکر ہے۔'' یہ سن کر اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''مس غزالہ! آپ نے کیوں خدا کا شکر ادا کیا؟''

میں جھینپ سی گئی۔ وہ کچھ نہیں بولا لیکن اس کی نظریں بتارہی تھیں کہ وہ میری دلی کیفیت کو سمجھ چکا ہے۔ دوسرے روز اس نے مجھے شام کی چائے کی دعوت دی۔ جسے میں نے فوراً منظور کرلیا۔ اس نے مجھے اپنی کار کا میک اور نمبر بتایا کہ وہ بغلی گلی میں میرا انتظار کرے گا۔ اگرچہ میں اس قسم کی پیش قدمی کی قائل نہیں ہوں لیکن اس کی یہ بات بھی مجھے اچھی لگی۔

وہ مجھے ایک شاندار ریستوران میں لے گیا اور چائے کے دوران میرے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ بعض لوگوں کے سامنے بات کرنے میں جھجک محسوس ہوتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ ڈھیروں باتیں کرنے کے بعد بھی جی نہیں بھرتا۔ دبیر مجھے ایسا ہی آدمی لگا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا اس کے ساتھ ساری زندگی باتیں کرنے کے باوجود بوریت نہیں ہوگی۔

پہلی ملاقات کے دوران ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ہوگئی جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں پھر ہم ہر دوسرے تیسرے روز ملنے لگے۔ دبیر چند مرتبہ ہمارے گھر بھی آیا اور سب ہی کو اچھا لگا۔ چند ہفتے قبل جب اس نے مجھے شادی کا پیغام دیا تو مجھے ہرگز کوئی تعجب نہیں ہوا۔

ہماری شادی کو آج پندرہواں دن ہے۔ دبیر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد مجھے الگ رکھے گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے شادی سے قبل ایک اپارٹمنٹ خرید لیا تھا۔ شادی کے دن سے ہم اس اپارٹمنٹ میں رہ رہے ہیں۔ آج صبح جب میں دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلی تو سیڑھیوں میں ایک لڑکی سے آمنا سامنا ہوگیا وہ ہمارے ہی اپارٹمنٹ کا پتا پوچھ رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ دبیر الحسن کی کزن ہے اور کسی ضروری کام کے سلسلے میں اس سے ملنے آئی ہے۔ اس نے اپنا نام شمائلہ بتایا...... دبیر نے دو مرتبہ سرسری طور پر اس کا ذکر کیا تھا۔ مجھے خیال

آیا کہ میں اسے اپنے بارے میں بتادوں لیکن پھر سوچا ہوسکتا ہے دبیر کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ چنانچہ میں نے اس کے ایڈریس کی تصدیق کر دی اور عمارت سے نکل گئی۔ کیونکہ دفتر کی گاڑی آنے والی تھی۔ یہ دوبئی چوک علامہ اقبال ٹاؤن کا علاقہ تھا۔ فلیٹ برساتی نالے کے سامنے دائیں جانب پھیلے ہوئے تھے۔

اب سے تقریباً دو گھنٹے پہلے دبیر نے مجھے فون کیا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اس نے بتایا کہ ایک حادثہ ہوگیا ہے اور مجھے جلد از جلد گھر پہنچنے کی تاکید کی۔ میں سارا کام چھوڑ کر گھر پہنچی تو وہاں ایک ہجوم نظر آیا۔ ہمارے فلیٹ کے اندر باہر پولیس کے آدمی پھر رہے تھے۔ دبیر کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ پولیس نے بتایا کہ اس نے اپنی کزن شمائلہ کو بالکونی سے نیچے گرا کر ہلاک کر دیا ہے۔ ہمارا فلیٹ تیسری منزل پر واقع ہے۔ شمائلہ موقع پر ہی سر کی چوٹ کی وجہ سے ہلاک ہوگئی تھی۔

میں نے دبیر کو جھنجوڑ کر پوچھا تو اس نے کہا کہ شمائلہ نے خودکشی کی ہے۔ میں نے اسے دھکا نہیں دیا۔ لیکن پولیس اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔

"پلیز آپ جلدی سے کچھ کریں۔ میرا مطلب ہے ضمانت کا کچھ انتظام کریں......!"

میں نے غور سے غزالہ حسن کی ساری بات سنی پھر پوچھا۔ "حادثے کے وقت فلیٹ میں اور کون تھا؟"

"دبیر کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔"

"میں آج شام تھانے جا کے دبیر سے ملوں گا اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"کک...... کیا مطلب؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا آپ یہ کیس ہاتھ میں نہیں لینا چاہتے؟"

"میں کیس کی پوری تفصیل سننے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔" وہ مایوس ہو کر چلی گئی۔

شام کو میں متعلقہ تھانے میں گیا اور ایس ایچ او سے بات کی اس نے مجھے بتایا کہ دبیر الحسن نے نصف درجن گواہوں کے سامنے شمائلہ کو بالکونی سے دھکا دیا تھا۔ گواہوں میں چند پڑوسیوں کے نام بھی تھے۔

میں حوالات کے دروازے پر گیا اور دبیر الحسن سے بات کی، وہ بہت خوفزدہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بے ربط الفاظ میں بتانے کی کوشش کی کہ اس نے شمائلہ کو دھکا نہیں دیا۔ بلکہ وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا اور میں نے اس کا کیس لینے سے انکار کر دیا۔

تقریباً ڈیڑھ پونے دو سال بعد میں سینٹرل جیل میں اپنے ایک موکل سے ملنے گیا وہاں سپرنٹنڈنٹ جیل کی زبانی پتا چلا کہ دبیر الحسن کو سزائے موت ہوگئی ہے اور دو روز بعد اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ سن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے میری خواہش پر ملاقات کی اجازت دے دی۔ ایک گارڈ مجھے موت کی کوٹھری تک لے گیا۔ دبیر الحسن جیل کے کپڑوں میں ملبوس کوٹھری کی دیوار کے ساتھ بیٹھا قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا اور اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور پہچانا نہیں جاتا تھا۔ گارڈ نے بلند آواز میں میری آمد سے آگاہ کیا۔ اس نے قرآن پاک بند کر دیا اور سلاخوں کے قریب آ کر خالی خالی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ پھر بولا۔ "بیگ صاحب کیا میری بخشش ہوجائے گی؟" میں نے براہ راست جواب دینے کے بجائے کہا۔

"خدا کی رحمت بہت وسیع ہے اور ہر شے پر حاوی ہے۔"

اس نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔ "میں نے پوچھا ہے کیا میری بخشش ہوجائے گی۔" میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "کیا تمہارے پاس ترجمے والا قرآن ہے؟"

"ہاں ترجمے والا قرآن ہے۔" وہ سورۃ النساء کی سترہویں آیت نکال کر اس کا ترجمہ پڑھنے لگا۔ "اور نہیں ہے توبہ ان لوگوں کے لیے جو بدیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت حاضر ہوجاتی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے اب توبہ کر لی ہے اور نہ ان لوگوں کے لیے توبہ ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

ترجمہ پڑھتے ہی دبیر الحسن کا جسم کانپنے لگا۔ اور اس نے رونا شروع کر دیا۔ پھر اس نے روتے ہوئے یوں دعا کی۔ "اے خدا! ایک دفعہ اور مہلت دے دے میں ساری زندگی تیری عبادت میں گزاروں گا اور کبھی کسی انسان کو دکھ نہیں دوں گا۔"

"اچھا! دبیر الحسن میں چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "خدا تمہارے گناہ معاف کرے۔" اچانک میں نے چونک کر پوچھا۔ "تم نے شمائلہ کو کیوں ہلاک کیا؟"

وہ اپنی نم آلود آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"خدا کا کلام میرے ہاتھ میں ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے شمائلہ کو قتل نہیں کیا۔ اس نے خودکشی کی تھی۔ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے وہ ایک دم جوش میں آگئی اور اٹھ کر بالکونی کی طرف بھاگی۔ میں اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ چھلانگ لگانے میں کامیاب ہوگئی۔ دیکھنے والوں نے یہی سمجھا کہ میں نے اسے دھکا دیا ہے۔ اگر آپ میرا مقدمہ ہاتھ میں لے لیتے تو میں ضرور بچ جاتا۔" قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "بیگ صاحب شاید آپ بھی مجھے نہ بچا سکتے کیونکہ میں بے گناہ نہیں ہوں۔ یہ سزا مجھے قدرت سے ملی ہے۔"

"کیا مطلب!" میں اچھل پڑا۔ وہ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو گھورتا ہوا بولا۔

"میں...... میں...... عالیہ کا قاتل ہوں۔"

میں پھر چونک کر اسے گھورنے لگا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ حادثہ تو اتفاقیہ ہی تھا لیکن جب ہم عالیہ کو کار میں ڈال کر اسپتال لے جا رہے تھے تو میری نیت خراب ہوگئی اور میں نے اس کے منہ اور ناک کو بند کر کے اس کی سانس کی آمد و رفت منقطع کر دی۔ اب جبکہ میری زندگی کے آخری دو دن رہ گئے ہیں تو گناہ کو چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں خدا میرے حال پر رحم کرے۔" اس نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔

میں خاموشی سے واپس ہولیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ دبیر نے اپنا فلیٹ اور نقد رقم جو لاکھوں روپے تھی، عالیہ کے والدین کے نام وصیت کر دی تھی۔ یہ وہی رقم تھی جو اس نے عالیہ کی بیمہ پالیسی کے کلیم میں وصول کی تھی۔

❖

دیر آید

مکرمی عمران احمد قریشی'
خلوص بھرا سلام قبول ہو'
میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے کیونکہ آپ نے میری حوصلہ افزائی کرکے میرے اندر لکھنے کی لگن کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ امید ہے التفات کا یہ سلسلہ برقرار رہے گا۔ ایک تازہ کاوش "دیر آید" حاضر خدمت ہے۔ امید ہے آپ اور قارئین کی توقع پر پورا اترے گی۔

والسلام
ریاض بٹ
حسن ابدال

ابھی ابھی سپاہی دلاور میرے سامنے چائے رکھ کر گیا تھا اور میں اس سے اٹھتی بھاپ کو بغور دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن کے عکس پر اپنے والد صاحب (مرحوم) کی صورت ابھر رہی تھی۔

ایک دن انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ چائے کو کس طرح ہمارے خون میں شامل کیا گیا تھا' یہ اس دور کی بات تھی جب چائے کا نام بھی نہیں تھا' لوگ دودھ دہی اور گھی مکھن کھاتے تھے پھر لپٹن والوں کی گاڑیاں گردش کرنے لگیں اور ان گاڑیوں میں بنی ہوئی چائے گلی گلی مفت تقسیم ہونے لگی۔ بات مالِ مفت اور دل بے رحم والی ہوگئی' اس طرح آہستہ آہستہ چائے ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگی۔

ابھی میں ان خیالوں میں ہی گم تھا کہ سپاہی دلاور کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''سر! چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے۔''

میں نے غور سے چائے کی پیالی کی طرف دیکھا' واقعی اس سے بھاپ اٹھنا بند ہوگئی تھی۔ جس طرح انسان کے جسم سے خون نکل جائے تو وہ ٹھنڈا ٹھار ہوجاتا ہے۔ میں نے سپاہی دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم یہی بات بتانے آئے تھے؟''

''او نہیں سر!'' وہ گڑبڑا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''چوہدری فیروز کا بندہ آیا ہے' میرا مطلب ہے نوکر آیا ہے اور آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''اچھا! تم یہ ٹھنڈی چائے لے جاؤ اور اسے بھیج دو۔'' اگلے چند منٹوں میں وہ بندہ میرے سامنے تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتادوں کہ چوہدری فیروز سے میں واقف تھا' وہ ایک دو بار میرے پاس آیا تھا' وہ مجھے اپنی مٹھی میں رکھنا چاہتا تھا لیکن میں محتاط تھا۔ اس معاملے میں اس لیے بات زیادہ آگے نہیں بڑھی تھی۔

''ہاں بھئی! چوہدری نے کیا پیغام بھیجا ہے؟'' یہ بندہ ایک بار پہلے بھی آچکا تھا اور مٹھائی کا ٹوکرا لے کر آیا تھا اپنے نومولود پوتے کی خوشی میں۔ ٹوکرا میں نے عملے میں بانٹ دیا تھا۔

یہ چوہدری کا خاص نوکر تھا' عمر چالیس سال' قد درمیانہ' بڑی بڑی مونچھیں اور چہرے سے سفاک لگتا تھا۔

''جناب! ایک جوان کو گولی لگ گئی ہے۔''

مجھے یاد آیا کہ آج تو چوہدری کے چھوٹے بیٹے نوروز کی شادی تھی۔ چوہدری نے مجھے اور اے ایس

آئی تنویر کو بھی مدعو کیا تھا لیکن ہم نے معذرت کرلی تھی۔ چوہدری کے دو بیٹے تھے۔ نوکر کی زبانی جو بات پتا چلی وہ مختصراً اس طرح ہے کہ نوروز کی برات جانے کے لیے تیار تھی' کچھ منچلوں نے ہوائی فائرنگ کی اور بھولی بھٹکی گولی ایک جوان کو لگ گئی' بقول نوکر کے گولی سیدھی سینے میں لگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے جوان نے دم توڑ دیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی تنویر کو بلا کر کہا۔

''سپاہی دلاور کو ساتھ لے جاؤ اور کاغذی کارروائی مکمل کرآؤ۔'' ظاہر ہے نوکر بھی چلا گیا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ ہوائی فائرنگ والی بات کتنی غلط ہے' اس سے اکثر ایسے حادثات ہوجاتے ہیں' خوشی کا اظہار کرنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔ میں جس دور کی بات کررہا ہوں اس دور میں چوہدری فیروز جیسے بندوں کے ہاں اس قسم کی فائرنگ ہوتی تھی' اسلحہ اتنا نہیں تھا جتنا آج کل ہے۔ آج کل تو عام لوگ بھی شادی بیاہ پر فائرنگ کرتے نظر آتے ہیں۔

''کہو بھئی رانا صاحب! سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔'' میں نے اس وقت استفسار کیا۔ جب وہ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ رانا نے حسب عادت سگریٹ سلگایا اور اس کا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے بولا۔

''سر! میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی ہے حالاں کہ چوہدری نے کہا تھا کہ اتفاقیہ حادثہ ہے پوسٹ مارٹم کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ کاغذوں کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔'' پھر اس نے تفصیل سے ساری کارروائی میرے گوش گزار کردی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے کہ خوشی میں ہوائی فائرنگ کی وجہ سے جوان کو گولی لگ گئی تھی' وہ چوہدری فیروز کی کوٹھی کے سامنے ایک ٹیلے پر کھڑا شاید برات کا نظارہ کررہا تھا' جوان کا نام امجد معلوم ہوا وہ ایک چھوٹے زمین دار کا بیٹا تھا۔ بقول رانا تنویر کے بڑا گھبرو اور خوب صورت جوان تھا۔ ابھی رانا نے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی تھی اس نے کہا۔

''سر! بظاہر تو اتفاقیہ حادثہ لگتا ہے' پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد ہی کسی حتمی نتیجے پر پہنچا جاسکتا تھا۔''

اگلے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی' ساتھ لاش بھی تھی۔

امجد (مرحوم) کے وارث آئے بیٹھے تھے۔ وہ لاش لے کر چلے گئے اور میں رپورٹ سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے لاش کا چہرہ دیکھا تھا' واقعی بڑا خوب صورت جوان تھا۔ رپورٹ کے مطابق اس کی موت سینے میں گولی لگنے سے واقع ہوئی تھی۔ گولی نے دل پھاڑ دیا تھا' یہ بھی لکھا تھا کہ دو چار منٹوں میں ہی جان نکل گئی تھی۔

میں نے امجد کے والد (جو کہ ظاہر ہے غم سے بہت زیادہ نڈھال تھا) سے پوچھا تھا۔

''بزرگو! آپ اس واقعہ کو اتفاقیہ سمجھتے ہیں یا......؟''

وہ صرف میرے منہ کی طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے حادثے کا شکار ہوا ہے' ابھی اسے زیادہ نہیں چھیڑنا چاہیے۔

دو دن بعد جب لاش کو دفنایا جاچکا تھا میں کانسٹیبل شمشاد کو ساتھ لے کر چوہدری فیروز کی حویلی پہنچ گیا۔ وہاں شادی وغیرہ کا ہنگامہ ختم ہوچکا تھا بلکہ چوہدری نے مجھے بعد میں بتایا تھا کہ اس واقعہ کے بعد باقی کام سادگی سے کیا گیا تھا۔

اس نے ہماری خاطر تواضع اعلیٰ قسم (دیسی گھی)

کی مٹھائی اور کستوری والے دودھ سے کی۔ کئی بار میں مجبور ہو جاتا تھا' ورنہ میرا دل بالکل بھی ایسی ضیافتوں پر خوشی سے راضی نہیں ہوتا تھا۔

''چوہدری صاحب! بیٹے کی شادی مبارک ہو۔'' میں نے رسم نبھاتے ہوئے کہا۔ شمشاد بھی میرا ہم آواز تھا۔

''خیر مبارک تھانیدار صاحب! شادی کا تو سارا پروگرام ہی غم کی دبیز چادر میں لپٹ گیا۔'' چوہدری نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''چوہدری صاحب! جو ہونا ہوتا ہے وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ میں نے رپورٹ مکمل کرنی ہے جنہوں نے فائرنگ کی تھی میں ان سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! وہ چار جوان تھے حالاں کہ میں نے منع کیا تھا لیکن نوروز کے جگری یار تھے اس لیے انہوں نے اپنی مرضی پوری کی۔''

پھر میرے دوبارہ کہنے پر وہ چاروں جوان میرے سامنے لائے تھے۔ ان کی عمریں اٹھارہ سے بائیس سال کے درمیان تھیں۔ چہرے سے لا ابالی اور بے فکرے لگتے تھے۔ وہ گھبرائے ہوئے بالکل نہیں تھے انہوں نے میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب دیئے اور یہ بھی کہ انہیں افسوس ہے' امجد کے ساتھ ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی نا انہوں نے جان بوجھ کر اسے گولی ماری ہے۔ دو کے پاس رائفل اور دو کے پاس ریوالور تھے اور باقاعدہ یہ اسلحہ لائسنس یافتہ تھا۔

انہوں نے میرے کہنے پر اپنے اپنے اسلحے کا مجھے معائنہ بھی کروایا پھر وہ مجھے اس جگہ لے گئے جہاں انہوں نے کھڑے ہو کر فائرنگ کی تھی۔ اسلحہ دیکھ کر ایک بات مجھے کھٹک گئی وہ بات میں ابھی آپ کو نہیں بتاؤں گا' ایک بات اور بھی تھی جس کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔ اس کے بعد ہم چوہدری سے رخصت لے کر تھانے میں واپس آ گئے' راستے میں کانسٹیبل شمشاد نے کہا۔

''سر! آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ واقعی اتفاقیہ واقعہ ہے میرا مطلب ہے......''

یہ اس کی عادت تھی وہ ہر بات مطلب ہی پر ختم کرتا تھا۔

''ابھی میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

یہ اسی رات کا ذکر ہے میں اور رانا' امجد (مرحوم) کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سامنے امجد کے والد اور محلے کے تین چار بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ چند رسمی باتیں کرنے کے بعد ہم نے بندوں کو باہر بھیج دیا۔ اب ہمارے سامنے امجد کے والد بیٹھے تھے۔

''بزرگو! یہ تو بتاؤ کہ آپ کے ذہن میں کیا ہے؟'' رانا نے پوچھا۔

''کیا مطلب جناب؟'' وہ الجھ گیا۔

''میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ کیا واقعی آپ اسے ایک اتفاقیہ حادثہ سمجھتے ہیں؟'' رانا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اتفاقیہ ہی ہے کیونکہ ہماری کسی کے ساتھ دشمنی تو ہے نہیں۔''

''اچھا یہ بتائیں کہ چوہدری فیروز کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟''

''بس رسمی علیک سلیک سمجھ لیں' اصل میں چوہدری صاحب اپنے جیسا کسی کو سمجھتے ہی نہیں۔ میں ایک عاجز سا بندہ ہوں اس لیے خود بھی ایسے لوگوں سے کنی کتراتا ہوں۔'' ہم نے کافی دیر اس کے ساتھ گپ شپ کے انداز میں باتیں کیں لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

ایک دو باتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے مجھے اس واقعہ کو اتفاقیہ سمجھنے میں تامل تھا۔

ہم تھانے میں واپس پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے' ہم تھانے کا انتظام و انصرام ایک سینئر اہلکار کے سپرد کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ہمارے پاس کوئی رپورٹ نہیں تھی' امجد کے والد نے بھی اسے اتفاقیہ حادثہ سمجھ لیا تھا۔

میں بڑی آسانی سے کاغذوں کا پیٹ بھر سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں کوئی غیر مرئی طاقت مجھے اس سے باز رکھ رہی تھی۔ کچھ شک بھی تھے۔ اگلے دن ہم نے اپنی مخبری کی مشینری کو متحرک کر دیا تھا۔

آج میں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں جرح کو کافی مختصر لکھتا ہوں' اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہانی طویل ہو جائے اس لیے...... یہ نا سمجھ لیجیے گا کہ صرف زبانی جمع خرچ کیا ہے۔

ہم تو بال کی کھال اتار کر کسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ دو تین دن تک ہمارے پاس مخبروں کی رپورٹیں آتی رہیں۔

ہم نے اس دوران چوہدری کو پیغام بھجوا دیا کہ یہ اتفاقیہ حادثہ ہی لگتا ہے' اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ ہمیں اس پر کسی قسم کا شک تھا بلکہ حفظِ ماتقدم کے طور پر یہ کیا تھا۔

مخبروں کی رپورٹوں کی روشنی میں جو باتیں ہم تک پہنچیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ......

امجد اکیلا رہ گیا تھا' اس کی والدہ اور دو بھائی ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

امجد کے باپ نے سینے پر صبر کی سل رکھ کر کوشش کی تھی کہ امجد کو کسی محرومی کا احساس نہ ہو۔ وہ اپنے مقصد میں کسی حد کامیاب ہوا تھا۔ یہ ایک الگ بحث تھی اس کی (امجد) منگنی ہو گئی تھی' چار پانچ ماہ بعد اس کی شادی تھی۔ عشق محبت کا کوئی چکر بظاہر نہیں تھا' کسی کے ساتھ دشمنی کے متعلق بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

امجد کے قریبی دوستوں سے بھی مخبروں نے اپنے انداز میں اندر کی باتیں معلوم کی تھیں لیکن کوئی سن گن نہیں ملی تھی۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ جس لڑکی کے ساتھ امجد کی منگنی ہوئی تھی ایک اور لڑکا بھی اس پر نظر رکھتا تھا اور لڑکے کے والدین باقاعدہ رشتہ لے کر لڑکی کے گھر گئے تھے لیکن انکار ہو گیا تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ لڑکا شرابی کبابی تھا' آج کل آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ رشتہ نہ ملنے پر لڑکی کو یا اس کے والدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' ہمارے دور میں بھی ایسے واقعات ہونا بعید از قیاس نہیں تھا۔

ہمیں ایک لائن مل گئی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ (مرحوم) کے والد نے کسی قسم کا شک ظاہر نہیں کیا تھا' نا کوئی باقاعدہ رپورٹ تھی کہ امجد کا قتل کیا گیا ہے' ایسے کیس بھی میری سروس میں ہوئے تھے۔ ہم عدالت میں تو بیٹھے نہیں تھے کہ از خود نوٹس لیتے۔

میں نے اور رانا تنویر نے مل کر ایک فیصلہ کیا اور امجد کے والد کو بلا کر اپنے تحفظات سے آگاہ کر دیا۔

پھر اس کی طرف سے رپورٹ درج کروانے میں ہمیں آسانی ہو گئی' ساتھ ہی اس کو یہ بھی کہہ دیا کہ کسی کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ لوگوں کو یہی تاثر دیتا رہے کہ یہ ایک اتفاقی واقعہ ہی ہے۔

اب ہم تفتیش کی گاڑی کو دوڑا سکتے تھے۔ شام کے وقت ہم نے شرابی بیٹے اور اس کے باپ کو بلا لیا۔

باپ معزز لگتا تھا لیکن بیٹا شکل سے ہی آوارہ اور شرابی لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی مخصوص سرخی اس بات پر دلالت کرتی تھی' ذرا رعب سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس کے باپ نے اسے جھڑک دیا۔

"بدبخت...... خاموش رہ' یہ تھانہ ہے تمہارے دوستوں کی بیٹھک نہیں ہے۔"

جو بات میں اسے کہنا چاہتا تھا وہ اس کے باپ نے کہہ دی تھی۔ باپ واقعی سلجھا ہوا اور پڑھا لکھا لگتا تھا۔

میں نے باپ کو عزت سے بٹھایا لیکن لڑکے کو کہا کہ وہ کھڑا رہے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کھول رہا ہے۔

"بزرگو! میں نے آپ کو اس لیے زحمت دی ہے کہ جب آپ کو پتا تھا کہ آپ کا بیٹا ٹھیک نہیں ہے تو آپ رشتہ لے کر ناہید کے گھر کیوں گئے تھے؟" میں نے باپ سے سوال کیا۔

"کیوں تھانیدار صاحب! لڑکی والوں نے کوئی شکایت کی ہے؟"

"آپ اس بات کو چھوڑیں' میرے سوال کا جواب دیں۔"

"دیکھیں تھانیدار صاحب! ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد اگر ٹھیک نہیں ہے تو سدھر جائے۔ اس نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کی شادی ناہید سے کروادی جائے تو یہ ہر بُرا کام چھوڑ دے گا۔ اس لیے ہم رشتہ لے کر گئے تھے ہمیں جواب کا بھی پتا تھا مگر کوشش تو کرنی تھی' انہوں نے انکار کردیا' بات ختم ہوگئی۔"

"اچھا! ذرا آپ باہر بیٹھیں' میں آپ کے بیٹے کے ساتھ دو باتیں کرلوں۔"

وہ سر جھکا کر چلے گئے' میں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور اسے کہا۔ "سپاہی دلاور کو بھیج دو۔"

جب سپاہی دلاور آ گیا تو میں نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ لڑکے (قمر) کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔

میں قمر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ ریت کا رستم ڈھے گیا ہے' یعنی اس کی اکڑ جاتی رہی تھی۔

"قمر میاں! میرے سوالوں کے سیدھے سیدھے اور ٹھیک ٹھیک جواب دو گے یا......" میں نے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔

اب وہ اتنا بدھو بھی نہیں تھا کہ میرا اشارہ نہ سمجھتا۔

"آپ پوچھیں جناب! میں آپ کا ہر شک رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"ناہید تمہیں بہت اچھی لگتی ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھانیدار صاحب! میں یہ بات لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر وہ مجھے مل جاتی تو میں دنیا کی ہر برائی چھوڑ دیتا۔"

"اچھا! اس لیے تم نے اپنی راہ کا کانٹا نکال دیا؟" میں نے جارحانہ انداز میں اس سے سوال کیا۔

"کیا مطلب جناب! آپ کون سے کانٹے کی بات کررہے ہیں؟"

"امجد کی' بھولے بادشاہ!"

"لیکن وہ تو ایک اتفاقیہ حادثہ تھا۔" قمر نے جلدی سے کہا۔

"ہم اسے وہ نہیں سمجھتے جو تم سمجھ رہے ہو۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے اسے گولی ماری ہے' ساری دنیا کو پتا ہے کہ چوہدری فیروز کے بیٹے نوروز کی شادی میں جو ہوائی فائرنگ ہوئی تھی اس

میں اس کو گولی لگ گئی تھی۔" قمر نے کہا۔

"اور شاید امجد ہوا میں تھا؟" میں نے جان بوجھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" چند لمحے وہ خاموش رہا پھر جوش بھرے لہجے میں بولا۔ "اگر مجھے پچاس فی صد بھی یقین ہوتا کہ امجد کو مارنے سے مجھے ناہید کا رشتہ مل جائے گا تو میں یہ کام بھی کر گزرتا۔" قمر کی یہ دلیل کافی ٹھوس اور مضبوط تھی۔

میں تو بھوسے میں سوئی ڈھونڈ رہا تھا۔ جس ٹیلے پر امجد کھڑا ہو کر برات کا نظارہ کررہا تھا' وہاں ہوائی فائرنگ سے گولی لگنے کا امکان پچاس فی صد تو تھا کیونکہ فائرنگ ٹیلے کی سیدھ میں دو تین فٹ نیچے سے ہورہی تھی۔

میں نے قمر کے باپ کو اندر بلالیا اور اس کے سامنے قمر سے کہا (اس دوران سپاہی دلاور کو میں نے باہر بھیج دیا تھا)۔

"دیکھو قمر! تمہارے والد کتنے معزز اور شریف ہیں۔ تم کیوں ان کے سر میں خاک ڈال رہے ہو' سدھر جاؤ۔"

اس نے وعدہ کرلیا میں نے دونوں باپ بیٹے کو رخصت کردیا۔ قمر نے کافی حد تک میرے شک کو رفع کردیا تھا۔

میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ دوبارہ کھول کر سامنے رکھ لی اور ایک لائن کے نیچے سرخ قلم سے لکیر لگادی۔ یہ پوری لائن اس واقعہ کو اتفاقیہ سمجھنے کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ جب اے ایس آئی رانا میرے کمرے میں آیا تو میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ سرخ لائن کے اوپر والی عبارت پڑھ کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر بولا۔

"سر! یہ لائن تو ہمیں کسی اور طرف لے جارہی ہے۔"

میں نے اسے قمر اور اس کے والد سے ہونے والی جرح سے آگاہ کردیا۔

"سر! یہ کیس تو ہمارے لیے کمبل ہی بن گیا ہے اگر ہم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی اس لائن پر جائیں تو یہ سیدھا سیدھا قتل کا کیس بنتا ہے مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ قاتل کون ہے؟ اور سب سے اہم قتل کی وجہ ہے۔" رانا نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔

"بالکل! قتل کی وجہ معلوم ہوجائے تو سارا مسئلہ ہی حل ہوجاتا ہے۔" میں نے اپنی اسٹک کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"سر! قمر کیا بالکل صاف ہے؟"

"میں نے اسے اچھی طرح جانچ لیا ہے' قتل وغیرہ اس کے بس کی بات نہیں ہے وہ بس ریت کا رستم ہی ہے۔"

ابھی تک ہم خفیہ طور پر تفتیش کررہے تھے تاکہ مجرم ہوشیار نہ ہوجائیں۔ ہم انہیں پورے ثبوت کے ساتھ پکڑنا چاہتے تھے۔ ہم نے امجد کے باپ کو ایک بار پھر بلالیا اور وہ جب آیا تو ہم نے اسے عزت سے بٹھایا۔ رانا بھی میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"دیکھو بزرگو! ہمیں اطمینان ہے کہ آپ نے ہمارے کہنے پر عمل کیا ہے یعنی ابھی تک کسی کو نہیں بتایا کہ آپ کے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔" میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا چند لمحے توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

"بقول آپ کے آپ کی یا آپ کے بیٹے کی کسی کے ساتھ ایسی دشمنی بھی نہیں ہے کہ آپ کے بیٹے کو قتل کردیا جاتا۔ آپ ذرا سوچ کر بتائیں' کیا کوئی بات' واقعہ یا چھوٹی موٹی تلخ کلامی آپ کے بیٹے کی

کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئی تھی؟"
"تھانیدار صاحب! ایسی بات میرے علم میں تو کوئی نہیں اگر کوئی بات امجد دل میں لے کر قبر میں جا سویا ہو تو......"
"ہوں!" میں نے ہنکارا بھرا پھر رانا کی طرف دیکھا۔ وہ اشارہ سمجھ گیا' فوراً سوال کر دیا۔
"کوئی پرانی رنجش؟"
"پرانی رنجش......؟" اچانک جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "تھانیدار صاحب!" اس نے میری طرف دیکھا پھر رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ "یہ تو کوئی دو سال پہلے کی بات ہے لیکن اگر انہوں نے کوئی ردِعمل ظاہر کرنا ہوتا تو اب تک انتظار نہ کرتے۔"
"اس بات کو آپ چھوڑیں صرف رنجش بتائیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔
پھر اس نے رنجش بتادی۔ وہ تو رخصت ہو گیا لیکن ہمیں ایک لائن آف ایکشن دے گیا۔
ہم نے اس بات کو آزمانے کا تہیہ کرتے ہوئے کانسٹیبل شمشاد کو بلایا اور اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟
وہ ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ دو دن بعد اس نے ہمیں رپورٹ دی تو ہمیں روشنی کی ایک واضح لکیر نظر آئی۔ ابھی کوئی ثبوت اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن دال میں کچھ کالا ضرور نظر آیا تھا۔ ہم نے بڑی استادی سے متعلقہ بندے کو تھانے میں بلایا اور حوالات میں بند کر دیا۔
ہم نے بہت بڑا رسک لیا تھا اگر متعلقہ بندہ بے گناہ ثابت ہو جاتا تو میری نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی کیونکہ ان کی پہنچ بہت اوپر تک تھی۔ جب حالات اس اسٹیج پر آ جاتے تھے تو میں دلیری سے یہ سوچ کر کارروائی کرتا تھا کہ عزت اور ذلت دینے والا اوپر بیٹھا ہے اور وہ انسان کی نیت سے واقف ہے۔
میں نے ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ متعلقہ بندے کو اس طرح لانا ہے کہ اس کے بہی خواہوں کو بھنک بھی نہ پڑنے پائے۔
اس نے حوالات میں بہت شور مچایا ہوا تھا' مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ میری پیٹی اتروانے کی بات کر رہا تھا لیکن جب ہم نے اسے ڈرائنگ روم کی سیر کروائی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ وہ کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں۔ یہ چوری اور سینہ زوری والی بات تھی۔
آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتادوں کہ ہمارا مجرم کون تھا؟ یہ نوروز تھا' چوہدری کا چہیتا بیٹا! جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ تحقیقات اور جرح سے پتا چلا کہ یہ کام اس نے خود کیا تھا' بڑے چوہدری کو کچھ پتا نہیں تھا اور نہ اندر کی کہانی کا اسے کچھ علم تھا۔
نوروز کا ایک دوست ظہیر خان تھا' دونوں کی غیر نصابی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ظہیر خان پچاس میل دور رہتا تھا۔ وہاں پر ہی امجد کی خالہ بھی رہتی تھی۔ امجد وہاں جاتا رہتا تھا۔ امجد دلیر اور جی دار بندہ تھا' کسی کے ساتھ زیادتی اور زور زبردستی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن (یہ واقعہ آج سے تقریباً دو سال پہلے کا ہے) کہ اس نے دیکھا نوروز اور اس کا دوست ظہیر خان ایک جوان کو بُری طرح مار رہے تھے۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا' عینی شاہدین نے بتایا کہ اس لڑکے کے ساتھ ایک لڑکی تھی' لڑکی کو نوروز نے کوئی فقرہ کس دیا تھا' لڑکا یعنی جوان ان کے گلے پڑ گیا اور اب دونوں اس کو مار رہے تھے۔ ظہیر خان کے والد ماجد خان سے اس شہر کے لوگ ڈرتے تھے' اس لیے لڑائی میں کوئی دخل نہیں دے رہا تھا۔
لیکن امجد سے برداشت نہ ہوا اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی لوگوں سے فریاد کر رہی تھی کہ اس کے بھائی کو ان درندوں سے بچائیں۔ امجد نے ان کو للکارا' نوجوان بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ اس کو چھوڑ کر امجد کی طرف آئے' امجد جوڈو کراٹے کا ماہر تھا' اس نے انہیں بُری طرح دھو کر رکھ دیا۔ جب ان سے کھڑا ہونا محال ہو گیا تو وہ گر پڑے۔ اب لوگوں کو ہوش آیا وہ امجد کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ ویسے یہاں میں اپنی طرف سے ایک بات کہوں گا کہ شاید لوگ ظہیر خان سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی انہیں سبق سکھائے اس لیے جب امجد نے انہیں سبق سکھانا شروع کیا تو وہ تماشائی بنے رہے اور جب انہیں اچھی طرح سبق یاد ہو گیا تو انہوں نے امجد کو الگ کر دیا۔
امجد نے یہ واقعہ اپنے باپ کو آ کر سنایا تھا وہ خود کسی کے ساتھ چھیڑ خانی نہیں کرتا تھا لیکن اس بات کا قائل تھا کہ بدمعاشوں کو بدمعاشی کے ساتھ روکنا چاہیے اس نے امجد کو کہا۔
"تم نے اچھا کیا' اب خاموش ہو جاؤ۔"
دوسری طرف نوروز نے اپنے باپ یعنی چوہدری فیروز کو کچھ نہ بتایا ویسے بقول اس کے اس کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ریوالور کی چھ کی چھ گولیاں امجد کے سینے میں اتار دے۔
ظہیر خان نے اپنے والد سے یہ سیکھا تھا کہ سانپ کو اس طرح مارنا چاہیے کہ لاٹھی بچ جائے۔ اس نے نوروز کو سمجھایا کہ موقع کی تلاش میں رہے امجد کو اس طرح اس دنیا کے تختے سے اٹھائیں گے کہ شک ہمارے اوپر نہ آئے اور موقع کو تلاش کرتے کرتے دو سال گزر گئے۔
بات نوروز کی سمجھ میں آ گئی تھی پھر نوروز کی شادی کا دن آ پہنچا۔ ظاہر ہے ظہیر خان بھی آیا ہوا تھا۔ دونوں نے مل کر ایک بھیانک منصوبہ بنایا۔ ظہیر خان ایک ماہر نشانہ باز تھا۔ موت گھیر کر امجد کو ٹیلے پر لے آئی۔ ٹیلے کے دوسری طرف ظہیر خان چھپا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں نوروز کا ریوالور تھا جونہی ہوائی فائرنگ شروع ہوئی' ظہیر خان نے امجد کے دل کا نشانہ لے کر ٹریگر دبادیا۔ اسے اپنے نشانہ پر بڑا ناز تھا۔
اب آپ کو یہ بتادوں کہ میں نے پوسٹ مارٹم کی کون سی لائن کے نیچے سرخ لائن لگائی تھی۔ وہ لائن تھی فائر کرنے والا کوئی پکا نشانہ باز ہے' اس نے دل کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ آگے لکھا تھا ریوالور کے متعلق۔ ہوائی فائرنگ کرنے والوں کا اسلحہ میں نے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ گولی جو امجد کو لگی ہے وہ کسی اور کلیبر کے ریوالور سے فائر کی لگتی ہے۔
ہم نے ظہیر خان کو گرفتار کرنے کے علاوہ ریوالور بھی دو گواہوں کی موجودگی میں برآمد کر لیا تھا۔
جب چوہدری فیروز کو پتا چلا تھا کہ اس کے لختِ جگر نے اپنے جگری یار کے ساتھ مل کر کیا کر دیا ہے تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی' اس نے تو سرسری طور پر پوسٹ مارٹم کروانے کی مخالفت کی تھی۔
قارئین! مجرموں نے دیر آید کے مصداق یہ سب کچھ کیا تھا لیکن کیا یہ سب کچھ درست آید تھا۔
❖

وحشی

برادرم،
مسلیمات!

وحشی کے ساتھ حاضر ہوں۔ آپ کی نظر سے شاید یہ خبر ضرور گزری ہوگی ویسے کراچی میں ہر دوسرے تیسرے روز ایسی خبریں اخبارات میں ضرور شائع ہوتی ہیں کہ فلاں علاقہ یا فلاں ساحل سے کسی خاتون یا لڑکی کی مسخ شدہ تشدد زدہ لاش ملی۔ عموماً اس کے بعد اس کا کوئی فالو اپ نہیں آتا کہ وہ لڑکی یا خاتون کون تھی اور اسے کیوں اور کیسے قتل کیا گیا۔ مگر اس کہانی کے کردار کے ساتھ ایسا نہیں ہوا نہ ہی وہ گمنام موت مری نہ ہی اس کا قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہوسکا کیونکہ وہ با رسوخ خاندان کی فرد تھی۔
امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
سید عبداللہ شاہد
حیدر آباد

میری کہانی میٹرک کی نوخیز اور معصوم طالبہ وردہ لطیف کے بارے میں ہے جسے ایک ہوس پرست شخص نے پہلے اغوا کیا اور بعدازاں اس معصوم بچی کی عزت لوٹنے کے بعد نہایت سنگدلی اور بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا تھا اور مجھے اس واقعے سے اس لیے زیادہ دکھ اور ذہنی دھچکا پہنچا کہ وردہ کے والد عبداللطیف بلوچ میرے دیرینہ اور قریبی دوست تھے۔ وہ اگرچہ زمانہ طالب علمی کے اس عرصے سے تعلق رکھتے تھے کہ جب ہم ایک ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ پھر وہ وقت گزر گیا اور عبداللطیف بلوچ اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی قابلیت اور یونیورسٹی کی ڈگری کو کام میں نہ لاسکے اور والد کے فرنیچر کے کاروبار سے وابستہ ہوگئے۔ شارع فیصل پر ان کا ذاتی شوروم تھا جو کثیر المنزلہ اور وسیع اراضی پر مشتمل تھا۔ والد کا کاروبار جوائن کرنے کے کچھ عرصے میں خاندان کے سرکردہ لوگوں کے اصرار پر اس نے حفصہ بیگم سے شادی کر لی جو ایک جاگیردار فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔

جبکہ ادھر میں ابلاغ عامہ میں ایم اے کرنے کے بعد صحافت کے شعبے سے منسلک ہوگیا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان پیشہ ورانہ مصروفیت کی وجہ سے میل جول کچھ کم ہوگیا تھا تاہم موبائل فون پر معمول کی نوک جھونک رہتی تھی۔ ویک اینڈ پر لطیف بلوچ بصد اصرار مجھے اپنے گھر انوائٹ کرتا تھا جسے میں ایک بے تکلفانہ دوست کی پرکشش آفر کے طور پر قبول کرتا اور ڈیفنس واقع لطیف بلوچ کے بنگلے پر پہنچ جاتا۔

میرے مدبر مزاج دوست لطیف بلوچ کے یہاں حفصہ بیگم سے ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی، اس کے بعد اولاد نرینہ کی خواہش میں کئی برس گزر گئے لیکن ان کے یہاں دوسرے بچے کی ولادت نہ ہوئی۔ آخر دونوں میاں بیوی نے مشیت ایزدی کے آگے سر جھکا دیئے اور پیاری کھلنڈری اور سیبوں جیسے گالوں والی وردہ کو ناز و نعم سے پالنے لگے۔ وردہ دونوں میاں بیوی کے ازدواجی التفات کا محور و مرکز تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اکثر اس کی ضد کے آگے ہار جاتے تھے۔ یہ وردہ کی دلگداز کہانی کی شروعات ہے لیکن اسے تمام حقائق و شواہد کے ساتھ بیان کرنے سے پہلے میں اپنے بارے میں اہم اور ضروری باتوں کو گوش گزار کرنا چاہتا ہوں تاکہ وردہ کی کہانی لکھنے کا جو محرک جذبہ میرے قلم میں مضطرب ہے اور جو ماتمی سطور کی صورت میں ایک معصوم جان کی خونچکاں موت کا شکوہ کرنا چاہتا ہے، اسے قارئین پورے طور پر سمجھ سکیں۔

جیسا کہ میں نے بتایا کہ پیشے کے لحاظ سے ایک صحافی ہوں، ابتداً میں نے درجنوں اخبارات میں کام کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور پھر کچھ بزرگ دوستوں کے مشورے اور تعاون سے میں نے اپنے ذاتی اخبار ''تکون'' کا اجراء کیا۔ اس وقت ''تکون'' کا شمار اچھے اور بھروسے کے اخبارات میں ہوتا ہے۔

نجی اور خانگی لحاظ سے میری زندگی میں ابھی تک کسی خاتون امور خانہ کا عمل دخل شامل نہیں ہوسکا تھا حالانکہ ماں نے میری منگنی اپنی بہن کی بیٹی نبیلہ سے اس وقت طے کر دی تھی جب ''تکون'' نے اشاعت کے لحاظ سے پہلا سال مکمل کیا تھا۔ نبیلہ نے منگنی کے بعد میری جانب سے دو تین برسوں کی رعایت ملنے پر تعلقات عامہ میں ماسٹرز کرنے کی غرض سے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ''میچورڈ انڈر اسٹینڈنگ منٹ'' کا سلسلہ جو دراز ہوا تو عشق کی منہ زوری جھاگ بن کر بیٹھ گئی۔ کبھی نبیلہ سے موبائل پر محبت و خلوت کی باتیں ہوتیں تو وہ میری شوخی مستی پر یوں چوٹ کر جاتی کہ میں ہونق زدہ رہ جاتا۔ اس کی بزرگانہ خودداری سے عشق کی سبک روی کا مزہ دوبالا ہو جاتا اور میچورڈ عشق کے تحمل آمیز جذبوں سے بے اختیار سر دھنتا رہتا۔

میرے گھر میں بیوہ ماں کے علاوہ تین بہنیں ہیں، ثریا جو کالج سے گریجویشن کر رہی ہے، مجھ سے محض ڈیڑھ دو سال چھوٹی ہونے کے باوجود میرا بہت احترام کرتی ہے۔ سوجھ بوجھ میں ماں کا پرتو اور گھر کے کاموں کو نفاست اور سلیقہ مندی سے کرنے میں بہت سگھڑ اور لائق مانی جاتی ہے۔ اس سے چھوٹی عطیہ ہے جو ایف اے کی پرجوش طالبہ ہے، جو میرا ادب کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف موضوعات پر مجھ سے بحث و مباحثہ کرتی ہے۔ گھر کے کسی بھی مسئلے میں عطیہ جرح کرتے ہوئے جو دلائل دیتی ہے انہیں سن کر میں اکثر لاجواب ہو جاتا ہوں۔ آخر میں گھر بھر کی چہیتی نویلہ کا نمبر آتا ہے۔ جو آٹھویں میں پڑھتی ہے اور اپنی ذہانت اور شوخیوں سے سارے گھر میں ہنگامہ مچائے رکھتی ہے۔ میں نویلہ سے جب بھی بات چیت کرتا ہوں تو مجھ میں والد مرحوم کے قرب کا احساس ہوتا ہے، وہ تمام شفقتیں اور پسرانہ جذبے جو والد صاحب کی ذات کا خاصہ تھے میرے چہرے پر تمتمانے لگتے اور اسے شاباشی دیتے ہوئے اور اسے سمجھاتے ہوئے جو پروقار جذبہ میرے لہجے میں جھلک رہا ہوتا بہت قیمتی اور انمول محسوس ہوتا۔ میری مشفقانہ باتوں سے نویلہ کو کبھی والد صاحب کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ مجھے تینوں بہنیں جان سے پیاری اور عزیز تھیں تاہم نویلہ جو کہ سب سے چھوٹی تھی کا میں زیادہ خیال رکھتا تھا اور اس کی باتوں کو اہمیت دیتا تھا۔ شعبہ صحافت میں میں ایک ہمہ جہت، معتبر اور باوقار شخصیت کے طور پر پہچانا جاتا تھا۔ میرے نام یاور سیماب کو ٹاک شوز پر ریفرنس دیتے ہوئے عزت و احترام سے لیا جاتا ہے لیکن

گھر میں ثریا، عطیہ اور نویلہ سب مجھے بے تکلفی سے یاور بھائی پکارتی ہیں اور محبت و اپنائیت سے اپنی باتوں کو شیئر کرتی ہیں۔ مزید یہ کہ تین چار برس پہلے ماں نے ثریا اور عطیہ کے لیے خاصی ڈھونڈ مچائی تھی لیکن انہیں مناسب رشتے نہ ملنے پر بہت مایوسی ہوئی تھی۔ تاحال یہ مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ ماں نے مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد ثریا اور عطیہ کا دو اچھے مہذب گھرانوں میں رشتہ طے کر دیا ہے اور ہم نے عطیہ کی زیادہ سے زیادہ پڑھائی کی ضد سے احتراز کرتے ہوئے سوچ رکھا ہے کہ ثریا کا گریجویشن مکمل ہوتے ہی دونوں بہنوں کی شادی کر کے گھر سے رخصت کر دیا جائے۔ جوان بیٹی یا بہن کانچ کے آبگینوں کی مانند نازک اور قیمتی امانتیں ہوتی ہیں۔ زندگی کے جھمیلوں میں یہ امانتیں جلد سے جلد ان کے امین کے حوالے کر دینا چاہیے۔

اب ظلم و بربریت کا شکار ہونے والی بدنصیب وردہ کی کہانی کو بیان کرتا ہوں۔ سیب جیسے گالوں والی کم سن اور نوخیز وردہ کی عمر اندازاً چودہ پندرہ سال کے درمیان تھی۔ میری سب سے چھوٹی اور چہیتی بہن نویلہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ نویلہ آٹھویں میں جبکہ وردہ دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ میرے دوست لطیف بلوچ اور حفصہ بیگم متمول اور ڈی سینٹ فیملی تھی۔ دوم تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں جدت پسندی سے شغف رکھتے تھے اور ماڈرن ازم کے دلدادہ تھے۔ وردہ بھی اس ماڈرن ماحول کی پروردہ ایک آزاد خیال کم عمر لڑکی تھی۔ ستواں ناک و نقش اس کی سرخی مائل دودھیا رنگت پر کھلتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی خوب صورت آنکھیں جب ذہانت و تجسس کی چمک سے ہویدا ہوتیں تو وہ اس خوش فکر اور نوآموز کیڈٹ کی مانند لگتی جسے اپنے انسٹرکٹر سے ایک کلاس میں بہت ساری باتیں جاننے کا جنون ہوتا ہے۔ وردہ ایک معصوم اور بھولی بھالی لڑکی تھی تاہم ماڈرن ماحول کی بے فکری اور خوش مزاج، ماں باپ کے لاڈ پیار کی وجہ سے وہ مزاجاً پرجوش، فہم جو اور تجسس پسند لڑکی تھی۔ جدت اور ندرت کی خو ماں باپ کی طرف سے اسے ورثے میں ملی تھی۔ جس نے آزادی فکر کے احساس کو رفتہ رفتہ جنون میں بدل دیا تھا لیکن میں نے اس کی سوچ کے فکری زاویوں کا تجزیہ کیا تھا جس کے مطابق وہ تلاش و جستجو میں لطیف اور حفصہ بھابی کے مزاج کے برعکس تھی۔ دونوں میاں بیوی جدید سائنس و ٹیکنالوجی سے متاثر تھے جبکہ وردہ قدامت پسندی کی طرف مائل تھی۔ گاؤں دیہات کی پگڈنڈی پر ننگے تلے قدموں سے دو دو تین تین مٹکے اٹھائے خراماں خراماں چلتی جفاکش گنوار عورت میں اسے کشش محسوس ہوتی تھی۔ دیہاتوں کے پھیلے سرسبز باغات اور کھیتوں اور شفاف چشموں کی سیر کرنے کو اس کا دل چاہتا تھا۔ وہاں کی تہذیب و ثقافت کا مشاہدہ اور تحقیق کرنا اسے پرلطف اور دلچسپ کام لگتا تھا۔

اس سال اسکول کی جانب سے تفریحی ٹور پر جب وہ ہڑپہ ٹیکسلا کے لیے روانہ ہو رہی تھی تو اس کا شوق و تجسس دیدنی تھا۔ پھر ٹور سے آنے کے بعد اس محقق لڑکی نے وہاں کی ہزاروں سال پرانی تہذیب اور تمدن کے بارے میں ایک دلچسپ فیچر لکھ کر مجھے دیا تھا جسے میں نے نوادرات کی تصاویر کے ساتھ ''تکون'' میں شائع کیا تھا۔ میٹرک میں آنے تک وہ کھوجی قسم کی پرجوش لڑکی جو ماڈرن ماحول میں پلی بڑھی تھی قدامت پسندی کی جانب مائل ہونے کی وجہ سے رسم و روایات سے اور قدیمی تہذیب و بنیادی قدروں سے محبت کرنے لگی تھی۔ اب وہ اسکرٹ بلاؤز ترک کر کے شلوار قمیص پہنتی تھی اور اس پر دوپٹہ لیتی تھی۔ کبھی موقع محل اور موسم کے لحاظ سے جینز ٹی شرٹ میں وہ آزادی فکر کی اس تبدیلی کو محسوس کرتی تو بلا جھجک اس متضاد کیفیت کا مجھ سے اظہار کر دیتی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب لطیف بلوچ عوامی فلاح و بہبود کی غرض سے ایک سماجی تنظیم بنانے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ طبعاً فراخ دل اور غریبوں کے مسائل میں دلچسپی لینے والا ایک ہمدرد شخص تھا۔ اچھے کاروبار کی وجہ سے پیسوں کی بے فکری تھی۔ اکلوتی بیٹی کے علاوہ اور کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ لہٰذا خیر و بھلائی کے جذبے کی تسکین کے ارادے سے اس نے ''کولیگ'' کے نام سے اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔ لطیف نے میری صحافتی قابلیت سے متاثر ہو کر کولیگ کے منشور کے لیے صلح و مشورے کیے اور اس کا مجھے پریس سیکریٹری مقرر کر دیا۔ میرے ساتھ اس کے چند کاروباری دوست احباب بھی اس سماجی تنظیم کے ممبر بن گئے تھے۔ جنہیں لطیف بلوچ نے ضروری عہدے تفویض کرتے ہوئے کام کرنے کی ہدایات کی تھیں۔ ''کولیگ'' میں اس نے خواتین کا شعبہ حفصہ بھابی کو سنبھالنے کا کہا تو وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے رضامند ہو گئیں۔ حفصہ بھابی جو ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور مسلم ہسٹری میں سبجیکٹ اسپیشلسٹ تھیں۔ گھر میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیتی تھیں۔ اس کے ساتھ خود کو مصروف رکھنے کے لیے وہ ایک پرائیویٹ کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے جاب بھی کرتی تھیں۔ حفصہ بھابی نے شوخ و شریر وردہ کی اچھی دیکھ بھال اور بہترین تربیت کی تھی اور فیوڈل مزاج کے برعکس ایک اچھی گھریلو عورت کے طور پر خود کو منوایا تھا۔ ایک روز میں کولیگ کی ہفتہ وار میٹنگ کی غرض سے لطیف کے بنگلے پہنچا تو حفصہ بھابی نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ پھر کوئی نصف گھنٹے تک میں حفصہ بھابی کے ساتھ کولیگ کی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کرتا رہا۔ اس وقت ہم کامن روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دیوار گیر گھڑی میں ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ ڈھلتی شام سرعت سے رات کا سوانگ بھر رہی تھی۔ میرے استفسار پر حفصہ بھابی نے بتایا تھا کہ اس وقت لطیف بلوچ میٹنگ کے انتظامی کام کی غرض سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ مقررہ وقت آٹھ بجے کا تھا، بھابی نے چائے کا کپ میری جانب بڑھایا تو میں نے کپ لیتے ہوئے وردہ کے بارے میں پوچھا کیونکہ جب میں لطیف سے ملنے ڈیفنس آتا تھا تو وردہ شرارتی انداز میں مجھے چونکاتے ہوئے گھیر لیتی تھی۔ خلاف توقع آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے اس مہم جو لڑکی کے بارے میں حیرت سے سوال کیا تھا۔ اس کے تذکرے پر حفصہ بھابی نے خوشگوار لہجے میں جواباً کہا۔

''وہ تو ساحل سمندر پر چہل قدمی کے لیے گئی ہے۔'' بھابی کا جملہ سن کر میں نے مسکراتے ہوئے چائے کا سپ لیا۔ بھابی دوبارہ بولیں۔

''عجیب معمہ لڑکی ہے وردہ، ہنستے بولتے ہوئے سوچنے لگتی ہے، یا پھر سوچ سوچ کر یوں مسکرانے لگتی ہے جیسے کہیں بقراط کو نتیجہ نکالنے میں چاروں شانے چت مات دے دی ہو۔'' ان کے پرمذاق لہجے

سے الجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے ٹوکتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔

''بھابی عجیب معمہ نہ کہو بلکہ میرے خیال میں وردہ کو جینئس گائے کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔'' حفصہ بھابی میری تطہیر سن کر قدرے معاندانہ انداز میں مسکرادیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے یاور لیکن یہ مدبرانہ تجسس اور تفکر ہماری ماڈرن سوسائٹی میں پاگل پن اور بے وقوفی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جوانی کے زینے پر قدم رکھ چکی ہے اس عمر میں لڑکیاں شوق سے اچھے اور خوش رنگ ملبوسات پہنتی ہیں۔ مختلف تفریحی مشاغل سے ہمکتی نظر آتی ہیں مگر اس محقق لڑکی کی ساری دلچسپی دقیانوسی روایات اور تاریخی کلچر سے محبت تک محدود ہوگئی ہے۔ لطیف میٹرک کے بعد وردہ کو اعلیٰ تعلیم کی غرض سے امریکہ بھجوانے کا سوچ رہے ہیں مگر کیا وردہ اس مزاج میں وہاں ایڈجسٹ کر سکے گی؟'' انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو میں اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

''ارے بھابی آپ بلاوجہ فکر مند ہو رہی ہیں۔ اس پر تجسس لڑکی کی سنجیدگی شعبہ جاتی تحقیق تک محدود ہے۔ جینئس لوگ فطرت سے محبت کرنے والے اور سچائی کو عام لوگوں سے بڑھ کر نبھانے والے ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وردہ میں علم و آگہی کا بے پناہ جنون ہے۔ کائناتی اسرار و رموز کو جاننے کے شوق میں وہ دنیا کے آخری کونے تک بھی جا سکتی ہے۔'' میں نے اتنا کہہ کر چند لمحے توقف کیا تو حفصہ بھابی فوراً پریشان کن لہجے میں توجہ دلاتے ہوئے بولیں۔

''لیکن یاور سیماب صاحب اس ذہین و فطین لڑکی کا پرانی اور متروک تہذیب اور کلچر سے دلچسپی اور لگاؤ میرے لیے فکر مندی کا باعث ہے اور اب تو وہ شلوار قمیص پہننے لگی ہے۔'' ان کا شکایتی لہجہ سن کر میں جواباً مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے وردہ کے مزاج میں آنے والی تبدیلی کو غور سے پرکھا ہے۔ وہ بازار میں آنچل درست کرتے ہوئے جینز اور شرٹس خریدنا ضروری سمجھتی ہے۔ محض اس لیے کہ فطرت سے محبت کرنے والی لڑکی ہے۔ وہ قدامت پسندی سے متاثر ہونے کے باوجود جدید اور نئے خیالات سے موقع اور ضرورت کے مطابق ہم آہنگ ہونا جانتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ سوچ کر پریشان ہونا کہ وردہ کہیں تقدیس ثنا خوان مشرق کے جنون میں ماڈرن سوسائٹی سے باغی اور متنفر نہ ہو جائے غلط ہے حفصہ بھابی آپ اس بارے میں پریشان ہونا چھوڑ دیں۔'' میرا مدلل جواب سن کر حفصہ بھابی نے پرسوچ انداز میں اثبات میں سر ہلایا جیسے انہیں وردہ کے بارے میں کماحقہ اطمینان ہوگیا ہو۔

میں نے چائے ختم ہی کی تھی کہ کولیگ کے جنرل سیکریٹری جواد علی کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اور حفصہ بھابی نے کھڑے ہو کر پرجوش انداز میں انہیں ویلکم کہا۔ جواد علی کے بعد دیگر ممبران بھی آٹھ بجے تک کامن روم میں جمع ہوگئے۔ لطیف بلوچ کے باہر سے آتے ہی میٹنگ کا آغاز ہوگیا۔ پھر کم و بیش سوا گھنٹے تک یہ میٹنگ جاری رہی۔ اینڈ میں تمام اراکین رخصت ہوئے تو میں وردہ سے ملنے کی غرض سے رک گیا۔ حفصہ بھابی رات کے کھانے کی آراستگی کا سوچ کر ڈائننگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئیں۔ وال کلاک میں

ساڑھے دس بج رہے تھے لیکن وردہ ساحل سمندر سے ابھی تک نہیں لوٹی تھی۔ وہ ساحلی کنارے کلفٹن کی طرف شام کی ہوا خوری اور سبک خرامی کے لیے نکلی تھی۔ لطیف بلوچ کے بنگلے سے ساحلی تفریح گاہ کا فاصلہ پندرہ بیس منٹ تک کا تھا۔ اسے گئے ہوئے بھی چار یا پانچ گھنٹے گزر گئے تھے۔ میں بخوبی جانتا تھا کہ وردہ فطرت سے محبت کرنے والی اور اس کے مظاہروں سے نتائج اخذ کرنے والی کھوجی لڑکی تھی۔ اس لیے اتنی دیر تک اس کا سمندر کے کنارے وقت گزارنا میرے لیے حیرت کی بات نہیں تھی لیکن لطیف بلوچ کے چہرے پر فکر مندی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے وردہ کو کال کرتے ہوئے مجھ سے پریشان کن لہجے میں کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو یاور! یہ لڑکی گھر سے نکلنے کے بعد کتنی بے پروا ہو جاتی ہے۔ رات کے گیارہ بجنے کو ہیں لیکن صاحب زادی کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ ہماری تسلی کے لیے اسے موبائل فون کے ذریعے اطلاع تو دینا چاہیے۔ تم اسے جینئس کہتے ہو اور اس کی سمجھداری کی بہت تعریف کرتے ہو۔ اتنی بے پروا اور لاابالی ہے تمہاری جینئس اور محقق بھتیجی!''

''ہو سکتا ہے وردہ کو کوئی دلچسپ کلیو مل گیا ہو۔ ساحل سمندر سے اسے عشق ہے اور وہ اس کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے اطلاع دینا بھول گئی ہو۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے چند لمحے توقف کیا پھر دوبارہ بولا۔

''میری مستند رائے کے مطابق تلاش و جستجو کا ذوق رکھنے والی میری ذہین بھتیجی بے پروا نہیں ہو سکتی لطیف صاحب۔'' میں نے دوست کی خفگی کو کم کرنے کے خیال سے خوش گفتاری سے جواب دیا۔ دوسری جانب لطیف بلوچ نے وردہ کا نمبر ملایا تھا۔ لیکن کالنگ ٹون مسلسل بج رہی تھی اور وردہ جہاں بھی تھی کال ریسونگ نہیں دے رہی تھی۔ لطیف بلوچ نے موبائل سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور قدرے فکر مندی سے مجھ سے بولا۔ ''یار میں اور حفصہ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ وردہ ایک ذہین اور جینئس لڑکی ہے دوم اس کے علاوہ ہماری کوئی اولاد بھی نہیں ہے اس لیے ہم میاں بیوی اسے کسی کام سے منع نہیں کرتے اور نہ ہی کسی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں لیکن یار اس کی مدبرانہ طبیعت اور تجسس دیکھ کر مجھے اور حفصہ کو اندیشہ رہنے لگا ہے کہ کہیں وہ عام اور معمول کی زندگی سے دور نہ چلی جائے۔ اس لیے تم وردہ کو سمجھاؤ کہ علم و آگہی کے جنون میں گھر کے معمولات سے غافل نہ ہوا کرے۔'' اس کی درخواست سن کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میز پر رکھا موبائل کی کالنگ ٹون ہنوز بج رہی تھی پھر یکایک دو منٹ تک یہ ٹون بجنے کے بعد وردہ کی آواز ایئر پیس کے اسپیکر میں گونجی تو میں اور لطیف چونک گئے۔ میں پرسوچ انداز میں اپنے متفکر دوست کو دیکھ رہا تھا۔ لطیف نے مجھے بات کرنے کا اشارہ کیا اور موبائل فون میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا اور مشفقانہ لہجے میں بات کی۔

''ہیلو وردہ بھئی کہاں ہو تم؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں لڑکی! کیا ریت کے ساحل پر فکری زاویے کھینچتے کھینچتے سو گئی تھیں تم؟'' میرے مستفسرانہ لہجے کے محبت بھرے گداز کو وردہ فوراً پہچان گئی اور قدرے خجالت سے جواباً بولی۔

''انکل آئی ایم سوری مجھ سے مس پلیز ہو گئی تھی

یہ بات کہ ممی ڈیڈی کو انفارم کردوں۔ کچھ دیر پہلے ڈیڈی کا نمبر سیل فون پر دیکھا تو یاد آیا۔ کیا وہ غصے میں ہیں انکل؟“

”ارے نہیں بھئی انہیں غصہ کہاں آتا ہے۔ بس خاموشی اختیار کرلیتے ہیں لیکن وردہ تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم گھر والوں کی جانب سے کیوں مس پلیز ہوگئی تھی؟ یار تم تو ممی ڈیڈی کی بہت پروا کرتی ہو! اور سمجھدار اور حساس لڑکی ہو۔“ میں نے وردہ کو زچ کرنے کے خیال سے افسوس کا اظہار کیا تو وہ دوسری جانب سے جھجکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”سوری یاور انکل‘ آپ جانتے ہیں کہ فطرت کی رنگ آمیزی سے مجھے عشق کی حد تک لگاؤ ہے اس کی وجہ سے میں کبھی یوں سحر زدہ ہوجاتی ہوں کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے مجھ سے بھول ہوگئی تھی کہ ممی ڈیڈی کو کال نہیں کی۔“

”کیا سمندر کے کنارے کوئی ہسٹوریکل ہیوج مل گیا تھا تمہیں؟ اس کی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے میں نے مربیانہ لہجے میں دریافت کیا۔

”یس انکل‘ کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ پرشور ساحل پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے ایک خوش رنگ کجاوے کی زیبائش سے آراستہ‘ صحرائے تھر سے روزی کی تلاش میں سمندر کا رخ کرنے والا اور اپنی مست خرام چال سے سیاحوں کو تفریح پہنچانے والے ایک متوالے اونٹ سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ صحرائی اونٹوں کو آپ نے دیکھا ہے نا انکل‘ کتنے کلچرل اور آرٹسٹک موڈ کے مالک ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وردہ نے لمحاتی توقف کیا اور بولی۔

”واٹ ایکسائٹڈ! اس سینٹ فیم جانور پر سواری کرتے ہوئے میں نے اس کی نکیل سے اسے بہت تنگ کیا۔ اسے چھڑی مارتے ہوئے بہت دور لے گئی لیکن اس نے برا نہیں منایا‘ اور کوئی مزاحمت نہیں کی۔ راکب سومرو جو اس صحرائی اونٹ کا مالک تھا نا‘ وہ اس کی لمبی گردن کو یوں تھپتھپا رہا تھا جیسے اس کی عاجزی اور برداشت پر اسے شاباشی دے رہا ہو۔“ وردہ کی زبانی یہ روداد سن کر میں مسکراتے ہوئے محظوظ ہورہا تھا جبکہ میرے سامنے موجود لطیف بلوچ حیرت واستعجاب سے کچھ نہ سمجھتے ہوئے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے میں نے اسے سانس بحال کرنے کا موقع دیا تو وہ معصومیت سے سوالیہ لہجے میں بولی۔

”انکل‘ صحرائے تھر کا اونٹ اتنا آرٹسٹک اور اولڈ ایج نظر آتا ہے؟ جیسے کوئی بوڑھا شخص غرور وفخر سے چلتے ہوئے کچھ سوچ رہا ہو‘ یوں کوئی ذی ہستی اس کے دیو قامت جسم میں حلول کرگئی ہو‘ اس کے ہام بیک پر سوار ہو‘ اس کی نگاہوں سے بہت دور تک دیکھ رہی ہو اور زمانے کی آفتوں پر حزن وملال سے سوچ بچار کررہی ہو؟“ وردہ نے اپنی جستجو کو متاثر کن لفظوں میں بیان کرتے ہوئے کہا تو میں نے لطیف بلوچ اور ان کے قریب موجود حفصہ بھابی کی جانب دیکھا اور مصلحت آمیزی سے بولا۔

”جینیئس لڑکی‘ تمہارا مشاہدہ اور تجزیہ لاجواب ہے۔ دراصل اونٹ سب سے قدیم چوپایا ہے۔ اسے اسٹڈی کرتے وقت ہم زمانہ حال سے ماضی میں کھوجاتے ہیں لیکن اس آرٹسٹک جانور پر بحث کرنے کے لیے سیل فون اپنی معیاد کھو بیٹھے گا‘ لیکن یہ بحث ختم نہیں ہوگی۔“ میرے توجہ دلانے پر وردہ بے اختیار ہنس پڑی۔

”اوہ سوری انکل‘ میں پھر بھول گئی‘ آپ کی بات کو۔“ وردہ نے خجالت سے اعتراف کیا۔ آخر میں‘ میں نے اسے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

”اب تمام باتوں کو چھوڑ کر کار میں بیٹھو اور جلدی سے گھر پہنچو۔ تمہارے ممی ڈیڈی اور میں رات کے کھانے پر تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ ٹھیک ہے ناؤ‘ وش یو گڈ لک بے بی۔“ اتنا کہہ کر میں نے موبائل آف کردیا پھر وردہ کے پہنچنے تک میں نے لطیف بلوچ اور حفصہ بھابی سے اونٹ کی سواری کے بارے میں وردہ کی مہم جوئی کا تذکرہ کیا تو دونوں خوشگواری سے مسکرانے لگے۔ اندازاً بیس منٹ میں وردہ منی آلٹو ڈرائیو کرتے ہوئے بنگلے میں داخل ہوئی۔ ڈنر کے بعد میں نصف گھنٹے تک وردہ کے پرتجسس سوالوں کے جوابات دیتا رہا۔ صحرائے تھر کے اونٹ باربرداری کرتے ہوئے عام طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ کوئی اس کی دیو قامتی اور بودوباش پر غور وفکر نہیں کرتا۔ وردہ نے اس پرفکر وتجسس کیا تو اسے اونٹ آرٹسٹک جانور محسوس ہوا۔ دور قدیم کا ایک دلچسپ چوپایہ جو صدیوں کے گزرنے کے باوجود ہمارے درمیان رہتا ہے۔ وردہ کو مختلف قوموں کی روایات اور ثقافت سے دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ اس لیے وہ اس آرٹسٹک جانور سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ ساڑھے بارہ بجے میں لطیف اور حفصہ بھابی کو خدا حافظ کہتا ہوا بنگلے سے روانہ ہوا اور اپنے گھر لوٹ آیا۔

❀......❀......❀

کاروبار زندگی کی گھما گھمی میں آدمی سینکڑوں لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ ان سے مذہبی‘ معاشی اور سماجی تعلقات کو بہتر اور موثر بناتا ہے۔ اس دوڑ دھوپ کے باوجود وہ اپنی فکر وتدبر میں خود کو اکیلا اور تنہا ہی محسوس کرتا ہے۔ شاید اسی لیے ایک شخص دوسرے سے مختلف خیالات کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس کی سوچ کے دھارے اس کی طبعی دلچسپی کے لحاظ سے جدا اور الگ ہوتے ہیں۔ وردہ کی قدامت پسندی کے بارے میں‘ میں نے جو تجزیہ کیا اور حتمی رائے قائم کی‘ اس سے لطیف بلوچ اور حفصہ بھابی ایک حد تک متفق ضرور تھے مگر دونوں ماڈرن ازم سے متاثر اور جدید طرز زندگی کے قائل تھے۔ اور چاہتے تھے کہ وردہ بھی ڈیفنس میں رہنے والے ہائی کلاس لوگوں کے بچوں کی مانند ایڈوانس اور ماڈرن لڑکی دکھائی دے۔ اس متمول اور پوش علاقے میں وردہ کے مشرقی پہناوے سے وہ اڑوس پڑوس کے مکینوں کی نظروں میں خود کو عجوبہ اور شرمسار محسوس کرتے تھے اور روز لطیف بلوچ کی درخواست پر میں نے اپنے تئیں وردہ کو ڈکٹیٹ کیا تھا اور سمجھایا تھا کہ وہ تلاش وجستجو کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کے بجائے اپنے ممی ڈیڈی کا بھی دھیان اور فکر کرے اور ان کی امیدوں کے خلاف ایسی روش اختیار نہ کرے کہ انہیں اپنے عزیز و اقارب میں شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میری ناصحانہ باتوں کو سن کر وردہ کچھ دیر تک خاموشی سے سوچتی رہی جیسے جذباتی تلاطم پر قابو پارہی ہو‘ پھر اس حساس لڑکی نے مجھ سے پرامس کیا کہ وہ آئندہ ممی ڈیڈی کو شکایت کا موقع نہیں دے گی اور ان کا خیال رکھے گی۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے تو میں اسے بھول کر اپنی صحافتی زندگی میں مصروف ہوگیا۔ دوم اب گھر میں بہنوں کی شادی کرکے انہیں رخصت کرنے کا بھی وقت نزدیک آرہا تھا۔ پچھلے مہینے ثریا نے گریجویشن کے فائنل ایئر کے پرچے دیئے تھے اور تعلیم مکمل ہونے کے بعد گھر کے کاموں میں مشغول نظر آنے لگی تھی۔ عطیہ ان دنوں ایف اے کا امتحان دے رہی تھی۔ دونوں کی

فراغت کا اندازہ کرتے ہوئے ادھر ماں نے بھی ان کی شادی کا زیور اور جہیز کا دیگر سامان جانچنا پرکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے اس دوران خود کو اپ سیٹ محسوس کر رہا تھا۔ میری صحافتی سرگرمیاں اور اس کے ساتھ ذاتی اخبار تکون کے روزمرہ کے مسائل تھے، جنہیں چیک اینڈ بیلنس کر کے دیکھنے میں رات گئے تک مجھے آفس میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ مزید لطیف بلوچ کی سماجی تنظیم کولیگ کے پروگراموں میں بھی مجھے پریس سیکریٹری کی حیثیت سے وقت دینا پڑ رہا تھا۔ یوں جب عطیہ ایگزام دے کر فارغ ہوئی تو میں نے بہنوں کی شادی کے فرائض ادا کرنے کی فکرمندی سے اپنی مصروفیات کو محدود کر لیا، تاکہ شادی کی تیاریوں میں ماں کو اطمینان کا احساس رہے۔ اس حوالے سے میں لطیف بلوچ سے معذرت کرتے ہوئے کولیگ کے عہدے سے سبکدوش ہوگیا اور بڑا بھائی ہونے کے ناتے ثریا اور عطیہ کی شادیوں کو نمٹانے میں لگ گیا۔

ایک مہینے کا عرصہ شادی کی گہما گہمی میں مصروف یوں گزر گیا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ میری ایک دو بار لطیف بلوچ سے فون پر بات چیت ہو سکی تھی۔ ان کی زبانی یہ جان کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ وردہ نے میری ناصحانہ باتوں پر عمل کیا تھا اور خود کو لطیف اور حفصہ بھابی کے مزاج کے مطابق اس حد تک بدلا تھا کہ دونوں میاں بیوی کے گلے شکوے دور ہو گئے تھے۔ وہ اپنے ممی ڈیڈی کے ساتھ پارٹیز میں آنے جانے لگی تھی۔ اسٹڈی اور ریسرچ کا شوق ذوق کم ہو گیا تھا اور محض ماں باپ کی خوشی اور اطمینان کے خیال سے وہ ہم عمر لڑکیوں اور لڑکوں کی ریزروئیشن میں وقت گزارنے لگی تھی۔

شادی سے چند روز پہلے میں انویٹیشن کارڈ دینے لطیف بلوچ کے بنگلے پر گیا تو دالان سے گزر کر کامن روم کی جانب بڑھتے ہوئے حسب عادت وردہ نے پرشوخ انداز میں عقب سے سوویلکم مائی انسٹرکٹر کہہ کر چونکا دیا تھا وہ پرتجسس لڑکی میری ناصحانہ گفتگو سے جب زچ ہوتی تو بے اختیار مجھے انکل کے بجائے انسٹرکٹر کہہ کر مخاطب کرتی۔ مجھے اسٹیچو کر کے وہ گھوم کر میرے سامنے آئی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر خوشی سے کھلکھلاتی مسکراہٹ تھی اور تازہ سیبوں جیسے رخسار تمازت سے دمک رہے تھے لیکن اس کے انداز تخاطب سے مجھے محسوس ہوا کہ جیسے وہ دل سے افسردہ ہو۔ انسان کے ناصبور دل میں دو جذبے بہت قدر و قیمت کے حامل ہوتے ہیں۔ پہلا خودداری اور دوسرا خودرائی، وہ خودداری سے بری اور ناگوار باتوں کو نبھانے کا سمجھوتہ کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس وہ خودرائی کے پرجوش جذبے سے اپنی قابلیت کا لوہا منوا کر الوہی خوشی محسوس کرتا ہے۔ شاید وردہ کی قلبی کیفیت بھی کچھ یوں تھی کہ وہ خلاف طبع اپنے ممی ڈیڈی کی خوشی کے لیے دوبارہ سے ہائی کلاس ماحول کی ہنگامہ خیز اور چکاچوند روشنیوں میں ماڈرن لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ وقت گزارنے لگی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ قدامت پسندی کی جانب مائل تھی اور یہ اس کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ میں نے شفقت و نرمی سے وردہ کے سر پر چپت رسید کی اور بولا۔

''کیسی ہو سویٹ ہارٹ؟''

''اچھی ہوں انکل!'' وردہ نے چھلکتے مہکتے جذبوں کو قابو کرتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

''اب تم بڑی ہوگئی ہو اس لیے مجھے یوں چونکا کر ڈرانے کی شرارت بچکانہ لگتی ہے جینس۔'' میں نے پرمذاق لہجے میں اس پرتجسس لڑکی کو سمجھایا۔

''پلیز انکل، میری اس عادت پر تو نہ ٹوکیں یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اس ماڈرن کالونی میں بہت قیمتی اور انمول ہوتی ہیں۔'' وردہ نے منہ بناتے ہوئے احتجاج کیا۔

''اچھا لڑکی جیسے تمہاری خوشی اور مرضی۔ اب یہ بتاؤ ڈیڈی گھر پر ہیں یا شوروم پر گئے ہوئے ہیں؟'' میں نے وردہ کو خفا دیکھ کر موضوع بدلا اور لطیف بلوچ کے بارے میں دریافت کیا وہ جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''ڈیڈی گھر میں موجود ہیں انکل، وہ آج شوروم نہیں گئے۔ آیئے میرے ساتھ ڈیڈی اور ممی دونوں کامن روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھے اپنی معیت میں لیے کامن روم کی جانب بڑھ گئی۔

میں کئی دنوں بعد ڈیفنس آیا تھا اس لیے لطیف اور حفصہ بھابی نے مسکراتے ہوئے پرتپاک انداز میں مجھے خوش آمدید کہا تھا۔ میں نے حال احوال کے بعد ثریا اور عطیہ کی شادی کا انویٹیشن کارڈ دوست کی جانب بڑھایا اور اپنائیت سے بولا۔

''یہ کارڈ محض رسماً آپ کو پہنچا رہا ہوں، ورنہ بہنوں کی شادی میں بھائی اور بھابی حفظ مراتب کے تحت بغیر دعوت کے ہی پہنچتے ہیں۔ کیا خیال ہے حفصہ بھابی؟'' میں نے پرخلوص لہجے میں کہتے ہوئے حفصہ بھابی سے تائید لینے کی غرض سے پوچھا۔

''کیوں نہیں یاور، تم نے مان سمان سے یہ کہا ہے تو میں اور لطیف بھی اپنا فرض ادا کرنے کے لیے وقت پر شادی کی تقریب میں پہنچ جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا لطیف۔''

''ہاں بھئی تم نے اطلاع پہنچا دی ہے اب ہماری جانب سے بے فکر ہو جاؤ یار۔'' لطیف بلوچ نے خوشگوار انداز میں کہا تو میں مطمئن ہو گیا۔ قریب کھڑی وردہ بھی انویٹیشن کارڈ کو وفور مسرت و حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ شادی میں شرکت کا سن کر اس پرتجسس لڑکی کے چہرے پر جوش و ہیجان عود کر آیا تھا۔ وہ پرشوخ لہجے میں چہک کر بولی۔

''دیٹس سرپرائز انکل، اس ویڈنگ پارٹی میں چاہے ممی ڈیڈی شریک نہ ہوں لیکن میں ضرور پہنچوں گی۔ اس آرٹسٹک ایونٹ کو میں نظر انداز نہیں کر سکتی سر۔'' وردہ کے زندہ دل جذبے سے روایات پسندی جھلک رہی تھی۔ اس کی بات سن کر لطیف اور حفصہ بھابی بے اختیار مسکرا دیئے۔ میں نے خوشگواری سی وردہ کو ایڈوائز دیتے ہوئے کہا۔

''اوکے جینس، شادی کے روز ثریا اور عطیہ کا فوٹو سیشن تمہاری ڈیوٹی ہے۔ کیا تم یہ کام کر لو گی؟'' میری بات سن کر وردہ کے چہرے پر ایکسائٹمنٹ کی کیفیت دوڑ گئی۔

''آف کورس...... میں شادی میں ایسی فوٹو گرافی کروں گی کہ رزلٹ دیکھ کر آپ پراؤڈ فیل کریں گے انکل۔'' وردہ نے شوخی سے گردن کو طنطنہ کر تفخر سے کہا تو میں اس پرتجسس لڑکی کی خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کا قائل ہو گیا۔ اس نے میری ہدایت پر لطیف بلوچ اور حفصہ بھابی کی خوشی کی غرض سے خود کو بدل لیا تھا کافی حد تک۔ پھر نصف گھنٹے بعد میں وہاں سے رخصت ہو کر گھر چلا آیا۔

اس کے بعد میں ثریا اور عطیہ دونوں بہنوں کی

شادی کے فریضے سے بحسن وخوبی سبکدوش ہوگیا۔ دونوں دلہن بن کر ماں اور میری نگاہوں کے سامنے اپنے اپنے پیا دیس سدھار گئیں۔

لطیف اور حفصہ بھابی شادی سے ایک دن پہلے پہنچ گئے تھے اور انتظامی امور میں میرا ہاتھ بٹاتے رہے تھے۔ وردہ کی خوشی دیدنی تھی وہ اس آرٹسٹک ایونٹ پر پرجوش سرگرمی سے فوٹوگرافی کا کام کرتی رہی اور گاہے بگاہے ثریا' عطیہ اور نویلہ سے ہنسی مذاق بھی کرتی رہی۔ وہ اکلوتی بیٹی تھی اور ماڈرن سوسائٹی کے بے باک اور آزاد ماحول سے شاکی وبے زار! اس لیے تینوں بہنوں سے گھل مل گئی تھی۔ اس کے علاوہ میری منگیتر نبیلہ اور اس کے گھر والے بھی شادی میں پیش پیش رہے تھے اور انہوں نے بھی ذمہ داری کو نبھانے میں اپنے تئیں میرا ساتھ دیا تھا۔

اب گھر میں ماں' چھوٹی بہن نویلہ اور میں رہ گئے تھے۔ اس لیے گھر کا طول وعرض خاموش اور سونا سونا محسوس ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ماں اب نبیلہ کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھی اور اس کے والدین سے فون پر بات چیت کرکے معاملات طے کررہی تھی۔ اس بارے نبیلہ سے مجھے موبائل پر دوطرفہ صورت حال کی روداد سننے کو مل جاتی تھی۔ ماں کو میری جانب سے اپنی من مانی کرنے کی اجازت تھی۔ اس لیے اس کی جلد بازی اور جٹ منگنی پٹ بیاہ کے اصرار پر جب نبیلہ زچ ہوکر گلے شکوے کرتی تو میں منہ پھاڑ کر قہقہے لگاتا جس سے نبیلہ کا موڈ آف ہوجاتا اور لائن کٹ جاتی۔

شادی سے فراغت کے بعد اب زندگی معمول پر آ گئی تھی۔ میں اپنی صحافتی زندگی اور اخبار کے جھمیلوں میں مشغول ہوگیا۔ مہینے میں دو تین بار لطیف بلوچ اپنی سیاسی تنظیم کو لیگ کا کوئی پروگرام کرتے تو مجھے بصد اصرار دعوت دیتے تو میں رپورٹنگ کی غرض سے چلا جاتا۔ ایک روز صبح گیارہ بجے میں اخبار کے دفتر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ لطیف بلوچ کی کال آ گئی۔

''خیریت تو ہے یار' بستر سے اٹھتے ہی مجھ پر چھاپہ مارنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟'' میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے لطیف بلوچ کو خوشگوار لہجے میں ٹوک کر طنزاً کہا۔

''تمہیں غلطی ہورہی ہے یار من' میں بستر سے اٹھ کر واش روم میں آ گیا ہوں۔'' لطیف نے مذاقاً مسکراتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو میں ہنس پڑا۔

''اوہو یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ شاید تمہارے واش روم کی ٹونٹی میں پانی نہیں آرہا ہے اس لیے مجھے فون کیا ہے کہ اس بارے میں خبر لگا کر واٹر سپلائی والوں کو متنبہ کردوں۔''

''تم لاجواب ہو یاور! ایک اخبار کا ایڈیٹر اور صحافی ہونے کا اچھا رعب ودبدبہ جھاڑتے ہو۔'' لطیف بلوچ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا تو میں بھی ہنس پڑا۔ پھر میں نے توجہ دلاتے ہوئے بزلہ سنجی سے بولا۔

''اچھا' میرے مذاق پر مسکین بننے کی ضرورت نہیں' یہ بتاؤ صبح میں اس وقت کال کیوں کی ہے؟''

''یار بات یہ ہے کہ میٹرک کا رزلٹ آ گیا ہے اور وردہ نے میٹرک میں اے ون گریڈ لیا ہے۔'' لطیف بلوچ نے وفور جذبات سے چہک کر اطلاع دی۔

''زبردست...... ویلڈن' یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے لطیف۔'' وردہ کو اس شاندار کامیابی پر میں نے اپنے دوست سے پرتپاک جذبے کا اظہار کیا۔ وہ پرجوش لہجے میں دوبارہ بولا۔

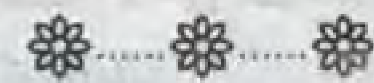
''اب تمہاری لاڈلی جینئس کی خوشی کو سیلی بریٹ کرنے کی غرض سے آج آؤٹنگ کا پروگرام بنایا ہے اور وردہ نے تمہیں اس میں انوائٹ کیا ہے۔ یہ کولیگ کا نہیں بلکہ تمہاری ہونہار اور قابل بھتیجی کی خوشی کا پروگرام ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے لیکن آؤٹنگ کے لیے کہاں جانے کا سوچا ہے؟'' میرے پوچھنے پر لطیف جواباً گوش گزار کرتے ہوئے پرجوش لہجے میں بولا۔

''یار تفریح کے لیے کہیں دور نہیں جارہے ہیں بلکہ میں نے یہاں سے قریب ہاکس بے کے ساحلی کنارے پر پکنک ہٹ جانے کا سوچا ہے۔ وہاں وردہ کی خوشی میں ہلا گلا کریں گے۔ میکڈونلڈ سے بہترین اور اسمارٹ لنچ کا انتظام ہوگا۔'' لطیف بلوچ نے قدرے وضاحت سے بتایا۔ میں نے اطمینان سے ہنکاری بھری تو وہ مجھے باور کراتے ہوئے بولا۔

''تم ایک سے ڈیڑھ بجے تک میرے بنگلے پر پہنچ جانا یاور' میں تمہاری بھابی اور وردہ ہم سب تمہارا انتظار کریں گے۔ سمجھ گئے بھئی۔''

''ٹھیک ہے لطیف' میں وقت پر تمہارے یہاں پہنچ جاؤں گا وش یو گڈ لک یار۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے خدا حافظ کہا اور موبائل آف کردیا۔



حسب پروگرام لطیف بلوچ نے ہاکس بے کے پرشور اور زندگی کے ہنگامے سے چھلکتے مہکتے ساحلی کنارے پر ایستادہ ایک خوب صورت اور کمفرٹیبل ہٹ میں ڈیرا جمالیا' یہ دو بجے کا وقت تھا۔ آج موسم بھی خوشگوار تھا۔ مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے ہوا میں خنکی کا احساس دل کو لبھا رہا تھا۔ کبھی کبھی سرمئی بادلوں کی اوٹ سے سورج کی غنودگی آمیز تمازت چھن چھن کر آتی' سمندر کے بھیگے ساحل پر کیف وسرور کو جلا بخش رہی تھی۔ مرطوب ہوا کے تھپیڑے پیار ونرمی کی ٹھنڈک سے خوشی وفرحت کا احساس دلا رہے تھے۔ حفصہ بھابی نے میکڈونلڈ سے ریزرو کیے لنچ کو مینج کرنے میں خود کو ہٹ میں مصروف کرلیا۔ میں اور لطیف ساحل پر لوگوں کی گہما گہمی سے محظوظ ہوتے ہوئے بات چیت کررہے تھے۔ کچھ فاصلے پر وردہ متلاطم اور شور کرتی موجوں سے اٹھکیلیاں کررہی تھی۔ وہ فطرت کی صناعی اور دلکشی سے مسحور ہوجاتی تھی' سمندر سے اس پرتجسس لڑکی کو عشق تھا اور آج تو اس کے دل کی مراد برآئی تھی۔ اس کے ممی ڈیڈی اور مشفق انکل اس کی کامیابی کی خوشی منانے کی غرض سے اس کے ہمراہ سمندر کے ساحل پر آئے تھے۔ وہ شوخی وشرارت سے ساحل کے پانی میں چھپاک چھپاک دوڑتی ہوئی میرے اور لطیف کے پاس پہنچی اور ہلچل آمیز لہجے میں بولی۔

''انکل...... ڈیڈی آپ سمندر پر آ کر بھی گپ بازی میں لگ گئے ہیں۔ نان سینس ایلڈرز! سمندر کا تھرل اینڈ فن اس کی موجوں میں چھپا ہوتا ہے۔ پلیز انکل' ڈیڈی آپ دونوں بھی ادھر ہنگامہ مچاتے پانیوں میں آئیے نا' موجوں کے ایموشنل ردھم کو سنیے نا' چلیے نا انکل...... ڈیڈی۔'' یہ کہتے ہوئے وردہ نے ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے سے اپنے ڈیڈی لطیف بلوچ کو ساحل کے پانیوں کی جانب کھینچنے کی تگ ودو کی۔ اس کے سرخ وسفید چہرے پر زندگی کے ہمکتے رنگوں کو دیکھ کر میں مسکرا رہا تھا جبکہ لطیف بلوچ کھلا گیا تھا۔ وہ بیٹی کی

ضد پر ہڑ بڑاتے ہوئے بولا

''اوکے سوئٹ گرل......لیکن مجھے سوٹ تو چینج کرنے دو وردہ۔''

''ڈزن میٹر ڈیڈی، کیا فرق پڑ جائے گا...... ناٹ اینی ریزن، چلیے نا پلیز۔'' ان دونوں باپ بیٹی کے درمیان اس کھینچا تانی سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا اس لمحے پیچھے پکنک ہٹ سے حفصہ بھابی کی اعلانیہ آواز گونجی۔

''سنیے لطیف پہلے ہلکا پھلکا ریفریش منٹ کرلیں، بعد میں نہانا۔ وردہ تم آتے ہی پانی میں گھس گئی ہو، بہت بری بات ہے یہ! یا ور آپ اسے انڈر اسٹینڈ کروائیں اور ہاتھ پکڑ کر لائیں پلیز۔''

بیوی کی مداخلت پر لطیف بلوچ یوں مسکرا اٹھا جیسے قیدی اپنے پولیس افسر کے ہاتھوں جاں بخشی پر بغلیں بجاتے ہوئے مسکرانے لگتا ہے۔ میں نے محبت بھری نظروں سے وردہ کو اشارتاً ممی کی بات ماننے کو کہا تو وہ بچوں کی مانند منہ بسور کر رہ گئی کچھ دیر میں لطیف، میں اور وردہ ہٹ کی ساحلی زمین پر بیٹھے ریفریش منٹ کر رہے تھے اور حفصہ بھابی کی انتظامی صلاحیتوں کی تعریف کر رہے تھے۔ اس ہلکے پھلکے کھانے میں چکن پیٹس، میٹھے آلوچے اور سموسوں کو پیش کیا تھا۔ اور چوائس کے لحاظ سے کافی اور کولڈ ڈرنک رکھی تھی۔ ری فریش منٹ کے بعد وردہ مجھے اور لطیف بلوچ کو سمندر کے شور مچاتے پانیوں میں لے گئی۔ اس وقت ساحل پر خوشگوار موسم میں بہت سی فیملیز سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ جتنے پکنک ہٹ بنے ہوئے تھے سبھی زندگی کی رونقوں سے شاد و آباد نظر آ رہے تھے۔ خواتین اور بچے چہک مہک رہے تھے۔ اور ادھر سے ادھر پکڑ دھکڑ کرتے شور و غل مچاتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ شرارت کرتے ہوئے کھلکھلا رہے تھے۔ بھیگے راحت افزا ساحلی کنارے پر بے شمار خاندانوں کو تفریح کرتے دیکھ کر زندگی کی خوشیوں اور ہم رنگیوں کا احساس دوچند ہو گیا تھا۔ ہر فیملی کے چھوٹے بڑے دائرے کو سچے رشتوں کی مہک نے گھیرا ہوا تھا۔ جس کو محسوس کر کے سمندر کی متلاطم موجیں بھی مست خرامی سے ان دائروں کے قریب پہنچ کر سرنگوں ہو رہی تھیں۔ گویا رشتوں کے تقدس کو سجدہ کر رہی ہوں ادھر میں دیکھ رہا تھا کہ لطیف اور وردہ دونوں باپ بیٹی موجوں کے درمیان کھیلتے کھیلتے نہانے لگے تھے۔ پھر لطیف وفور جذبات سے بھاگتے ہوئے کنارے پر کھڑی حفصہ بھابی کی جانب لپکا اور اسے بھی کھینچ کر تند و تیز موجوں میں لے آیا۔ وہ حیل و حجت کرتی ڈبکیاں لینے لگی۔ میں اور وردہ قہقہے مار کر ہنس رہے تھے۔ میں چونکہ آفس کے ویل ڈریس سوٹ میں تھا دوسرا مجھے واپسی میں پھر آفس جانا تھا اس لیے میں نے اپنے دوست سے معذرت کر لی تھی۔ تاہم اس کے باوجود میں اچھل کود اور موج مستی کے ماحول میں پانی میں بھیگ چکا تھا۔ لطف و شادمانی کے اس پرشور ماحول میں موجوں کے تھپیڑوں کے درمیان میں اپنے دوست کی خوشی کی خاطر کھڑا تھا۔ اور نہاتے ہوئے ان کی پرمذاق شرارتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ دفعتاً اس لمحے وردہ کی پرتجس آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''راکب...... راکب......راکب سومرو۔''

وردہ نے ساحل کی جانب رخ بدل کر جوش و مسرت سے کسی نامعلوم شخص کو پکارا تھا۔ اس محقق لڑکی کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ اس اجنبی کو کافی دیر سے تلاش کر رہی ہو۔ آواز دیتے وقت اس کے سیبوں جیسے رخسار وفور جذبات سے دہک اٹھے تھے۔ یہ اچھنبے کی بات تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس اجنبی شخص کو دیکھا جسے وردہ نے راکب سومرو کے نام سے آواز دی تھی۔ وہ ایک خوش شکل 24-25 سال کا نوجوان شخص تھا۔ جس نے کجاوے سے آراستہ صحرائی اونٹ کی مہار کو ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ اپنے پہناوے سے وہ صحرائے تھر کا کوئی بانکا سجیلا تھری شخص نظر آتا تھا۔ شلوار قمیص میں ملبوس وہ سادہ لوح اور معصوم سا انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس کی سانولی رنگت اور چہرے کے خدوخال ریگستانی علاقے میں اونٹوں پر سفر کرنے والے دیہاتیوں جیسے تھے۔ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ریتلے صحرا میں صعوبتیں اٹھانے والے اور جان جوکھوں میں ڈالنے والے محنتی، پختہ کار اور پرمشقت صحرائیوں کی مانند۔ اس نے کوئی ست رنگی رومال سر پر کلاہ کی مانند باندھ رکھا تھا۔ میں نے دیکھا راکب سومرو نے مسکراتے ہوئے دور سے ہاتھ لہرا کر وردہ کو یوں اشارہ کیا تھا جیسے اسے سلام کر رہا ہو، پھر میں نے قریب کھڑی اس محقق لڑکی کو حیرت و تعجب سے دیکھا اور اس سے قبل میں اس سے اونٹ والے کے بارے میں استفسار کرتا وہ پرجوش لہجے میں عجلت سے بولی۔

''ذرا ٹھہریے انکل میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میری نگاہوں کے سامنے قلانچیں بھرتی ہوئی، پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی اونٹ والے کے پاس پہنچ گئی۔ ایک صحرائی اجنبی کے لیے اس کا جوش و ہیجان دیکھ کر مجھے قدرے ناگواری کا احساس ہوا۔ اس وقت میں نے وردہ کی بے قراری اور تڑپ کا تجزیہ کیا تو مجھے لگا کہ اس پندرہ سولہ برس کی نوخیز معصوم لڑکی کا ایک اونٹ والے اجنبی شخص

سے یوں بے تکلفی کا اظہار کرنا بہت معیوب اور تشویش ناک بات ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پرتجسس لڑکی کی یہ لاابالی حرکت کسی انہونی کا سبب نہ بن جائے' ایک مہیب خوف میری سوچوں میں ناگ کی مانند سرسراہٹ کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس خفیف اندیشے کے تحت خود کلامی کرتے ہوئے سوچا۔

''کہیں یہ قدامت پسند لڑکی محبت کے مکروفریب میں مبتلا نہ ہوگئی ہو۔'' میں نے غور کیا وردہ پہلے بھی پاکس بے کے ساحل پر چہل قدمی کی غرض سے آئی تھی۔

''محبت انسان کو مشکلات میں سمجھوتہ کرنا سکھاتی ہے انکل۔ جب ممی ڈیڈی مجھے بار بار ڈکٹیٹ کرتے ہیں' مجھے ہائی کلاس ماحول کے پرنسپل پر چلنے کی ایڈوائز دیتے ہیں جو میری مرضی اور خوشی کے خلاف ہوتی ہے تو اس وقت میں محبت سے مسکراتی ہوئی سر ہلا دیتی ہوں اور ناگواری کے احساس کو ایک سانس خارج کرتے ہوئی ناک سے نکال دیتی ہوں۔ اگر محبت کا سہارا نہ ہوتو خلوص' مروت اور رشتوں کا احترام بھی باقی نہ رہے۔''

میں تلاطم خیز موجوں کے درمیان کھڑا وردہ کے محبت کے بارے میں پاکیزہ فلسفے پر سوچ کر اطمینان محسوس کر رہا تھا' وہ پرتجسس لڑکی اپنے ممی ڈیڈی کی خوشی پر خود کو قربان کرنے والی مضبوط قدموں کی مالک تھی۔ وہ کسی اجنبی کی محبت میں کیونکر مبتلا ہوسکتی تھی۔ اس فکروتدبر کے بعد میں نے خوشگوار نظروں سے سمندر میں نہاتے اپنے دوست لطیف بلوچ اور حفصہ بھابی کی جانب دیکھا۔ تندوتیز موجوں میں ڈبکیاں لیتے ہوئے دونوں کے چمکتے مہکتے چہروں پر ایک کامیاب ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے تاثرات تھے۔ اس لمحے یکبارگی ہم سب نے وردہ کی آواز سن کر چونکتے ہوئے ساحل کی جانب دیکھا۔ وہ اونٹ کے کجاوے میں بیٹھ چکی تھی اور اونٹ کی سواری سے لطف اٹھاتے ہوئے وہ پرشوخ جذبوں سے ہاتھ ہلاتی ہم کو یوں پکار رہی تھی جیسے کوئی صحرائی شہزادی اپنی روانگی کی اطلاع دے رہی ہو۔

''ممی' ڈیڈی......انکل......! میں سیر کرکے آرہی ہوں۔ دیٹ ایکسائٹڈ ایلڈرز جلدی آجاؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہونا۔'' یہ کہہ کر اس نے مہار تھامے راکب سومرو کو چلنے کا اشارہ کیا تھا پھر ہماری نظروں کے سامنے اونٹ سبک خرامی سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اس وقت حفصہ بھابی نے وردہ کو روکنے کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا تاہم لطیف نے ٹوکتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تھا پھر کچھ دیر سمندر کی شوروغل کرتی موجوں میں گزارنے کے بعد لطیف' حفصہ بھابی اور میں اپنے پکنک ہٹ پر لوٹ آئے۔ یہ ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ حفصہ بھابی لنچ کی تیاری میں مصروف ہوگئی اور لطیف چینج کرنے چلا گیا تھا۔ میں ایزی فیل ہوکر ساحلی ریتلی زمین پر بیٹھ کر ستا رہا تھا۔ اور پرسوچ نظروں سے کنارے پر لوگوں کی گھما گھمی میں اس اونٹ والے کو کھوجتے ہوئے دیکھ رہا تھا' قرب وجوار میں سواری کی تفریح کراتے بہت سے اونٹ مست خرامی سے ہچکولے لیے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر...... کسی کجاوے میں وردہ نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید وہ ست رنگی رومال والے راکب سومرو کے اونٹ پر دور تک چلی گئی تھی۔ کچھ دیر میں لطیف بلوچ ڈھیلا ٹراؤزر سوٹ تبدیل کیے ہٹ سے نکلا اور میرے قریب آ بیٹھا۔ پھر ہم دونوں پاکس بے کے پررونق ساحل پر لوگوں کی گھما گھمی پر گفتگو کرتے ہوئے وردہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

اندازاً پون گھنٹے بعد راکب سومرو کا پیروں کے گھنگرو بجاتا ہوا سجیلا اونٹ ہمیں آتا ہوا دکھائی دیا۔ راکب سومرو نے اس کی نکیل کو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ہام بمپک پر سوار وہ پرتجسس لڑکی سیر سپاٹے کی خوشی سے شاداں وفرحاں نظر آرہی تھی۔ وہ اونٹ کی لمبی گردن پر چھڑی سے دھول دھپا مچاتی کسی شرارتی بچے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ پھر اونٹ ہمارے قریب آکر رک گیا۔ وردہ نے اونٹ سے اترتے ہوئے راکب سومرو کا ہاتھ تھاما اور کود کر نیچے آگئی۔ میں نے دیکھا۔ اس نے نرمی وگداز لہجے میں صحرائے تھر سے تعلق رکھنے والے راکب سومرو سے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ راکب' تمہیں اپنے گھر والوں سے ملواؤں' تم پوچھ رہے تھے نا ان کے بارے میں۔'' یہ کہہ کر وہ اونٹ والے کو ساتھ لیتی ہمارے قریب پہنچی پھر اس نے میرے اور لطیف بلوچ کے متعلق بتاتے ہوئے تعارف کروایا۔ راکب سومرو نے سادہ لوح دیہاتی کی مانند ہاتھ جوڑ کر مجھے اور لطیف کو سلام کیا پھر وردہ نے خوشگوار لہجے میں ہمیں بتاتے ہوئے کہا۔

''انکل' ڈیڈی...... یہ راکب سومرو ہیں۔ نوکوٹ کے ایک گاؤں سے ان کا تعلق ہے۔ بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے مجھے صحرائے تھر کی تہذیب وثقافت کے بارے میں بہت دلچسپ باتیں بتائی ہیں اور میں نے ان پر فیچر لکھنے کا سوچ لیا ہے ایلڈرز۔'' اس محقق لڑکی کا جوش وخروش دیکھ کر میں اور لطیف بلوچ مسکرا دیئے۔

''اس بار قدیمی تہذیب کی کھوج کے لیے جس آرٹسٹک جانور کو تم نے چنا ہے وہ واقعی برمحل اور لاجواب ہے ڈیئر گڈ جینئس۔'' میں نے پرمذاق لہجے میں آراستہ وپیراستہ اونٹ کی جانب دیکھ کر جواباً تبصرہ کیا۔ لطیف بلوچ میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے راکب سومرو کو دیکھ رہا تھا۔ وردہ نے ستائشی جملے پر مجھے تھینک یو کہا پھر وہ کسی خیال کے تحت چونک کر لطیف بلوچ سے بولی۔

''ڈیڈی' میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے اونٹ پر سیر کی ہے۔ اب راکب سومرو کو پیسے دینا ہے۔'' اس کی بات سن کر لطیف بلوچ نے والٹ سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر وردہ کی جانب بڑھایا تو وہ فوراً منہ بناتے ہوئے ضدی لہجے میں بولی۔ ''افوہ ڈیڈی' اتنی دیر اونٹ پر سواری کی ہے۔ آپ پانچ سو نہیں بلکہ ایک ہزار روپے دیں راکب کو۔'' اس کی بات سن کر لطیف اور میں نے ایک دوسرے کی جانب حیرت واستعجاب سے دیکھا۔ یہ معمول کے معاوضے سے زیادہ ادائیگی تھی۔ پھر وردہ کی نیکی اور کم مائیگی کے خیال سے لطیف بلوچ نے ہزار کا نوٹ راکب سومرو کی جانب بڑھا دیا۔

''صاحب' یہ تو میری محنت سے زیادہ پیسے ہیں۔ میں آپ کو بقایا پیسے لاکر دیتا ہوں۔ آپ ادھر ہی ہووے نا سیٹھ جی۔'' راکب سومرو نے سادہ گنوار لہجے میں نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ تو لطیف کے بجائے وردہ جھٹ مسکرا کر جواباً بولی۔

''اینی وے دو سو چار سو ہی تو زیادہ ہوں گے بس' اسے میری جانب سے ٹپ سمجھ کر رکھ لو راکب! انفیکٹ ڈیڈی کبھی کبھار ہی ایکسٹرا آرڈنری خرچ کرتے ہیں۔'' اس کے بصد اصرار پر راکب سومرو

نے وہ ہزار کا نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ اور نیاز مندی سے سلام کرتا ہوا اپنے اونٹ کی جانب بڑھ گیا۔

''جینیئس لڑکی، تم اس اونٹ والے سے ایسی بات بول رہی تھیں جیسے وہ ایکسٹرا آرڈنری کے بارے میں جانتا ہو۔'' اس صحرائی دیہاتی شخص کے وہاں سے جانے کے بعد میں نے پرمذاق لہجے میں وردہ سے کہا۔

''انکل، آپ نہیں جانتے لیکن میں جانتی ہوں کہ راکب سومرو میری بات کو سمجھ گیا ہوگا۔ میں اس سے پہلے بھی کلفٹن پر اس کے اونٹ پر سواری کر چکی ہوں'' اس کے پرمعنی جملوں کو سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس لمحے میرے دوست لطیف کی نظریں شور مچاتے سمندر کے پانیوں پر تھیں۔ اس لمحے حفصہ بھابی ہٹ کی اونچائی سے آواز دیتی ہوئی سنائی دیں تو سب اپنی جگہ چونک گئے۔ ان کی اطلاع کے مطابق اسمارٹ اینڈ ڈیئر لنچ کی تیاری ہو چکی تھی۔ اس بار انہوں نے ہٹ کی اوپن گیلری میں کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ لطیف بلوچ، میں اور وردہ ہم سب لنچ کی غرض سے گول زینے سے اوپر کی جانب بڑھ گئے۔ پھر شام ڈھلے تک ہماری پکنک پارٹی انجوائے کرتی رہی۔ میرے دوست لطیف بلوچ نے آج بیٹی کی کامیابی کو اپنے شایان شان طریقے سے سیلی بریٹ کیا تھا۔ ہم سب کی محبتوں کے درمیان اس محقق لڑکی نے خوب من مانیاں کی تھیں اور اپنی نٹ کھٹ اور پرمذاق شرارتوں سے لطیف اور حفصہ بھابی کو ہنسایا تھا۔ قدامت پسند بیٹی اور جدت پسند ماں باپ کے باہمی گلے شکوے دور ہو گئے تھے۔ میں نے ان کے درمیان ثالث کا کردار ادا کیا تھا اور ان کی سوچوں کے دھارے کو ہم آہنگ اور یکجا کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ شام ساڑھے چھ بجے ہم سب پکنک ختم کر کے منی آلٹو میں بیٹھے اور کچھ دوری پر واقع ڈیفنس میں بنگلے پر لوٹ آئے تھے۔ بعد میں، میں بنگلے سے اپنے اخبار کے آفس چلا گیا تھا۔

اس کے بعد دکھ وصدمات کا رلا دینے والا تذکرہ ہے! پکنک والے دن کو ابھی ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ دلخراش سانحہ پیش آ گیا۔ میرے دوست کی ذہین وفطین بیٹی...... اپنے اسلاف کی سنہری تاریخ کے بارے میں جاننے کا ذوق وشوق رکھنے والی محققانہ مزاج کی مالک...... ماڈرن سوسائٹی میں جنم لینے والی قدامت پسند لڑکی...... محبت کے مکروفریب اور طاغوتی سحر کا شکار ہو کر موت کے ہولناک اندھیروں میں ہمیشہ کے لیے گم ہو گئی، آہ! وردہ اس صحرائی اونٹ والے کو سمجھنے میں دھوکا کھا گئی تھی اور اس کی تہذیب وثقافت کی کھوج اور جستجو میں اس کی پرفریب محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ ساحلِ سمندر پر اونٹ کی سواری سے سیر وتفریح کروانے والا راکب سومرو ایک سادہ لوح دیہاتی کے بہروپ میں چھپا صحرائی راہزن تھا جس نے ایک روز وردہ کو ورغلاتے ہوئے ساحل پر اپنے پاس بلایا اور پھر اس ماڈرن لڑکی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مسحور کر کے اپنے اونٹ کے کجاوے میں بٹھا کر چلتا بنا۔

معصوم اور جواں سال وردہ ایک شام اپنی ممی سے چہل قدمی کا کہہ کر کلفٹن کے ساحل گئی اور اس کے بعد لوٹ کر گھر نہیں آئی تھی۔

نوخیز وردہ کم عمری کے لحاظ سے ناسمجھ ہی تو تھی...... اس کی اچانک گمشدگی نے میرے دوست لطیف بلوچ اور حفصہ بھابی کو پریشان اور حواس باختہ کر دیا تھا۔ پندرہ برس کی معصوم وردہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، ان کی خوشیوں اور آرزوؤں کا محور...... جس کی موجودگی سے ان دونوں میاں بیوی کی شب وروز کی رونقیں آباد تھیں۔ مصروف اور متحرک رہنے کا احساس باقی رہتا تھا۔ ماڈرن اور پرتعیش زندگی میں اسے کبھی روک ٹوک کرنا اور کبھی اس کی خوشی کی خاطر دوڑ دھوپ کرنا، دونوں کی ازدواجی اور خانگی زندگی کا اہم مقصد تھا لیکن دو دن تک گھر سے لاپتہ رہنے کی وجہ سے ہر چیز درہم برہم ہو گئی تھی۔ دکھ اور اندیشوں سے وہ اسے تلاش کرتے رہے تھے۔ ان کی کل کائنات چھن گئی تھی، اس لیے خوشی اور اطمینان کا احساس ہی مطلق ختم ہو گیا تھا۔ وردہ کی گمشدگی کے بارے میں اطلاع دینے کے لیے صبح ہوتے ہی لطیف بلوچ نے مجھے گھر فون کیا تھا۔ بعد میں، میں نے اپنے اخبار میں اس کے لاپتا ہونے کی خبر کو دو کالم میں نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ اور اس کی تصویر بھی چھاپی تھی۔ دوم لطیف بلوچ کی سماجی تنظیم کولیگ کے متمول اور بارسوخ ممبران بھی پولیس کی کھوجی ٹیموں کے ساتھ وردہ کو شہر بھر میں تلاش کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اپنی بلوچ برادری میں سرکردہ رہنما ہونے کی وجہ سے لطیف بلوچ کے عزیز رشتے دار بھی اپنے اپنے علاقوں میں وردہ کو ڈھونڈنے میں غلطاں وپریشان تھے۔ شارع فیصل کے ایک معروف کاروباری بلوچ شخص کی اکلوتی بیٹی کی گمشدگی کی خبروں سے شہر میں اچھی خاصی سنسنی پھیل گئی تھی۔ لطیف بلوچ اور حفصہ بیگم نے دو دن بھیانک اندیشوں میں سوچتے اور بیٹی کی خیر وسلامتی کی دعائیں مانگتے گزارے تھے پھر تیسرے دن سہ پہر کے وقت پولیس کی ٹیم نے کولیگ کے ممبروں کی موجودگی میں وردہ کی لاش کو عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے قریبی رہائشی علاقے کے ایک پرانے قدیمی مکان سے برآمد کر لیا۔ تہذیب وتمدن سے پیار کرنے والی اس بھولی بھالی اور معصوم لڑکی کے جسم کو شدید زدوکوب کیا گیا تھا۔ جابجا گہری چوٹوں کے نشان سے بہیمانہ سلوک کا پتا چلتا تھا۔ خاک وخون سے لتھڑے اس کے چہرے پر کرب وآزردگی کا احساس منجمد ہو گیا تھا۔ اس کے سیبوں جیسے رخسار جو مسکرا کر باتیں کرتے ہوئے تمتمانے لگتے تھے، کی سرخ وسپید رنگت جھلس گئی تھی۔ تروتازہ گلاب کو نارسیدگی کھا گئی تھی۔ مشرقی روایات کو اپنا چلن بنانے والی اس محقق لڑکی نے شلوار قمیص زیب تن کیا ہوا تھا۔ جو زدوکوب ہونے کے دوران چیتھڑوں میں بکھرا اس کی بدنصیبی کی اطلاع دے رہا تھا اور تار تار دکھائی دیتا آنچل عزت وآبرو بچانے میں اس کی مزاحمت کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کا قاتل راکب سومرو اسے اونٹ پر بٹھا کر دو دن پہلے اس قدیمی مکان میں لے آیا تھا۔ بعد ازاں اس سنگدل وبے رحم صحرائی شخص نے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد اس خوش فکر لڑکی کو نہایت حیوانیت اور درندگی سے قتل کر دیا تھا اور اس قدیمی مکان سے کسی اور جگہ فرار ہو گیا تھا۔ پولیس نے وردہ کی لاش کے قریب سے اونٹ والے کا ست رنگی رومال تو برآمد کر لیا لیکن اسے متعلقہ علاقے سے گرفتار نہ کر سکی۔ بعد ازاں پوسٹ مارٹم کے بعد تنظیم کے کولیگ کے ممبر جواد صدیقی اور شیخ حسین الدین چیئرمین کی بیٹی کی لاش کو لے کر ڈیفنس پہنچے تو وہاں موجود بلوچ برادری کے لوگوں میں کہرام مچ گیا۔ میں اس المناک موقع پر لطیف

کے قریب موجود تھا اور اسے صدمے سے روتا دیکھ رہا تھا۔ میرے علاوہ کولیگ کے تمام ممبران اس دکھ کو محسوس کر رہے تھے جس سے لطیف بلوچ گزر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ بلوچ برادری کے لوگوں کے چہروں پر حزن وملال طاری تھا۔ وہ سب برادری کے سرپنچ اور رہنما کو بیٹی کی لاش پر آنسو بہاتا دیکھ کر غم ناکی سے یوں کھڑے تھے جیسے جذبات کی شدت اور آزردگی سے سکتے میں کھڑے ہوں۔

کچھ دیر بعد لطیف بلوچ کو واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے شیخ حسین الدین نے لاش کے قریب سے ملنے والے ست رنگی رومال کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وردہ کا قاتل جلدی میں وہ رنگین رومال موقعہ واردات پر بھول گیا تھا تو میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے مداخلت کرتے ہوئے وردہ کے قاتل کے چہرے سے نقاب کھینچ کر پھینکتے ہوئے ان دونوں کو آگاہ کیا کہ وہ ست رنگی رومال صحرائے تھر سے تعلق رکھنے والے اس اونٹ والے کا تھا جسے وردہ نے راکب سومرو کے نام سے لطیف اور مجھ سے ملوایا تھا۔

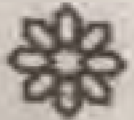
خاکستری رنگت والا اتھری راکب سومرو اس رومال کو کسی پگڑی یا کلاہ کی مانند سر پر باندھ کر اونٹ کی سواری کرواتا تھا۔ وردہ اس کی محبت کے جھانسے میں آ کر اس کے ظلم وبربریت کا شکار ہوگئی تھی۔ یہ سن کر لطیف بلوچ کا چہرہ غم وغصے سے متغیر ہوگیا تھا پھر موقع پر موجود برادری کے نوجوانوں نے بھی جان لیا کہ ان کے سردار کی معصوم بیٹی کو بے آبرو کرکے قتل کرنے والا سومرو قوم سے تعلق رکھتا تھا تب نفرت وانتقام کے جوش وجنون میں نوجوانوں کی ٹولیاں نعرے بازی اور ہوائی فائرنگ کرتی ہوئی بنگلے سے باہر سڑکوں اور بازاروں کی جانب نکل گئیں۔ لطیف بلوچ کی دل گرفتہ اور متغیر حالت نوجوانوں کو غم وغصے سے مشتعل کرنے کا محرک تھی۔ وہ بیٹی کی کچلی لاش کے پاس صدمے کی کیفیت سے دوچار تھا اور شرم وغیرت کے جذبات سے لال بھبھوکا ہوگیا تھا۔ میں اور لطیف کے بعض دوست اس لمحے چاہنے کے باوجود بھی ان جذباتی نوجوانوں کو روکنے کے لیے آگے نہیں بڑھے تھے اور بدلے کی آگ پورے شہر میں پھیلانے والے ان مشتعل نوجوانوں کے سامنے خاموش تماشائی بن گئے تھے۔

اس کے بعد کی ہنگامہ آرائی اور جلاؤ گھیراؤ سے شہر کے وہ علاقے جہاں سومرو قوم کی اکثریت آبادی رہتی تھی۔ خوف ودہشت کی لپیٹ میں آگئے۔ لیاقت آباد سے اورنگی ٹاؤن تک اور کریم آباد سے گلشن اقبال تک تمام مارکیٹیں اور دیگر کاروباری مراکز بلوچ قوم نے احتجاجاً زبردستی بند کروادیے۔ چھوٹی بڑی سڑکوں پر ٹائر جلا کر رکاوٹیں کھڑی کردی تھیں۔ حتیٰ کہ جیتا جاگتا شہر خانہ جنگی کے شدائد وآلام کی ہولناک منظر کشی کرنے لگا۔ معصوم وردہ کی تدفین کے موقع پر تین روزہ سوگ کا اعلان کیا گیا تھا اور راکب سومرو کی گرفتاری تک احتجاج جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس لیے پورے شہر میں تین دن تک ہنگامہ برپا رہا۔ اس پرتشدد جلاؤ گھیراؤ میں سات بے گناہ شہری مارے گئے اور لاتعداد زخمی ہوئے۔ سرکاری اور نجی املاک کو بھی شدید نقصان پہنچایا گیا۔ احتجاج کے باوجود راکب سومرو کو ابھی تک پولیس گرفتار نہیں کرسکی تھی۔ اس وجہ سے کشیدگی اور قہرآلودگی سے شہر کے کاروباری مراکز خریداروں کی کمی کے باعث ویران اور سراسیمہ نظر آتے تھے۔ میں اخبار کے دفتر میں اپنے روم میں بیٹھا ٹی وی پر کرنٹ افیئر کا پروگرام دیکھ رہا تھا اور شہر کے پرآشوب حالات کے نتائج دیکھ کر خاصی افسردگی محسوس کررہا تھا۔

چند لمحے حزن وملال کی کیفیت میں گزر گئے پھر اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے اس سوگوار خاموشی میں شور مچایا۔ میں نے ریسیور کان سے لگایا تو دوسری جانب ماں کی متوحش اور گھبرائی ہوئی آواز سن کر میں بوکھلا گیا۔

”یاور...... بیٹے دہشت گردوں نے طارق روڈ کے بازاروں میں پھر سے جلاؤ گھیراؤ شروع کردیا ہے۔ خدا خیر کرے نویلہ اور نبیلہ شاپنگ کے لیے اس طرف نکلی ہیں...... میرے اللہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔“ اتنا کہہ کر ماں کسی انہونی کے خوف اور دکھ سے رو پڑی۔ ان کی اطلاع نے مجھے بھی تشویش اور پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ تاہم میں انہیں تسلی دیتا ہوا بولا۔

”آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں، میں نویلہ اور نبیلہ کو لینے طارق روڈ جارہا ہوں۔ ان دونوں کو کچھ نہیں ہوگا ماں...... ہاں ماں...... میں بس دفتر سے نکل رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کیا اور دوڑتے ہوئے روم سے باہر نکل گیا۔ پھر پندرہ منٹ کی برق رفتاری کے بعد میری گاڑی حاجی طارق روڈ کے علاقے میں داخل ہورہی تھی۔ گاڑی پارکنگ کرتے وقت میں وہاں برپا قیامت خیزی محسوس کررہا تھا۔ میں نے دیکھا وردہ کا قاتل راکب سومرو کا اونٹ اپنی حیوانی اور باغیانہ وحشتوں سے بے گناہ انسانوں کو کچلتا ہوا چنگھاڑ رہا تھا۔ پولیس اور انتظامیہ وہاں سے دم دبا کر الگ کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے نوجوان اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے جلاؤ گھیراؤ اور مارپیٹ کررہے تھے اور سومرو برادری کے خلاف غم وغصے سے نعرے بازی کررہے تھے۔ راکب سومرو کے اس وحشی اونٹ کو نکیل ڈالنے والا کوئی نہ تھا۔ میں اس کشیدگی میں نویلہ اور نبیلہ کی فکرمندی سے اندیشوں میں گھر گیا تھا اور اپنی چھوٹی بہن اور منگیتر کی خیریت کی دعائیں کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر دکانوں کی آڑ لیتے ہوئے میں عروسہ مارکیٹ میں داخل ہوا جہاں سے میرے گھر والے خریداری کرتے تھے۔ میں نے پریشانی کے عالم میں وہاں نویلہ اور نبیلہ کو تلاش کیا لیکن دونوں وہاں موجود نہیں تھیں۔ اس مارکیٹ کی زیادہ تر دکانیں بند تھیں۔ اب میں فکرمندی سے پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔ مارکیٹ سے باہر آکر بے بسی سے سوچنے لگا کہ اللہ خیر کرے اس آفت زدگی میں وہ دونوں نجانے کہاں ہوں گی؟ پھر یہ سوچ کر میں ذیلی سڑک سے مین روڈ کی جانب بڑھ گیا لیکن دفعتاً نویلہ کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ میں نے دیکھا نویلہ اور نبیلہ نے قریبی فلیٹ میں پناہ لے رکھی تھی۔ بالکونی میں کھڑی نویلہ کو دیکھ کر میں اس کی جانب بڑھ گیا تھا۔ جیسے مجھے میری چھوٹی بہن نویلہ کی بجائے وردہ نے پکارا ہو! جسے بے آبرو کرکے قتل کردیا گیا تھا اور جس کی موت پر میرا شہر کا طول وعرض اپنے مکینوں کی بربادی پر آنسو بہا رہا تھا۔ میں وردہ کو اپنی پناہ میں لینے کے لیے تیزی اور پھرتی سے فلیٹ کا زینہ چڑھتا چلا گیا۔ کیونکہ اس ایک محقق لڑکی کی عزت وآبرو کو بچانے سے ہی میرے شہر کا امن وسکون بحال ہوسکتا تھا اور اس کی رونقیں آباد ہوسکتی تھیں۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

آصف ہارون......کوہاٹ

ج:۔نماز کی پابندی کریں۔ بعد نمازِ فجر 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پورے جسم پر پھونک ماریں۔

ہر نماز کے بعد سورۃ الفلق اور سورۃ الناس 9'9 مرتبہ پڑھیں۔آپ کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ان شاءاللہ

مریم شاہین......راولپنڈی

ج:۔عشاء کی نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ ہاتھوں پر دم کر کے سر اور پورے جسم پر پھیرا کریں۔

امتحان میں کامیابی کے لیے ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ سورۃ القریش پڑھا کریں۔دعا بھی کیا کریں۔

سر درد اور آنکھوں میں پانی آنا پڑھتے وقت ”کچا نزلہ“ کی نشانی ہے۔اس کا علاج کروائیں۔

شاداب......میر پور خاص

ج:۔جائیداد کے لیے سورۃ یسٰین کی آیت نمبر 82۔313 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

رات کے وقت آیت کے معنی ذہن میں رکھیں اور نیت اچھے کام کی ہو۔

نماز کی پابندی کریں' روزانہ استغفار اور درود شریف کی 1 تسبیح کریں۔

جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔ 11'11 مرتبہ اول وآخر درود شریف۔ لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

رشتہ کے لیے:۔سورۃ الفرقان آیت نمبر 70'74 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف بعد نماز فجر۔

جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں۔

سندس گلزار احمد......سرگودھا

ج:۔والدہ سیم پھلی کا سالن بنا کر کھائیں افاقہ ہوگا۔ آپ کی والدہ کرلیں۔

والد کا مسئلہ:۔بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہوتو جواب ساتھ لگایا کریں۔

والد کا مسئلہ:۔بیان نہیں کیا۔ جواب دیے گئے مسئلے کے بارے میں دوبارہ پوچھنا ہوتو جواب ساتھ لگایا کریں۔

سندس......سرگودھا

ج:۔رشتے کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں۔

سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 9'9 مرتبہ ہر نماز کے بعد اپنے اوپر دم بھی کیا کریں۔

جویریہ......لاہور

ج:۔”یا قوی“ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سر پہ ہاتھ رکھ کر ”یا فتاح“ 1 تسبیح روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک۔ دعا بھی کریں۔

ک۔گ......اورنگی ٹاؤن

ج:۔بعد نمازِ فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ پڑھیں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف اللہ سے معافی بھی مانگیں اور اچھے اور جلد رشتہ کے لیے دعا بھی کریں۔مسئلہ جلد حل ہوجائے گا۔ان شاءاللہ

ط۔ن......گجرات

ج:۔سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس 11'11 بار پڑھ کر ڈر ختم ہونے کا تصور کر کے پانی پہ پھونک مار کر پیا کریں۔3 ماہ تک۔

”یا واحد“ 1000 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

ث......ساہیوال

ج:۔”اللھم انا نجعلک فی نحور ھم و نعوذ بک من شرور ھم“

تصور ان کو رکھ کر پڑھیں کہ ان کی نحوست اور شر سے نجات دے اور جو میرے حق میں بہتر ہو اللہ میاں وہ کردیں۔آمین

صائمہ......فیصل آباد

ج: مسئلہ نمبر 1:۔سورۃ طٰحہٰ کی شروع کی 5 آیات ہر نماز کے بعد 7 مرتبہ پڑھ کر دم کریں۔

نمبر 2:۔فجر اور عشاء میں 41 مرتبہ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دم بھی کریں اور پانی بھی پلائیں دم کیا ہوا۔

نمبر 3:۔رات کو جب سو جائے سرہانے کھڑے ہو کر 1 تسبیح ”سورۃ العصر“ کی پڑھیں اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔اتنی آواز میں کہ اگر وہ جاگ رہی ہوتو سن سکے۔نیت:۔راہِ راست پہ آرہی ہے۔

رشتے کے لیے سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 مرتبہ بعد نماز فجر اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔گھر کا کوئی بھی فرد پڑھ لے۔

خدیجہ......سرگودھا

ج:۔”یا سمیع“ 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔نام کے معنی ذہن میں رکھ کر پڑھیں تصور بھی کریں ٹھیک ہونے کا۔

ساجد......شورکوٹ

ج:۔جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر دم کردیں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔

”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم“ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف 1000 مرتبہ پڑھ کر پانی پہ دم کریں۔ زیادہ سے زیادہ وہ پانی پلائیں پانی اس میں ملاتے بھی رہیں۔

رشتہ کے لیے:۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

عزیز فاطمہ......لانڈھی' کراچی

ج:۔بعد نماز فجر 3 مرتبہ سورۃ یسٰین 1 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے تمام مسائل کے لیے دعا کریں۔

شہنیلا توصیف......فیصل آباد

ج:۔رشتہ کے لیے بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ 1 مرتبہ پورا کلمہ پھر ”لا الہ الا اللہ“ 99 مرتبہ پھر محمد رسول اللہ اس طرح 3 تسبیح کرنی ہیں۔بعد نماز عشاء۔

بعد نماز فجر سورۃ یسین اور سورۃ المزمل کا معمول بنالیں۔ان شاءاللہ کاموں میں رکاوٹیں نہیں آئیں گی۔

جمیل......ساہیوال

ج:۔بعد نماز عشاء سورۃ عبس 23 پارہ 3 مرتبہ پڑھیں بغیر بسم اللہ۔درود شریف کے ساتھ۔بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 70.74 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ وظیفہ خلوص اور یکسوئی کے ساتھ کریں ان شاءاللہ جلد خوش خبری ملے گی۔

نادیہ......گجرات

ج:۔وظیفہ جاری رکھیں۔صدقہ بھی دیں (مرغی/بکرا) نیت جو رکاوٹ ہے وہ ختم ہوجائے۔

مہوش ”یا فتاح“ روز 1 تسبیح کریں۔اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

آمنہ اعوان......حیدرآباد

ج:۔بچیوں کے لیے:۔سورۃ الفاتحہ' سورۃ الاخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس' 7'7 مرتبہ پڑھ کر دم کیا کریں صبح وشام۔

”یا عدل“ 313 مرتبہ روزانہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔کیس کے لیے۔

ہر نماز کے بعد ”یا ولی“ 41 مرتبہ پڑھیں۔شوہر کے دل میں اپنی اور بچیوں کی الفت کا تصور رکھ کر۔

نادیہ طاہر......گوجرہ

ج:۔”یا رئوف“ 286 بار ہر نماز کے بعد پڑھ کر سب کے راضی ہونے کی دعا مانگیں۔3 ماہ تک۔

کمال فاطمہ......نیو کراچی

ج:۔”یا متعالی“ ہر فرض نماز کے بعد 151 بار ورد کریں اور دعا کریں۔جلد کامیابی ہوگی۔

حنا ریاض......لاہور

ج:۔ آپ نماز کی پابندی کریں۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نیت اور دعا یہ ہو کہ جہاں میرے حق میں بہتر رشتا ہو وہاں ہو۔ جلد از جلد۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔ وظیفہ پابندی اور خلوص کے ساتھ کریں۔

دوست نما دشمنوں سے بچیں عقل استعمال کریں۔

نسرین کوثر...... لاہور

ج:۔ تارا میرا تیل (کڑوا تیل) اس پر 11 مرتبہ سورۃ عبس (23 واں پارہ) پڑھ کر دم کریں روزانہ وہ تیل سر پر لگائیں۔

ثمینہ ارشاد...... رحیم یار خان

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

پھر دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسئلہ جلد ہو جائے گا۔

شائستہ غلام محمد...... میلسی

ج:۔ "یا ولی یا والی" 101 بار پڑھیں ہر نماز کے بعد دعا مانگیں۔

صبا اقبال...... گجرات

ج:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ المزمل (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) پڑھ کر دم کردیں چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔

رشتے کے لیے:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

ث۔ش...... کھاریاں

ج:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ الاخلاص پڑھ کر دعا کریں۔ اپنے رشتے کے لے۔

"یا فتاح" روزانہ 1 تسبیح نتیجہ آنے تک۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

گل آرا...... آزاد کشمیر

ج:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ اچھے اور جلد رشتوں کے لیے دعا کریں اور راضی بھی ہو جائیں۔

آمنہ بتول...... بہاولپور

ج:۔ 41'41 پڑھیں رات سوتے وقت سورۃ الفلق اور سورۃ الناس اور اپنے جسم پر پھونک ماریں۔

بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74'70 بار پڑھ کر اچھے رشتے کی دعا کریں۔ دورانیہ 3 ماہ۔



نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن

نام .... والدہ کا نام .... گھر کا مکمل پتا ....

....

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں ....

خوشبوئے سخن

عمر اسرار

غزل

کیا دکھ ہے کہ ہر بار دسمبر کی شبوں میں
اک شخص اترتا ہے میری خشک رگوں میں
سورج کی تب وتاب سلامت ہے تو اک دن
پھیلے گی بہر طور شفق نیلی تہوں میں
تم دیکھنا میں سانگ پہ قرآن پڑھوں گا
شبیری لہو دوڑتا ہے میری رگوں میں
ہم وہ ہیں جنہیں ساتھ ہی رکھتی ہے مسافت
ہم وہ ہیں جنہیں چین نہیں اپنے گھروں میں
لگتا ہے زمین اوڑھ کے سوجانا پڑے گا
چپ چاپ کسی شام انہی زرد رتوں میں
ہم جنگ میں ہر چیز کو جائز نہیں کہتے
ہم پیار بھی کرتے ہیں تو رہتے ہیں حدوں میں
ہم ایسے زمین زاد ہیں جو گھر نہیں رکھتے
ہم ایسے مسافر ہیں جو رہتے ہیں دلوں میں

میثم علی آغاز

غزل

عکسِ خواب بن کر آئینۂ سحر سے اتر گئی میں
اب ڈھونڈو گے تم کہاں فضاؤں میں بکھر گئی میں
رات بہا لے گئی تھی مرے خواب وخیال سبھی
صبح ہے کہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے کدھر گئی میں
یاد کرو اس وقت دی صدائے نوید تم نے مجھے
کہ شکستہ پا تری دہلیز سے جب اتر گئی میں
بھولا ہوا اک راگ چھیڑا ہے پرندوں نے آج
یوں لگتا ہے جیسے خیال میں ان کے ٹھہر گئی میں
اب یاد نہیں وہ آداب واطوار تری محفل کے
ایک مدت ہوئی رابطوں کے سفر سے گزر گئی میں
بارشیں اس طرح برسیں صحرا کی ریکھاؤں پر
کرب آلود بادلوں کی رگ وپے میں اتر گئی میں
بہاروں کے رنگ بھی مٹا نہ سکے دل کے داغ کو
یہ خلش تو سائے کی طرح ساتھ گئی جدھر گئی میں
تری تقدیس کی گواہ ہے تاریخ ایک بار پھر
اگرچہ شہر یزید وقت ننگے سر گئی میں

عصمت اقبال...... منگلا ڈیم

نظم

دل کے دریا میں
نفرت بھی محبت کی لہریں بھی
اس درخت کی شاخیں گھنی
اس چراغ کی روشنی ہر سو
اور بے برسات کے برستا پانی

تہنی ارشاد...... کراچی

گیت

تو پیار ہے میرا تجھے تازگی ملے
میری زندگی سے تجھ کو نئی زندگی ملے
ہو ڈوبتے کو کسی موج کا سہارا
کیا ظلمتوں میں رہے منزلوں کا یارا
یہ معجزہ ہے چاہتوں کے سفر کا
کہ ستاروں کے دم سے صبح کا اجیارا
میری دھڑکنوں سے تجھ کو وہ روشنی ملے
میری زندگی سے تجھ کو نئی زندگی ملے
تو رہے جو دل کی شدتوں میں باقی
تیری خلوتیں سدا راحتوں میں باقی
اور جذبوں میں ہوتی ہے صداقت
قسم سے ہے میری جرأتوں میں باقی
میری دل لگی سے تجھ کو وہ آسودگی ملے
میری زندگی سے تجھ کو نئی زندگی ملے

سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد، سندھ

نظم

اسے کہنا
وہ نہیں ہمارے تو
نہ سہی
اسے کہنا
ہمیں بھی آتا ہے
بنا تیرے جینا
اسے کہنا
وہ جو پھیرتے ہیں منہ
دیکھ کر ہمیں
ہمیں بھی آتا ہے منہ پھیرنا
اسے کہنا
ہمارے پیار کو ٹھکرا دیا
ہمیں جی بھر کے جس نے غم دیا
ہمیں بھی آتا ہے تڑپانا
اسے کہنا
دل سے ہو کر مجبور
یوں چپ رہتے ہیں
ورنہ آتا ہے
ہمیں بھی حد سے گزر جانا
اسے کہنا
ہمیں بھی آتا ہے بنا تیرے جینا

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور

غزل

سن شب ہجر غم کے ماروں سے
بات کی تھی جو چاند تاروں سے
چاندنی رات میں رہے بے تاب
جل بجھے آتشیں نظاروں سے
ان کی محفل میں بات کر نہ سکے
راز دل کہہ دیا اشاروں سے
اشک بہتے ہیں روشنی سی ہے
میری پلکوں پر ان شراروں سے
ان کی نظروں میں ہوگئے کم تر
بڑھ گئے درد میں ہزاروں سے
کیوں اڑا لے گئی خزاں جاوید
پھول مانگے تھے جو بہاروں سے

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

اب مرا زخم جگر اچھا ہے
ان کا انداز نظر اچھا ہے
ہر گھڑی دھوپ میں جو دے سایہ
راستے کا وہ شجر اچھا ہے
توڑ دیتے ہو تم آئینوں کو
تم سے تو آئینہ گر اچھا ہے
بے ہنر ہو تو نہ پوچھے گا کوئی
جس میں ہو کوئی ہنر اچھا ہے
ہو جو بے فیض وہ انساں ہی نہیں
کام آئے جو بشر اچھا ہے
ہو نہ لذت تو خریدے اسے کون
ذائقہ ہو تو ثمر اچھا ہے
میں سمجھتا ہوں پہلے سے جمال
اب مرا زاد سفر اچھا ہے

سمیع جمال...... کراچی

غزل

اپنے حالات کی بربادی پر رویا نہ کرو
سامنے غیر کے ہر راز کو افشا نہ کرو
بیت ہی جائیں گے یہ زیست کے مشکل لمحے
کسی کم ظرف کے آگے کبھی چرچا نہ کرو
درد بھی روح کو بے چین اگر کرنے لگیں
اپنے ماضی میں کبھی بھول کر جھانکا نہ کرو
تجھ کو تنہائی بھی ڈسنے لگے ناگن کی طرح
بزم میں غیر کی جا کر کبھی بیٹھا نہ کرو
تم کو توقیر انا کی بھی جو چاہت ہو اگر
اپنی خودداریٔ دل کا کبھی سودا نہ کرو
جو مقدر میں نہ ہو اس کی طلب کیا کرنا
چاند کو ہاتھ میں لینے کی تمنا نہ کرو
آرزوئیں بھی تو تتلی کی طرح اڑنے لگیں
اپنی آنکھوں میں حسیں خواب سجایا نہ کرو
درد دل حد سے سوا بھی اگر ہوجائے غزل
ہاتھ سے دامن صبر تم کبھی چھوڑا نہ کرو

سلمیٰ غزل...... گلشن اقبال

غزل

پہروں بیٹھ کے رونا تھا
پیار میں یہ تو ہونا تھا
غم ہی اپنا ساتھی تھا
غم ہی اپنا بچھونا تھا
نفرت کا اس دنیا نے
بیج تو آخر بونا تھا
حاصل ہوا جو مشکل سے
آخر اس تو کھونا تھا
شیشہ جان کے توڑ دیا
جیسے پیار کھلونا تھا
چند لمحوں کی خوشیوں میں
داغ دکھوں کا دھونا تھا
بھول کے اس کو رانا جی
لمبی تان کے سونا تھا

قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

نا خداؤں نے ہم کو مارا ہے
راہنماؤں نے ہم کو مارا ہے
بچ گئے تھے گناہ گاروں سے
پارساؤں نے ہم کو مارا ہے
بر لب جو سخت پیاسے ہیں
کہ بلاؤں نے ہم کو مارا ہے
آج تک ہم سمجھ نہیں پائے
کن خطاؤں نے ہم کو مارا ہے
ہم تھے صحرا نشین لوگوں میں
ٹھنڈی چھاؤں نے ہم کو مارا ہے
بھول بیٹھے مقام سلطانی
التجاؤں نے ہم کو مارا ہے
ہم تھے ساتھی وفا شناسوں کے
بے وفاؤں نے ہم کو مارا ہے
دور منزل سے رہ گئے ہیں قمر
اپنے پاؤں نے ہم کو مارا ہے

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

کیا کہوں مجھے کیا کہنا پڑا ہے
سنتا کہاں مجھے سننا پڑا ہے
آسیب زدہ شہر کے مکانوں میں
پھر تنہائی کا زہر پینا پڑا ہے
آندھیوں کا زور تھا بے شمار
بجھتا چراغ پھر جلانا پڑا ہے
غم و الم کے بڑھتے سائے تھے
دکھ مجھے ہر اک سہنا پڑا ہے
جو اپنا تھا وہی اک نہیں آیا
سب کے بیچ تنہا رہنا پڑا ہے
کوئی میرے مقابل ہی نہیں آیا
مجھے اکیلے ہی نشانہ بننا پڑا ہے

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

اب وفا اور جفا کچھ بھی نہیں
اس کا دنیا میں صلہ کچھ بھی نہیں
دل کو سینے میں چھپا رہنے دو
اس پر داغوں کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی بربادی کی تفصیل نہ پوچھ
یوں سمجھ لے کہ بچا کچھ بھی نہیں
ہم نے تعمیر کیے نئے تاج محل
خواب ٹوٹا تو بچا کچھ بھی نہیں
مارتا جاتا ہے دنیا ساری
اور کہتا ہے ہوا کچھ بھی نہیں
ہم نے دشمن کو لگایا ہے گلے
یعنی اب خون بہا کچھ بھی نہیں
بے حسی اپنی اب کہاں تک پہنچی واجد
اپنا دیکھا یا سنا کچھ بھی نہیں

پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر، کراچی

عجب راحت یہ محبت

کوئی چپکے چپکے یادوں میں
آ کے باتیں کرے
میری نیندوں میں خوابوں میں
آ کے وہ
رنگیں راتیں کرے
میٹھی میٹھی تشنگی کو جالیا میں نے
محبت کے حسین راز کو پالیا میں نے
چاہتوں کی سیج سج گئی
یوں وہ ملاقاتیں کرے
یہ تنہائی یہ جدائی سب اچھا لگے
بے قراری بے خودی میں جاگنا اچھا لگے
عجب راحت یہ محبت دل اس کی عبادت کرے
او ہم سفر کٹے سفر
تیرا ساتھ ہو جو عمر بھر
ڈگمگاؤں نہ کہیں بہکوں
تو جو پیار کی برساتیں کرے
میں نیندوں میں خوابوں میں......

عبدالمالک کیف...... صادق آباد

خواب

مجھے خواب دیکھنے سے
ڈر لگتا ہے
کیونکہ خواب
صرف خواب نہیں ہوتے
ان کی تعبیر بھی ہوتی
اور
تعبیر کی تلاش میں زندگی
کڑی مسافت بن جاتی ہے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

اعتراف

تمہارا یہ سرد رویہ
میرے لیے ہجر کی علامت بنا ہوا ہے
تمہاری سوچوں کا آئینہ بھی
مجھے ہی مجرم بنا رہا ہے
تو میں نے انکار کب کیا ہے
وہ ساری باتیں جو میں نے کی تھیں
تمام وعدے جو تم سے منسوب ہو رہے تھے
وہ وصال لمحے جو بے یقین موسموں
میں سمٹ گئے تھے
حقیقتیں خواب بن گئی تھیں
انہیں بھلا دو کہ اب زیادہ لچک بھی
کیا دوستی میں ہو گی
میں جیت کر بھی تمہارے قدموں میں
آ گری ہوں؟

خواجہ عرفانہ محبوب...... جتوئی

ذوقِ آگہی

عفان احمد

حضرت سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اپنی سرگزشت

حضرت سعدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دمشق کے دوستوں سے مجھ کو رنجش پیش آ گئی اس لیے میں بیت المقدس کے جنگل کی طرف نکل آیا اور میں نے جانوروں میں انس پیدا کر لیا یہاں تک کہ ایک دن عیسائیوں نے مجھ کو پکڑ کر قیدی بنا لیا اور یہودی کے ساتھ طرابلس کی خندق کھودنے میں مٹی کے کام پر لگا دیا۔ حلب کا ایک رئیس کہ اس سے ہماری پہلی جان پہچان تھی اُدھر سے گزرا اس نے مجھ کو پہچان کر کہا: یہ کیا حالت ہے جو میرے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ میں نے کہا: کیا عرض کروں میں آدمیوں سے پہاڑوں اور جنگلوں میں بھاگا پھرتا تھا تاکہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے سے مشغول نہ ہوں آپ خود ہی اندازہ فرمایئے کہ اس گھڑی میرے دل پر کیا گزرتی ہو گی کہ حیوانات کی جماعت سے موافقت کرنی پڑی (دوستوں کے ساتھ جیل خانہ کی زندگی بہتر ہے غیروں کے ساتھ چمن کی زندگی سے)۔

اس حلب کے رئیس کو میری حالت پر رحم آیا اور اس نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے مجھ کو خرید لیا اور اپنے ہمراہ حلب لے گیا اس کی ایک نوجوان لڑکی تھی سو دینار سرخ کے عوض اس کا نکاح مجھ سے کر دیا جب ایک مدت گزر گئی تو اس بیوی نے کج خلقی اور لڑائی جھگڑا شروع کر دیا زبان چلانے لگی اور میری زندگی کو تلخ کرنے لگی (بری عورت نیک مرد کے گھر میں اسی دنیا میں اس کے لیے دوزخ ہے پناہ بُرے ساتھی سے خدا کی پناہ اے ہمارے ربّ ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا آمین)۔

ایک مرتبہ وہ ملامت کی زبان دراز کر کے کہہ رہی تھی تُو وہی تو ہے جس کو میرے باپ نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے خرید کر چھڑایا تھا۔ میں نے کہا: ہاں! میں وہی ہوں جس کو تیرے باپ نے دس دینار میں عیسائیوں کی قید سے چھڑایا اور سو دینار میں تیرا ہاتھ پکڑوا دیا یعنی ایک آفت سے چھڑا کر دوسری اس سے بڑی آفت میں پھنسا دیا۔

میں نے سنا ایک بزرگ نے ایک بکری کو بھیڑیے کے منہ اور پنجہ سے چھڑایا اور اپنے گھر لے آیا رات کو اس کے گلے پر چھری چلانے لگا بکری کی روح نے اس سے فریاد کی اور کہا: میں تو تیری شکر گزار تھی کہ تُو نے بھیڑیے کے منہ سے مجھ کو بچایا مگر جب انجام دیکھا تو معلوم ہوا کہ تُو خود ہی بھیڑیا ہے۔ (گلستان ص ۸۹)

فائدہ: دوستوں کی تکلیف پر صبر کرنا چاہیے اور خانگی معاملات میں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیے۔

فراست حسین...... سکھر

صحبت نیکاں

مسلمانو! اپنے سے بڑوں کے پاس بیٹھا کرو عالموں سے سوال کیا کرو اور دانش مندوں سے ملا کرو۔ (طبرانی)

ہر انسان اپنے دوست کے مشرب پر ہوتا ہے۔ پس پہلے ہی سے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کس کو دوست بناتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

خدمت میں حاضر ہوکر ایک شخص نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کسی نیک آدمی سے اس کے نیک اعمال کے باعث محبت کرتا ہے مگر وہ خود نیک اعمال اتنے نہیں کرتا جیسے اس نیک آدمی کے اعمال ہیں۔" سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "کچھ مضائقہ نہیں۔ آدمی قیامت میں اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ (یعنی) اس نیک کی صحبت کا اسے صلہ ملے گا۔ (بخاری)

نجم انجم سحر......فیصل آباد

یمن کے بادشاہ کی حاتم طائی سے دشمنی

مجھے یہ یاد نہیں یہ حکایت مجھ سے کس نے کہی یمن میں ایک دولت مند بادشاہ تھا' اس کو بخشش کا بادل کہا جاتا تھا اس لیے کہ اس کے ہاتھ درہم کی بارش برساتے تھے۔ کوئی آدمی اس کے سامنے حاتم کا نام لیتا تو بہت غصہ ہوجاتا کہ اس کی باتیں کیا حقیقت رکھتی ہیں جس کے پاس نہ ملک ہے' نہ حکم ہے اور نہ خزانہ ہے۔ ایک مرتبہ بھری محفل میں اس نے لوگوں سے حاتم کی تعریف سنی تو حسد نے دشمنی پر آمادہ کردیا۔ ایک شخص کو حاتم کے قتل پر مقرر کیا کہ جب تک یہ میرے زمانہ میں ہے میرا نیک نام مشہور نہیں ہوگا۔ اس بدبخت نے اس مشہور سخی کو قتل کے ارادہ سے صلہ بنی طے کا راستہ لیا۔ راستہ میں ایک نوجوان نے اس کا استقبال کیا جس سے اس کو محبت کی بُو آئی' خوب صورت عقل مند شیریں زبان۔ وہ اس رات میں اس کو اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ مہمان کے ساتھ شرافت برتی' غم خواری کی اور خدمت میں کوتاہی کی معافی چاہی' نیکی سے اس دشمن کا دل جیت لیا۔ صبح کو اس کے ہاتھ پیر پر بوسے دیئے اور کہا: ہمارے پاس چند روز اور ٹھہر جاؤ۔ یمن والے نے کہا: میں اب رک نہیں سکتا اس لیے کہ مجھے ایک بڑا کام کرنا ہے۔ میزبان نے کہا: اگر آپ بتائیں تو میں ایک دل دوستوں کی طرح پوری کوشش کروں گا۔ اس نے کہا: اے بہادر! دھیان سے سن اس لیے کہ بہادر پردہ پوش ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں شاید آپ حاتم کو جانتے ہوں گے جو مبارک نام نیک سیرت ہے' اس کا سر یمن کے بادشاہ نے مانگا ہے' مجھے معلوم نہیں کہ ان میں کیا دشمنی ہے۔ آپ کی مہربانی سے مجھ کو یہ امید ہے کہ اس کی جگہ جہاں وہ رہتا ہے مجھے بتادیں۔

نوجوان میزبان ہنسا کہ حاتم تو میں ہی ہوں' سر حاضر ہے' تلوار اٹھا اور تن سے جدا کرلے۔ ابھی رات کا وقت ہے اپنا کام پورا کرلے ورنہ پھر صبح ہونے کے بعد تجھے کوئی نقصان پہنچے یا تُو ناامید ہو۔ جب حاتم نے دل کھول کر اپنا سر پیش کردیا تو وہ شخص چیخ پڑا' زمین پر گر گیا اور اٹھا' کبھی زمین چومی' کبھی حاتم کے ہاتھ پیر چومے تلوار پھینک دی اور ترکش رکھ دیا پھر غلاموں کی طرح باادب سامنے بیٹھ گیا اور کہا: اگر میں تیرے جسم پر ایک پھول بھی ماروں تو میں مرد نہیں ہوں بلکہ مردوں کی اصطلاح میں عورت ہوں' اس کی دونوں آنکھیں چومیں اور بغلگیر ہوا اور وہاں سے یمن کی طرف روانہ ہوگیا۔

بادشاہ اس کی پیشانی سے سمجھ گیا کہ اس نے کام نہیں کیا ہے پوچھا کیا خبر ہے؟ شکار دان میں سر کیوں نہیں باندھا شاید حاتم نے تجھ پر حملہ کردیا اور تُو مقابلہ نہیں کرسکا' چالاک بہادر نے زمین کو بوسہ دیا بادشاہ کی تعریف کی اور آداب بجالایا پھر کہا: اے بخشش اور ہوش والے بادشاہ! حاتم کے بارے میں یہ خبر سن' میں نے اس کو ہنرمند' بہادر اور خوش اخلاق دیکھا' اس کی مہربانی نے میری کمر توڑ دی' احسان اور بڑائی کی تلوار سے اس نے مجھے مار ڈالا' اس نے اس کے جو اخلاق دیکھے تھے بتائے' بادشاہ نے قبیلہ طے والوں کی تعریف کی' قاصد کو انعام دیا کہ سخاوت حاتم کے نام پر ختم ہوگئی' اس کی حقیقت اور شہرت ساتھ ساتھ ہیں اگر لوگ اس کی تعریف کریں تو وہ اس کا بالکل حق دار ہے۔

عظیم راہی......ملتان

گلہائے متفرقہ

☆ جب تو یہ دیکھے کہ دشمن کی فوج میں پھوٹ پڑگئی ہے تو مطمئن ہوجا اور اگر وہ متفق ہوجائیں تو اپنی پریشانی کی فکر کر۔

☆ حد سے زیادہ غصہ کرنا وحشت لاتا ہے اور بے موقع نرمی کرنا ہیبت کو مٹاتا ہے نہ ایسی سختی کر کہ لوگ تجھ سے نفرت کرنے لگیں اور نہ اتنی نرمی کر کہ تجھ پر دلیر ہوجائیں اور تیری قدر نہ کریں۔

☆ ہر ایک کو طبعی طور پر اپنی عقل اور اپنے بچہ کی شکل اچھی معلوم ہوتی ہے اگرچہ کبھی خلاف واقعہ بھی ہوتا ہے۔

☆ بے وقوف کے لیے خاموشی سے بہتر کچھ نہیں ہے اور اگر وہ یہ مصلحت جان لیتا تو نادان نہ رہتا۔

☆ جو چیز جلد حاصل ہوتی ہے وہ دیر تک نہیں رہتی۔

☆ بہت سے کام صبر سے پورے ہوجاتے ہیں اور جلدی کرنے والا نقصان اٹھاتا ہے۔

☆ تحمل اور بردباری ابتداء میں کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر عادت ہوجانے کے بعد شہد سے زیادہ میٹھی لگتی ہے۔

ایم عمران سعید......فیصل آباد

طلب و آرزو

طلب ایجاد کا پیش لفظ ہے۔ جو کچھ دنیا میں ہے اس کی طلب ہمیشہ رہے گی مگر اپنی طلب کو اپنی عقل کے تابع کرلو کیونکہ طلب ایک وحشی گھوڑے کی مانند ہے جو اپنے سوار کو سرپٹ اور بے مہار دوڑاتا چلا جاتا ہے اور اگر تعقل کی باگیں اس وحشی گھوڑے کے گلے میں لٹکی ہو تو یہ وحشی گھوڑا ایجاد و تخلیق کے ان جزیروں تک لے جاتا ہے جہاں تک انسان کے قدم بھی نہیں پہنچتے۔ جو طلب کی تسخیر نہیں کرتے وقت آسیب بن کر ان کو ڈراتا رہتا ہے۔

آرزو آنکھوں سے بہنے والا وہ موتی ہے جو زندگی کا محرک بنتا ہے آرزو کے بغیر زندگی اس رباب کی طرح ہے جس کے نغمے سوکھ گئے ہوں۔ یہ بات بھی غلط نہیں کہ بے آرزوؤں کے بغیر زندگی اس پھول کی مانند ہے جو خوش بو سے خالی ہو اور جس کے گرد شہد کی مکھیاں بھی اڑنا پسند نہ کریں۔ یہ آرزو ہی ہے جو زندگی کا آئینہ ہے۔

انتخاب: ریاض بٹ......حسن ابدال



گمراہی

خان شفیق

ہر انسان بلکہ قوم اپنے ماضی کے ساتھ بندھی ہوتی ہے کیونکہ ماضی کے کھنڈروں پر ہی اس کے حال اور مستقبل کا دارو مدار ہوتا ہے۔ لوگ اپنے ماضی سے ہی سیکھتے ہیں اور پھر اس کے تجربات سے مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں۔ جو قومیں اپنے ماضی اپنی تاریخ کو فراموش کردیتی ہیں وقت انہیں بھی تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیتا ہے۔

اس داستان کا تعلق قبل از تاریخ سے ہے' قوم عاد جس کی طرف حضرت ہود علیہ السّلام کو بھیجا گیا آپ طوفان نوح کے سو سال بعد بھیجے گئے لیکن سال ہا سال کی مسلسل تبلیغ کے باوجود صرف ستر افراد ایمان لائے۔ یہ ایک طاقت ور قوم تھی جس کے افراد کے قد چھ فٹ سے دس فٹ تک ہوتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا۔

"کون طاقت میں ہم سے زیادہ ہے۔"

لیکن جب طوفان آیا تو نہ صرف یہ لوگ بلکہ ان کے محلات کی شان و شوکت خاک میں مل کر رہ گئی۔ آج بھی سعودی عرب اور شام کے درمیان ان محلات کے کھنڈرات درس عبرت بنے ہوئے ہیں۔

دیوتا' حموزہ کے مندر میں لوگوں کا ہجوم بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بروہا آج پوری شان وشوکت سے جلوہ گر ہونے والا تھا۔ مشک وعنبر کی خوش بو سے معبد کی پوری عمارت مہک رہی تھی۔ حسین کنواری دوشیزائیں معبد کے وسیع وعریض ہال میں سنہری تھالوں میں مختلف قسم کی شیرینی بھرے ہوئے حموزہ کے قدموں کے نیچے ایک نقرئی چبوترے پر رکھ رہی تھیں۔ حموزہ کا دیو قامت سراپا اس نقرئی چبوترے کے درمیان میں ایستادہ تھا اور وہ سرخ نگاہوں سے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ ہی تمام کائنات اور اس میں جو کچھ ہے سب کا مالک وخالق ہو پتھر کے اس دیو قامت دیوتا کی آنکھوں کی جگہ دو لعل جڑے ہوئے تھے جو معبد کی چکا چوند روشنی میں شعلے برسا رہے تھے۔ حسین رقاصائیں اپنے سروں پر سونے کے تاج سجائے نقرئی کرسیوں پر ایک صف میں بیٹھی ہوئی تھیں' کچھ دوشیزائیں چاندی کے طشتوں میں سرخ گلاب کی پتیاں بھرے باری باری دیوتا حموزہ کے سراپے پر نچھاور کر رہی تھیں۔

حموزہ کا معبد قوم عاد کے فن تعمیر کا ایک نادر روزگار نمونہ تھا۔ ایک بلند وبالا کوہساری سلسلے کے طول طویل حصے کو تراش کر ایک حسین عمارت کو وجود میں لایا گیا تھا جس کی تراش وخراش میں پورے پچیس سال صرف ہوگئے تھے اس سطح زمین پر شاید کوئی عمارت ایسی حسین اور شان وشوکت والی نہیں تھی جس کا صدر دروازہ پہاڑ کی چوٹی کو تراش کر بنایا گیا تھا جس کی بلندی تین سو ہاتھ تھی اور کشادگی ستر ہاتھ ایک وقت میں پچیس شتر ایک صف میں یہاں سے گزر سکتے تھے۔ حموزہ دیوتا کی عید کا یہ تہوار سہ شنبہ کی نصف شب سے شروع ہوکر مسلسل چھ راتیں گزر جانے کے بعد ساتویں شب کے نصف حصے میں ختم ہوتا تھا۔ دفعتاً نرسنگے معبد کے خدمت گاروں نے دھونکنے شروع کردیے ان خدمت گاروں کو جبراز کہا جاتا تھا۔ دوسرا طبقہ حموزہ کے پجاریوں کا تھا جو مقدوسی کہلاتے تھے۔ نرسنگوں کے دھونکنے کے فوراً بعد ہی ایک ہلچل سی شروع ہوگئی اور قوم عاد کا ہجوم اس وسیع وعریض ہال میں جمع ہونا شروع ہوگیا۔ جہاں شمالی سمت ایک بڑے سنگ مرمر کے چبوترے پر دیوتا حموزہ کا بلند وبالا سراپا گڑا ہوا تھا اور جس پر معبد کی داسیاں مسلسل سرخ گلاب کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ اس دوران قوم عاد کے امراء اپنی ریشمی تھیلیوں میں سونے کی مہریں لیے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ امراء کے اس طبقے کو حمرازی کہا جاتا تھا اور عاد کی علمداری میں مقدسیوں کے بعد ان کا بڑا بلند رتبہ تھا انہیں سونے کی یہ تھیلیاں دیوتا حموزہ پر نچھاور کرنی تھیں۔

''حموزہ ہمارا خالق اس زمین وآسمان کا خالق اس نے اس زمین کا انتخاب اپنی رہائش کے لیے کیا ہے اور اگر حموزہ جس نے اپنے مقدس قدموں سے اس زمین کو سرفراز کیا ہے اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو شاید یہ زمین فضا میں تحلیل ہوجائے۔'' ایک مقدوسی شمراز نے اپنے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے دوسرے مقدوسی تھیم سے کہا جس کے کھجوروں کے باغ تھے۔

''کیا حموزہ اپنی جگہ سے حرکت بھی کرسکتا ہے؟'' تھیم نے سوال کیا۔

''حرکت' اس کی روحانی طاقتیں حرکت میں رہتی ہیں' کیا دیکھ نہیں رہے کہ اس کا بیس ہاتھ بلند سراپا کس بات کی دلیل ہے۔''

''کس بات کی دلیل ہے؟'' تھیم نے سوال کیا۔

''ہم قوم عاد کے دراز قامت لوگ' کوہساروں کو تراش خراش کر مکانات' حویلیاں محلات اور معبدوں کو وجود میں لانے والے لوگ کیا اس زمین پر ہم سے زیادہ بلند قامت' طاقت ور اور دولت مند قوم آباد ہے۔ یہ سب برکتیں حموزہ کی ہیں جو خود انتہائی بلند قامت ہے اور قوم عاد کے بیٹوں پر اپنی برکتیں نچھاور کرتا رہتا ہے۔''

''لیکن حموزہ کو کس نے تراشا؟'' تھیم نے سوال کیا۔

''تھیم تم تو ہود کی طرح سوالات کر رہے ہو' وہ عقل سے عاری دیوانہ وہ ہی اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔ ہم اپنے خالق اور دیوتا کی بات کرتے ہیں تو اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔'' تھیم نے مزید سوالات کرنا مناسب خیال نہ کیا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے ابرو پر شکنیں پڑنے لگی تھیں۔ اسی دوران دوبارہ نرسنگے پھونکے جانے لگے یہ اس بات کا اعلان تھا کہ مذہبی پیشوا' بروہا کی آمد آمد ہے۔ معبد کی رقاصائیں حموزہ کے بت کے سامنے کشادہ فرش پر چھ قطاروں میں کھڑی ہوگئیں۔ ان کے سروں پر نقرئی تاج تھے' جن میں ہیرے' زمرد اور لال رنگ کے نگ جڑے ہوئے تھے۔ ان کے سفید لبادے ڈھیلے ڈھالے تھے لیکن ان کی کاٹ صرف زیر جامہ تک محدود تھی اور جسم کا بالائی حصہ یکسر برہنہ تھا صرف پستان سونے کے تاروں سے بنے ہوئے غلافوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ رقاصائیں دراز قامت اور اکہرے بدن کی حامل تھیں اور ان کے گلابی جسم قنادیل' مشعلوں کی روشنی میں نفسانی خواہشات کو دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ مزید ایک بار ایک بڑا سا نرسنگا پھونکا گیا اور حموزہ کے نشیب میں جو نقرئی نشستیں تھیں جن میں پھول پتیوں کی شکل میں نگ جڑے ہوئے تھے وہ

منشوری طرز پر تراشے گئے تھے۔ جن سے قوس قزح کے رنگ پھوٹ رہے تھے۔ نرسنگا پھونکے جانے کے فوراً بعد مہمنہ کی جانب سے مذہبی پیشوا بروہا نمودار ہوا۔ وہ آٹھ فٹ کے قریب دراز قامت شخص تھا۔ اس کے سر پر بال نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ شانوں سے لے کر پیروں تک اس نے سفید رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ کانسی جیسے رنگ کا تھا۔ گلے میں ہیرے جواہرات کی ایک بڑی سی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ ہاتھوں تک لبادے کی آستینیں تھیں۔ چہرے پر رعونیت کے اثرات بڑی بڑی آنکھیں، گول چہرہ، کھڑی ناک، اس کے چہرے سے انتہائی سختی اور ہونٹوں سے منتقم اور ظالم ہونے کی علامتیں بالکل واضح تھیں، پیروں میں پٹیوں والے چپل میں قیمتی نگ جڑے ہوئے۔ وہ قوم عاد کا مذہبی رہنما تھا۔ بروہا کے پیچھے مقدوسیوں کی ایک پوری جماعت تھی اور ہر ایک نے آگے کی جانب ناف کے قریب ہاتھ باندھ رکھے تھے اور تمام مقدوسی سفید رنگ کے لبادے پہنے ہوئے تھے لیکن ان کے گلوں میں سیاہ رنگ کے شال پڑے ہوئے تھے۔ اس کے آتے ہی سب لوگ کھڑے ہوگئے اور صف باندھے رقاصائیں رکوع کے بل ہوگئیں پھر اس نے اپنا چہرہ حموزہ دیوتا کی جانب کیا اس کے ساتھ مقدوسیوں نے بھی اپنے رخ اس جانب کر لیے بروہا تھوڑا سا حموزہ بت کے سامنے جھکا اور ساتھ ہی مقدوسی اور تمام حاضرین تقریب بھی جھک گئے۔ پھر وہ اپنی جگمگاتی ہوئی نشست پر بیٹھ گیا اس کے بعد تمام طبقوں کے لوگ بھی بیٹھ گئے۔ دفعتاً ایک انتہائی حسین رقاصہ جس کے بال سنہری تھے سر پر ہلالی طرز کا تاج تھا۔ اس کے برہنہ بازوں تک جواہرات کے زیورات آراستہ تھے۔ یہ رقاصہ ایک حسن مجسم تھی وہ صف باندھی ہوئی رقاصاؤں کے درمیان آ کر کھڑی ہوگئی اور پھر ایک سمت سے دف کے بجنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور وہ حسین رقاصہ حرکت میں آ گئی ایک ترتیب ایک ٹھہراؤ کے ساتھ دوسری رقاصاؤں کے جسم مچلنے لگے اور آوازیں بلند ہونے لگیں۔

حموزہ، حموزہ، حموزہ
محفل میں ایک سماں بندھ گیا تھا
سماء ہے، زمیں ہے، یہ محفل، یہ رنگ
رہبر رقاصہ نے سریلی آواز نکالی
حموزہ، حموزہ حموزہ

اور پتھر کا یہ طویل القامت بت، اپنے چہرے پر لعل کی آنکھیں جڑے ہوئے بے حس و حرکت تھا کچھ دیر بعد بروہا کا ہاتھ بلند ہوا اور رقاصہ ساکت و جامد کھڑی ہوگئی۔ بہر حال سات رقاصاؤں کا انتخاب بروہا کے ہاتھ کے اشاروں نے کر دیا جن کو اس کی خدمت کرنی تھی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

گہری تاریک رات تھی۔ آسمان پر ستاروں کے قافلے محو سفر تھے۔ فضا بالکل ساکت تھی۔ کبھی کبھار ہوا کا کوئی جھونکا چل جاتا اور پھر وہی ٹھہراؤ۔ قوم عاد کی شاندار حویلیاں، محلات منادر سر جھکائے کھڑے تھے اور کہیں کہیں دریچوں سے روشنی کی کرن نمودار ہو جاتی۔ وہ ان تاریکیوں میں کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان ایک درخت کے قریب کھڑی ہوئی تھی اور اسے کسی کا انتظار تھا کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اس نے کسی کو اپنی جانب آتے ہوئے محسوس کیا۔

''شاید یہ ابیل ہی ہے قد و قامت سے تو ایسا ہی

لگتا ہے۔'' اس نے سوچا اور جوں جوں یہ سایہ اس کی جانب بڑھتا رہا، اس کی امید پختہ ہوتی چلی گئی اور آخر کار آنے والے شخص کے سراپا کو وہ پہچان گئی۔ یہ ابیل ہی تھا۔

''میں پہنچ گیا ہوں ثماتی، آخر تم نے مجھے اس رازداری سے کیوں بلایا ہے۔''

''ابیل ان دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور جو کچھ میں تم سے کہنے جا رہی ہوں اس کو غور سے سننا۔'' ابیل اس تاریکی میں بھی اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''آخر ثماتی بات کیا ہے؟''

''میرا سوتیلا باپ مجھے معبد کی رقاصہ بنا دینا چاہتا ہے وہ عقار کے نشے میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے۔ اس حالت میں اس نے کئی بار مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی آخر میں کب تک خود کو اس سے بچاتی رہوں گی۔''

''ثماتی تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہیں معبد کی رقاصہ بنا دینا چاہتا ہے۔''

''میری ماں نے رو رو کر مجھے بتایا کہ وہ مجھے اپنی ماں سے جدا کر دینا چاہتا ہے، ابیل کیا عاد کی ان بستیوں سے ہٹ کر کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں تم ہو میں ہوں اور میری مجبور ماں ہو۔''

''کیا معبد کی زندگی تمہارے لیے باعث فخر نہ ہوگی جہاں ہر لمحے حموزہ کی برکتیں نچھاور ہوتی رہتی ہیں۔''

''لعنت ہو حموزہ پر، بروہا پر، مقدوسیوں پر، یہ عبادت گاہ نہیں یہاں ہر رات ابلیس رقص کرتا ہے، یہاں رات کی تاریکیوں میں بے بس رقاصاؤں کے جسم نوچے جاتے ہیں۔''

''تم اپنے مذہب سے پھر رہی ہو ثماتی اگر لوگوں کو پتا چل گیا تو وہ تمہاری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔''

''ابیل یہ کیسا مذہب ہے کیسے رسم و رواج ہیں جس میں سچائی اور اچھائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ پتھر کا یہ بت جسے قوم عاد کے سنگ تراشوں نے اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے، یہ ہمارا خالق، ہمارا معبود کیسے بن گیا۔ ذہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتا۔''

''کیا ہوڈ کی تبلیغ کے کچھ الفاظ تمہارے کانوں میں تو نہیں پڑ گئے۔''

''ابیل ذرا سوچو کچھ دنوں بعد قربانی کا تہوار آ رہا ہے جس دوشیزہ کے نام قرعہ نکلا اسے حموزہ کے قدموں میں قربان کر دیا جائے گا۔ ایک عرصے سے یہ رسم جاری ہے اور پھر عقامہ نوشی کا وہ تہوار جب نصف رات گزر جانے کے بعد جس عورت سے مقدوسی چاہے گا اپنے نفس کی آگ کو بجھا لے گا۔''

''یقیناً تم پر ہوڈ کی تبلیغ کا اثر ہو گیا ہے۔ کہاں سنا تم نے یہ سب کچھ۔'' ابیل نے پوچھا۔

''سچ کی آواز ہر جگہ پہنچ جاتی ہے۔'' ثماتی نے کہا۔

''مجھے خوشی ہے ثماتی تمہارے کانوں میں یہ الفاظ پہنچ گئے۔ میں خفیہ طور پر اس تحریک کا رکن ہوں جس کا آغاز محترم ہوڈ نے کیا ہے، لیکن ہم لوگوں کی تعداد اتنی کم ہے کہ کھل کر سامنے نہیں آ سکتے۔'' ثماتی ابیل کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگی۔

''بات پھر بھی ادھوری رہی، کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم گمراہی کے اس خطے سے کہیں اور چلے جائیں تاخیر خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔''

"میں ایسا نہیں ہونے دوں گا اطمینان رکھو۔"

"کیا سوچا ہے ابیل۔"

"ثماتی یہ وقت بتائے گا۔" ابیل نے جواب دیا۔

"اب میں چلتی ہوں رات صبح کی جانب لوٹ رہی ہے۔" اتنا کہہ کر ثماتی روانہ ہوگئی۔



وہ چند لوگ تھے جو ایک وادی میں اکٹھے ہوئے تھے ایک معزز شخص جس کا قد نو فٹ سے کم نہ تھا ان کے سامنے نمودار ہوا۔

"یہ تو کاہن ابرش ہے ہم کیوں یہاں جمع ہوگئے یہ ہمیں کیا نصیحت کرسکتا ہے۔" چند آوازیں بلند ہوئیں اور اس نے ان آوازوں کو سنا پھر وہ گویا ہوا۔

"تم لوگ سچ کہتے ہو میں کاہن ابرش ہوں لیکن حضرت ہودؑ کی ہدایت نے مجھے صراط مستقیم دکھا دیا ہے اور میں ان کی ہدایت کی بناء پر تمہارے سامنے آیا ہوں۔"

"حضرت ہودؑ کی جانب سے کیا ہدایات لے کر آئے ہو۔" لوگوں نے سوال کیا۔

"یہ ہدایت اس لیے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے تاکہ تم میں سے ہر شخص اس ہدایت کو پھیلانے میں مصروف ہوجائے اور یہ سچائی تمہارے ذہنوں میں بیٹھ جائے کہ نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔"

"ہم تمہاری اس بات پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں۔"

"اب میں تم سے کہتا ہوں، تم لوگوں نے انفرادی طور پر لوگوں کو اس بار اللہ کی جانب رجوع کرنا ہے جس کے قبضے میں ہماری جان ہے۔"

"ہم سے جہاں تک ہوسکے گا ہم اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے لیکن ابرش ہم دو طاقتوں کے درمیان پس رہے ہیں۔ ایک مذہبی حلقے کا سربراہ اور دوسرا قوم عاد کا فرماں روا عاد۔ کیا ہماری زندگیاں اجیرن نہ بنادی جائیں گی۔"

"سچائی اور صداقت کی راہ میں قربانیاں تو دینی ہوتی ہیں، لیکن اللہ کے پیغمبروں کی سنت کو جاری رکھنا یہ بھی ہمارا فرض ہے۔" ابرش نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس سرزمین پر ضلالت اور گمراہی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اس کو روکنے کی ہم اپنے اندر طاقت نہیں پاتے۔"

"آج سے سات صدیاں پہلے نوحؑ کی قوم نے وہی روش اختیار کی تھی جو قوم عاد کی ہے، ہبل لات اور منات تین بڑے بت تھے جن کی پوجا نوحؑ کی قوم کرتی تھی۔ آخر نوحؑ نے عاجز آکر اس قوم کو بد دعا دی۔

"اے اللہ اب نہ چھوڑ زمین پر کافروں کا ایک گھر بھی بسنے والا کہ نسل کافروں کی باقی نہ رہے اس زمین پر۔"

"میرے ایمان لانے والے ساتھیوں کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت ہودؑ کی زبان سے قوم عاد کے لیے بد دعا نکل جائے۔" ابرش نے کہا۔

"طوفان نوحؑ کے بارے میں ہم نے بھی سنا ہے اور یہ داستان نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ اے ابرش ہمیں اس بارے میں کچھ بتاؤ گے تاکہ ہم اس کا حوالہ دے کر قوم عاد کو ڈرائیں۔" لوگوں نے پوچھا۔

"وہ کشتی نہیں بلکہ ایک جہاز تھا کہا جاتا ہے کہ اس کی لمبائی چالیس سو ہاتھ اور چوڑائی چار سو ہاتھ تھی، پھر اس طوفان کی ابتداء ایک تنور سے ہوئی کہ

وہاں سے پانی ابلنے لگا چھ ماہ تک زمین سے بھی پانی ابلتا رہا اور آسمان بھی پانی برساتا رہا۔ یہاں تک کہ اس وقت کی تمام معلومہ دنیا زیر آب آگئی۔ صرف وہ ہی پرند اور انسان باقی رہے جو حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہوگئے تھے۔" ابرش یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ آسمان میں چاند کا طباق جیسا چہرہ تیر رہا تھا۔ گرد ونواح کے ماحول میں ایک گہرا سکوت طاری تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عاد کی سرزمین نوحہ خواں ہو، کیا خدا نے ابلیس کو اتنی فراغت دے دی کہ وہ جہاں تک اور جب تک چاہے ضلالتوں کو پھیلاتا رہے۔" تھیم نے سوال کیا۔

"ہاں قیامت تک وہ اپنے اس عمل میں مصروف رہے گا۔ یہ بات اہل ایمان کے لیے ایک آزمائش ہے۔" ابرش نے کہا۔

"ہم ان گمراہیوں کو روکنے کی طاقت نہیں رکھتے اور ابلیس کے مکروعن کے اتنے پھندے ہیں جنہیں نہ ہم قیاس کرسکتے ہیں اور نہ ہی ان سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ وہ گمراہی کو بھی سچائی کے لبادے میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔" تھیم کے ساتھی مزید نے کہا۔

"نوحؑ ایک مدت تک اپنی قوم میں تبلیغ کرتے رہے اس طویل مدت میں صرف چوراسی افراد ایمان لائے اور کفار ان کو ہر طرح کی اذیتیں دیتے رہے آخر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور نوحؑ نے ان کو بد دعا دی۔" ابرش نے تفصیل سے بیان کیا۔

"کیا ابرش قوم عاد کے ساتھ بھی ایسا ہوسکتا ہے۔"

"اگر حضرت ہودؑ پر مظالم بڑھ گئے تو اس بات کے قوی امکانات ہیں۔"

"پھر ہمارا کیا ہوگا ہمارا تعلق بھی تو قوم عاد سے ہے۔" مزید نے پوچھا۔

"تم لوگ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لاچکے ہو اور وہ رب کائنات یقیناً تمہارا کوئی بندوبست کرے گا بشرطیکہ تم اس کی وحدانیت کے لیے کام کرتے رہے۔" اس کے بعد یہ اجتماع برخاست ہوگیا۔



حموزہ کے معبد میں بروہا کی سرکردگی میں مقدوسیوں کا ایک اجتماع ہو رہا تھا مقدوسیوں کے گروہ کا ایک سربراہ کھڑا ہوا اور سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"سب تعریفیں مقدس دیوتا حموزہ کے لیے ہیں جو ہمارا نگہبان اور ہماری حفاظت کرنے والا ہے اور احترام وتحریم ہمارے مقدس مذہبی سربراہ بروہا کے لیے جس کے توسط سے ہمیں برکتیں ملتی ہیں۔ مجھ ناچیز نے چند خطرات کے پیش نظر مقدس بروہا سے یہ اجلاس بلانے کے لیے التماس کیا تھا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری اس درخواست کو شرف قبولیت حاصل ہوگیا۔ گزارش احوال یہ ہے کہ ہم ایک شخص کی سرگرمیوں کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں اور اب یہ سرگرمیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ محترم حاضرین اگر کسی بند میں کوئی سوراخ ہوجائے اور پانی رسنے لگے تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فوراً اس کا بندوبست کردیا جائے اور اگر ایسا نہیں کیا تو یہ چھوٹا سا سوراخ بڑی تباہی لے آتا ہے اور پھر پانی کے اس بہاؤ کو روکنا ناممکن ہوجاتا ہے، اب بھی وقت ہے کہ مقدس دیوتا کے اس مذہب کو بچانے کے لیے ہمیں قدم اٹھالینا چاہیے۔"

"یہ شخص کیا کہتا ہے اور کیا چاہتا ہے۔" اک

مقدوسی نے سوال کیا۔
''اس نے ایک ان دیکھے خدا کی رٹ لگا رکھی ہے ہمیں ہولناک عذاب کی دھمکی دیتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے خدا کی جانب سے جس کا کوئی پتا اور نشان نہیں۔ معلوم ہوا ہے کچھ احمقوں نے اس کی بات کو تسلیم کرلیا ہے، مجھے یہ بتاؤ کون ایسا ہے اس زمین پر جو ہم سے زیادہ طاقت رکھتا ہو۔
ابھی چند روز ہوئے کہ ان لوگوں کا کسی خفیہ جگہ اجتماع ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ ہر وہ شخص جو اس نئے دین کا ماننے والا ہے انفرادی طور پر حموزہ کے بیٹوں کو ترغیب دے گا کہ وہ اس نئے دین کو اختیار کرلیں۔ میں محترم حاضرین سے گزارش کروں گا کہ وہ باخبر ہوجائیں اور اگر اسی طرح ان کی تعداد بڑھتی رہی تو ہمارے مقدس اور عظیم دیوتا کے مذہب کے لیے بڑا خطرہ پیدا ہوجائے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس اجتماع میں سکوت چھایا رہا اور لوگ منتظر تھے کہ دیکھیں بروہا پر اس تقریر کا کیا اثر ہوتا ہے اور اس بارے میں وہ کیا کہے گا۔ بروہا نے گردن اٹھا کر لوگوں کا جائزہ لیا اور پھر اپنی بھاری آواز میں کہا۔
''ہمیں اپنی قوت کے ذریعے اس فتنے کو مٹانا ہوگا اور ہم جلد از جلد قدم اٹھائیں گے۔''
''اس سلسلے میں اگر قوم عاد کے حکمراں سے رابطہ کیا جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا۔'' مقدوسی الیمان نے کہا۔
''ہم سمجھتے ہیں یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں حکمراں تک یہ بات پہنچا دینا اس بات کی زیادہ تشہیر کرنا ہوگی پہلے یہ دیکھا جائے کون کون لوگ ہیں جو اس کے ہمنوا بن چکے ہیں اور پھر ان لوگوں کے نام معلوم کر کے حکمراں کے حوالے کردیے جائیں اور وہ اپنے طور پر ان لوگوں کا خاتمہ کرے اور بہانے مختلف تراشے جائیں۔'' ایک دوسرے مقدوسی نے کہا۔
ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک خادمہ آئی اور بروہا کے قریب آکر جھک گئی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور پھر دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر اشارہ کیا بروہا فوراً اپنی نشست سے کھڑا ہوگیا۔
''آسمان پر حموزہ کا دمکتا ہوا ایک ستارہ ٹوٹ گیا۔ لہٰذا اس اجتماع کو فی الفور برخاست کیا جاتا ہے۔'' مقدوسی سمجھ گئے کہ معبد کی ایک رقاصہ اس دنیا سے چل بسی، حقیقت یہ تھی کہ مقدوسی ایلیا نے نیند کے نشے میں ارمیانہ رقاصہ کو اس طرح اپنی ہوس کا تمام رات نشانہ بنایا کہ وہ جانبر نہ ہوسکی اور اس دنیا سے گزر گئی۔
''ایسی روحیں مقدس روحیں ہوتی ہیں جو مقدس لوگوں کی خدمات انجام دیتے ہوئے اس دنیا سے عالم بالا کا سفر اختیار کرتی ہیں۔'' بروہا نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے کہا اور ایلیا بروہا کا چہرہ دیکھنے لگا۔
''ایلیا حموزہ کی نگاہوں میں تمہارا بلند مقام ہے۔'' یہ سن کر ایلیا بروہا کے سامنے جھک گیا۔
''کل صبح ارمیانہ مقدس رقاصہ کا تابوت اٹھے گا اور جلوس کی شکل میں تمام مقدوسی ہادیہ حموزہ کا رخ کریں گے اور مقدس رسم کے مطابق تمام مقدوسیوں نے سیاہ لباس پہنا ہوگا۔ جلوس کی سربراہی ایلیا کریں گے کیونکہ ان ہی کے ذریعے ارمیانہ کو یہ مقام حاصل ہوا ہے اور ہماری خداوند حموزہ سے یہ دعا ہے کہ ایسا ہی مقام مزید مقدوسیوں کو جلد حاصل ہو۔'' بروہا نے کہا۔
''ہادیہ حموزہ عاد کی بستیوں میں وہ گہرے کنوئیں تھے جن میں چونا ڈالا جاتا تھا اور پھر مرنے

والوں کے جسموں کو ان کنوؤں میں ڈال دیا جاتا تھا۔ حموزہ کے معبد کی یہ رقاص دوشیزائیں اصل میں وہ حسین داسیاں تھیں جن کا انتخاب قوم عاد کے گھرانوں سے قرعہ اندازی کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ ہر سال دس حسین ترین دوشیزائیں عام لوگوں کے گھرانوں سے لی جاتیں اور اس مندر کے پجاریوں کی بھینٹ چڑھ جاتیں۔ لیکن امراء جن کو حمرازی کہا جاتا تھا ان کے گھرانوں کی دوشیزائیں اس سے مستثنیٰ تھیں۔ نیز اگر کوئی باپ اپنی خوشی سے اپنی بیٹی کو اس مندر کی داسی بنانا چاہتا اور اس کی بیٹی حسین و خوب صورت ہوتی تو مقدوسیوں کی جانب سے اس کو بھی قبول کرلیا جاتا اور بیٹی کے باپ کو گرانقدر رقم بھی مقدوسیوں کی جانب سے دی جاتی تھی۔

ارمیانہ کی موت نے رقاصاؤں میں ایک دہشت طاری کردی تھی۔ ارمیانہ کی موت نے ان میں ایک لرزہ طاری کردیا تھا۔ لیکن اخطونہ کو ایلیا کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ اخطونہ جس کا قد چھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ ہتھیلیوں کا پھیلاؤ دیکھنے کے قابل، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، بڑی بڑی کجلائی ہوئی آنکھیں، ستواں ناک، رنگ ایسا جیسے میدے میں گلابی رنگ ملا ہوا۔ ایلیا نے بارہا اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی جو اسے اب تک اخطونہ کے ساتھ لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملا تھا اور ارمیانہ کے سانحہ کے بعد اب اخطونہ کی یہ خواہش ہوئی تھی کہ مقدوسی ایلیا کے ساتھ اسے ایک شب گزارنے کا موقع مل جائے اور وہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ آخر ایک شام وہ قیامت بن کر اس کے سامنے نمودار ہوئی۔

''مقدس مقدوسی اپنی برکتوں سے ہمیں بھی نواز دیں آپ کی برکتوں کے مشروب کے لیے یہ خادمہ بڑی تشنہ ہے۔ سنا ہے جب بھی کسی رقاصہ پر آپ اپنی برکتیں نچھاور کرتے ہیں وہ پوری طرح سیراب ہوجاتی ہے۔'' ایلیا نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اس کے شباب کے کٹورے کچھ اس طرح نمایاں تھے کہ وہ مبہوت ہوکر رہ گیا اس کے دبیز سرخ ہونٹ کسی خواہش کا خاموش اظہار کررہے تھے اس کے انگ انگ سے آرزوؤں کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ قیامت بنی ہوئی اسے دعوت دے رہی تھی کہ آؤ اور شباب کے اس چشمے سے اپنے آپ کو سیراب کرلو۔

مقدوسی ایلیا سے نہ رہا گیا۔

''نبیذ اور عقار دونوں کو دوآتشہ بنالو آج کی شب ہم دونوں آسمانوں کی سیر کریں گے۔ ستاروں پر ٹھہریں گے چاند کے حسن سے لطف اندوز ہوں گے اور دور تک آسمان میں جاتی ہوئی کہکشاں پر سفر کریں گے۔'' اخطونہ نے بڑے دلفریب انداز میں کہا۔

''آج شاید دیوتا حموزہ بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم اخطونہ کے ساتھ راحتوں کے شبستان کی سیر کریں۔'' اس نے اپنے دل میں سوچا۔

''جب استراحت کا دلفریب ساز بجا تو اخطونہ ہم تمہارے منتظر ہوں گے۔'' ایلیا نے کہا۔

''شکر ہے حموزہ دیوتا کا آپ نے ہماری بات تو مانی۔'' اخطونہ نے اٹھلا کر کہا اور پھر وہ لہراتی ہوئی بل کھاتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

رات ہوئی، قیامت خیز رات ایلیا نے شب کی ابتدا میں عقار اور نبیذ کے جام چڑھانے شروع کردیے تھے۔ ابلیس اس کے وجود میں مچلنے لگا تھا اور جب استراحت کی شہوت انگیز موسیقی بجی اور مقدوسیوں کے وجود میں نفس کا سانپ مچلنے لگا تو ایلیا جو نبیذ اور عقار کے جام پہلے سے چڑھاتا رہا تھا شدت سے اخطونہ کا انتظار کرنے لگا۔ اخطونہ نیم برہنہ حالت میں قیامت جگاتی ہوئی آئی اور ایلیا عالم بے تابی میں اپنی مسند سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑھ کر اخطونہ کو اپنی گرفت میں لینا چاہا لیکن وہ اٹھلا کر ایک جانب ہٹ گئی۔

''کچھ جام اور چڑھالو میرے مقدس مقدوسی ابھی تو شب کا آغاز ہوا ہے، ساری رات باقی ہے۔'' اخطونہ نے کہا۔ اس کے وجود سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ صندل اور عنبر کی مقدس خوشبوئیں۔ ہر ساعت کے بعد دیوتا حموزہ کے وجود پر چھڑکا جاتا تھا۔ اخطونہ نے سنگ سرخ کا حسین جام بھرا اور ایلیا کے ہونٹوں سے لگادیا اور پھر دوسرا جام اور پھر تیسرا جس میں اس نے ایلیا کی آنکھ بچا کر ایک سفوف شامل کردیا تھا۔ اس جام کو پینے کے بعد ایلیا کا حلقوم بند ہوگیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں باہر نکل آئیں اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا یہ انتہائی تکلیف دہ کیفیت تقریباً ایک ساعت (مراد ایک گھنٹے) تک قائم رہی اور پھر وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔ اخطونہ نے پہلی فرصت میں سنگ سرخ سے تراشے ہوئے جام کو دریچے سے باہر پھینک دیا جو گہرائیوں میں جا گرا۔ حموزہ کے مندر کے گرد علاوہ صدر دروازے کے ساتھ ایک خندق جو بیس ہاتھ گہری اور دس ہاتھ چوڑی تھی کھودی گئی تھی اور جس میں ہر وقت پانی بھرا رہتا تھا پھر وہ بڑی خاموشی سے اپنے کمرے میں واپس آگئی اسے نہ جاتے ہوئے کسی نے دیکھا اور نہ واپس آتے ہوئے۔

''نفس کے بھیڑیے میں نے تجھے تیرے انجام کو پہنچا دیا۔'' اس نے حقارت سے اپنے دل میں کہا۔



ایلیا کی پراسرار موت نے مقدوسیوں کو ایک فکر اور خوف میں مبتلا کردیا تھا۔ خود مذہبی پیشوا بروہا فکر مند ہوگیا تھا کیونکہ اس کی پراسرار موت کا راز بہت گہرا تھا۔ زیادہ تر خیال یہی تھا کہ شراب کی زیادتی اس کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ بہرحال اس کا تابوت بڑی شان و شوکت سے اٹھا۔ سنگ تراش کے حوالے اس کا تصویری خاکہ پیش کردیا گیا۔ دستور یہ تھا جو مقدوسی اس دنیا سے گزر جاتا اس کا بت تراش کر ایک بت خانے میں رکھ دیا جاتا اور اس کی ذات سے وابستہ مافوق الفطرت داستانیں مشہور کردی جاتیں، جو پہلی داستان اس کے بارے میں مشہور کی گئی وہ یہ تھی کہ اس میں پرواز کرنے کی صلاحیت تھی اور وہ ستاروں کی دنیا میں محو پرواز تھا کہ ایک ستارے کی زمین میں اترا اور وہ زمین اس کو اتنی پسند آئی کہ وہیں کا ہوگیا۔ انسان کے بارے میں ان کا عقیدہ تھا کہ انسان دو جسموں سے مل کر بنا ہے۔ ایک عارضی جسم اور ایک مستقل جسم اس دنیا کا جسم عارضی ہے اور دوسری دنیا کا مستقل جو ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور حموزہ جو تمام کائنات کا خالق ہے اس کا بت اس کی تشبیہ ہے اور اب وہ اپنے حقیقی جسم کے ساتھ آسمانوں میں موجود ہے اور اس کی آنکھ اندھیروں میں بھی دیکھتی ہے۔

اخطونہ پوشیدہ طور پر حضرت ہود سے بہت زیادہ متاثر تھی اور اس کے ذہن میں یہ بات راسخ تھی کہ عاد کی سرزمین پر ابلیس حکمران تھا وہ اکثر سوچتی کہ گناہوں کی اس وادی سے آخر چھٹکارہ حاصل کیا جاسکے تو کیسے اور کون سی جگہ پناہ لی جائے۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ ایک

ویران جگہ کھڑی ہوئی ہے دور دور تک نہ سبزے کا پتا ہے اور نہ پانی کا وہ حیران اور پریشان ہے کہ آخر جائے تو کہاں جائے۔ ایک لق و دق صحرا اور دور تک نظر آتا ہوا پہاڑی سلسلہ' پہاڑی سلسلہ تیری پناہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے اور تو وہاں جا کر پناہ لے لے۔'' اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے پراسرار آواز میں اس کی رہنمائی کی ہو پیاس کی شدت سے اس کا برا حال تھا لیکن وہ پھر بھی اس جانب روانہ ہوگئی اور جس وقت وہاں پہنچی تو زمین سے پھوٹتے ہوئے ایک چشمے کو دیکھا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا خوب سیر ہو کر پانی پیا اور جب نظر اٹھا کر دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ شاید یہ پھل دار درخت ہوں اخطونہ میں شفاف چشمے کا پانی پی کر کافی ہمت پیدا ہوگئی اور وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں کوئی درخت بھی ایسا نہیں تھا جو پھلوں سے لدا نہ ہو اب اس کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔

''یہ کون سا مقام ہے' میں کہاں آ گئی ہوں۔'' اس نے سوچا دفعتاً خاصے فاصلے سے اسے تیز ہواؤں کی سائیں سائیں سنائی دینے لگی۔ ان ہواؤں میں بلا کی شدت تھی اور ان کا زور بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہواؤں کے ساتھ گرد و غبار بھی اٹھ رہا تھا۔ یہ سلسلہ خاصی دیر جاری رہا اور جب ہوائیں رکیں اور گرد و غبار چھٹ گیا تو پہاڑی کی بلندی سے اس نے دیکھا کہ قوم عاد کے مکانات ان کی حویلیاں' امراء کے محلات' حموزہ کا معبد سب کچھ کھنڈرات میں تبدیل ہو چکا تھا اور حموزہ کا بت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ لیکن کسی شخص کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ وہ حیرانی کے عالم میں سب کچھ دیکھتی رہی کہ اچانک اس کے کانوں میں صبح کی بیداری کی موسیقی سنائی دینے لگی اور اس کی آنکھ کھل گئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگی۔

''یہ کیسا واضح اور بھیانک خواب تھا آخر یہ سب کچھ کیا تھا۔'' اس نے سوچا صبح کے وقت رقاصائیں حموزہ کے بت کے سامنے رقص کرتی تھیں۔ اسی دوران ایک رقاصہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''اخطونہ حیرت ہے تم ابھی تک بستر پر ہو' کیا تم نہیں جانتیں کہ آج صبح تم نے بھی رقص میں شامل ہونا ہے۔'' وہ یہ سن کر گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور رقص میں شریک ہونے کے لیے تیاری کرنے لگی۔

''اے ربِّ حقیقی مجھے اس ضلالت اور گمراہی کے ماحول سے نکال اس لیے کہ میرا دل گھبرانے لگا ہے مجھ پر تیرے وجود کی صداقت آشکار ہونے لگی ہے۔'' وہ رقص کی تیاری میں مصروف تھی اور اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ کون سی وادی ہے جو تو نے مجھے میرے خواب میں دکھائی یا میرے تصورات تھے جو کسی ایسی خیالی وادی کی خواہشات سے ہمکنار تھے اگر یہ میرے خیالات تھے تو انہیں حقیقت بنا دے۔'' وہ ہوڈ کے ربّ سے دعائیں مانگ رہی تھی۔

آخر یہ انسان اتنا بے عقل کیوں ہے جو پتھر کے مجسموں کو اپنا ربّ بنا بیٹھا ہے۔ پھر تمام رقاصائیں جمع ہو کر حموزہ کے جانب چلی گئیں۔

❀......❀......❀

حضرت ہود علیہ السّلام اور ان کے ماننے والوں کے لیے ظلم و ستم کا ایک طوفان اٹھا مقدوسیوں نے عاد کی سرزمین کو اہل ایمان کے لیے تنگ کر دیا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ہود علیہ السّلام سے

کہیں کہ وہ ان ظالموں کے لیے بددعا کریں۔ کچھ اہل ایمان نے ایک اجتماع میں کاہن ابرش سے کہا۔

''ذرا صبر سے کام لو اگر ہوڈ نے بددعا دے دی تو سمجھ لو خدا قاہر بھی ہے۔''

''کیا ہم بھی اس بددعا کی زد میں آجائیں گے؟'' اہل ایمان نے ابرش سے سوال کیا۔

''نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ وہ ربّ تو کائناتوں کا خالق ہے تمہاری حفاظت کا سامان ضرور کرے گا۔'' ابرش نے جواب دیا۔

''لیکن یہ ظلم اور زیادتی کب تک۔'' لوگوں نے بے چینی سے پوچھا۔

''بس گھبرا گئے کیا تم سے پہلے نوح کے دور میں اہل ایمان پر تشدد نہیں ہوا یہ اللہ کی آزمائش اہل ایمان کے لیے ہے۔'' ابرش نے کہا اسی دوران ایک دوشیزہ گھبراہٹ کے عالم میں اجتماع کے اوطاق میں داخل ہوئی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اس کا چہرہ حزن و ملال میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور اس کا لباس بے ترتیب تھا' وہ پریشانی کے عالم میں آ کر کھڑی ہوگئی ابرش نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''اے قوم عاد کی بیٹی کیا افتاد پڑی ہے تجھ پر۔''

''اے محترم انسان میرا سوتیلا باپ مجھے مقدوسیوں کے ہاتھوں بیچ دینا چاہتا ہے اور حموزہ کے مندر میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں میں نے جو کچھ اس مندر کے ماحول کے بارے میں سنا ہے اس کے تصور سے ہی گھن آتی ہے ہر گمراہی' ہر ذلالت کو مذہب کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس خدا کے واسطے جو تمام کائناتوں اور عالموں کا خالق ہے مجھے اس حموزہ کے جہنم سے بچائیں۔'' اتنا کہہ کر وہ دوشیزہ آنسو بہانے لگی۔

''ہم فی الحال تمہارا بندوبست کیے دیتے ہیں اور جلد ہی کوئی سبیل اللہ پیدا کر دے گا۔'' ابرش نے اسے تسلی دی۔

نصف رات کے قریب ابرش دوشیزہ کے خیمے میں آیا وہ اس وقت مشعل کی روشنی میں جاگ رہی تھی۔

''سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' ابرش نے اس سے کہا۔

''کہاں؟ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔''

''میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں مقدوسی جس دوشیزہ کا سودا کر لیتے ہیں اگر وہ منحرف ہو جائے تو اس کو قید اذیت میں رکھا جاتا ہے اور قربانی کے تہوار کے موقع پر حموزہ بت کے قدموں میں اذیت ناک انداز میں اس بت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔'' دوشیزہ یہ سن کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ابرش کو دیکھنے لگی۔

''آپ مجھے کہاں لے جائیں گے۔''

''ایک محفوظ مقام پر اگر بروہا کے مندر کے پجاری تمہیں تلاش کرتے ہوئے آ بھی جاتے ہیں تو وہ تمہیں ہمارے درمیان نہیں پائیں گے۔'' ابرش نے کہا اور پھر شمالی رات کی تاریکیوں میں ابرش کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

اب تشدد اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچتا جا رہا تھا لہٰذا حضرت ہود علیہ السّلام قوم عاد کو بددعا دینے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن اب بھی ان کے دل میں قوم عاد کے لیے نرم گوشہ تھا۔ شاید وہ راہ راست پر آجائیں۔ برسات کا موسم آیا نہ بادل اُمڈ کر آئے اور نہ بارش

ہوئی پورا ماہ گزر گیا اور وہ سال خشک سالی کا شکار ہوگیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر بروہا نے مقدوسیوں کا ایک اجلاس طلب کرلیا۔

''شاید ہمارا عظیم دیوتا ہم سے ناراض ہوگیا ہے۔'' ایک مقدوسی ادیوسی نے کہا۔

''حموزہ کی ناراضگی دور کرنے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔'' بروہا نے سوال کیا۔

''رقاصاؤں میں سے کسی حسین دوشیزہ کو حموزہ کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔'' ایک دوسرے پجاری شمائز نے مشورہ دیا۔

''تمہارے خیال میں سب سے حسین دوشیزہ کون ہوسکتی ہے۔'' بروہا نے کہا۔

''قد وقامت' شکل وصورت اور جسم کی مناسبت سے اخطونہ کے علاوہ کون ہوسکتی ہے۔'' شمائز مقدوسی نے کہا۔ یہ اجلاس اگرچہ بڑی رازداری کے ساتھ ہوا تھا لیکن معبد کی خادمہ مہورہ جو کافی سن رسیدہ تھی اور اس کو رقاصہ اخطونہ سے بے اندازہ لگاؤ تھا اس کے کانوں میں یہ بھنک پڑ گئی کہ اس کو بھینٹ چڑھانے کے بارے میں سوچا جارہا ہے اور ایک رات وہ دوسروں کی نگاہوں سے بچتی بچاتی اس کے کمرے میں گئی اس کو دیکھ کر اخطونہ اٹھ گئی۔

''کیا بات ہے مہورہ ماں بہت زیادہ پریشان نظر آرہی ہو۔''

''بیٹی کی زندگی خطرے میں ہو اور ماں پریشان نہ ہو۔'' مہورہ نے کہا۔

''کیوں خیریت۔''

''اس بڑے سے پتھر کے ٹکڑے پر تمہیں بھینٹ چڑھانے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔ شمائز نے بروہا کو مشورہ دیا ہے کہ اس سال بارش نہیں ہوئی پورا سال سوکھا گزر گیا شاید حموزہ ہم سے ناراض ہوگیا ہے کسی حسین رقاصہ دوشیزہ کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جائے اور اس سلسلے میں تمہارا نام لیا جارہا ہے۔''

''یہ بات تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟''

''بروہا نے مقدوسیوں کی خفیہ بیٹھک بلائی تھی اور میں نے ان لوگوں کو نبیذ اور عقار لا کر دی تھی۔ تمہارا نام آیا تو میں ایک کونے میں چھپ کر کھڑی ہوگئی اور سب کچھ سن لیا۔'' اپنی جان کی فکر کرو اخطونہ بیٹی تمہیں بھینٹ چڑھا دیا تو میں خود ہی مرجاؤں گی۔''

''مہورہ ماں تم اپنی بیٹی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو۔''

''تو کیا میں اپنی بیٹی کی موت کی آرزو کروں گی۔''

''تو پھر ایک کام کرو۔''

''کیا؟'' مہورہ مجسم سوالیہ نشان بن گئی۔

''اس دریچے سے خندق تک نشیب میں کتنا فاصلہ ہوگا۔''

''پچیس ہاتھ کا فاصلہ تو ہوگا ہی ہوگا۔''

''تیس ہاتھ لمبی قطن کی جبل بٹ لاؤ۔''

''تیس ہاتھ لمبی جبل! اس میں تو بڑا وقت لگ جائے گا اور اس عرصے میں اگر تمہیں بھینٹ چڑھانے کا دن مقرر ہوگیا تو میری بیٹی تو گئی میرے ہاتھ سے۔'' یہ سن کر اخطونہ سوچنے لگی۔

''کیا ارادہ ہے تمہارا؟''

''فرار اور اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔'' اخطونہ نے کہا۔

''خندق کے پانی کی گہرائی کا کچھ پتا ہے؟''

''رقاصاؤں کے جسموں کو متوازن رکھنے کے لیے ہر ایک کو پیراکی سکھائی گئی ہے اور میں تو ایک اچھی پیراک ہوں گہرائی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو۔''

اخطونہ نے کہا۔ ''ایک کام کروگی مہورہ ماں۔''

''کیا؟'' مہورہ ماں نے پوچھا۔

''چرمی تھیلے میں کچھ خشک میوے مجھے لا کر دے دو۔''

''وہ تو میں لا دوں گی مطبخ کا سارا بندوبست میرے ہی ہاتھ میں ہے لیکن تم......!''

''میں دریچے سے خندق میں سر کے بل کود جاؤں گی اور تھیلے کو اپنی کمر سے باندھ لوں گی بس اس کا منہ اچھی طرح باندھ دینا۔''

''اگر اگر خندق کے پار بھی پکڑی گئی تو بروہا کا محافظ دستہ وہاں بھی گشت کرتا رہتا ہے۔ لیکن تم جاؤ گی کہاں؟''

''نامعلوم منزل کی جانب اور ہودؑ کا سچا ربّ میری رہنمائی کرے گا۔''

اخطونہ اسی رات فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی اور جب وہ نامعلوم منزل کی جانب ستاروں کی چھاؤں میں روانہ ہوئی تو ہر سمت گہرا سکوت تھا۔ گہری تاریکی تھی قوم عاد کے مکانات' حویلیاں' منادر اور محلات ان تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ قدم بڑھاتی رہی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی غیبی طاقت اس کی رہنمائی کر رہی ہو۔

❁......❁......❁

خشک سالی کا دوسرا سال شروع ہوگیا۔ اب حکومت کے ذخیرہ خانوں میں اجناس کی سطح گرتی جارہی تھی۔ خندق کا پانی جو کناروں سے ٹکرا ٹکرا کر باہر چھلکتا تھا اس کی سطح تین ہاتھ گر چکی تھی۔ ہر جانب ایک خوف تھا ایک ہراس تھا چراگاہوں میں گھاس سوکھ چکی تھی اور حموزہ کا بت اسی شان و شوکت سے اپنی جگہ ایستادہ تھا اور اپنی لعل جڑی آنکھوں سے ایک ہی انداز میں پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ بلند پہاڑوں کے اوپر چھوٹے چھوٹے بادلوں کے سفید ٹکڑے ادھر سے ادھر آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں تیرتے پھر رہے تھے۔

''اب دیا ہوگا مقدس بروہا اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو سارا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائے گا بھوکے انسان کو تو دیوتا بھی روٹی کی شکل میں نظر آتا ہے۔'' ایک مقدوسی نے بروہا سے پوچھا۔

''حموزہ کوئی بڑی قربانی چاہتا ہے' اخطونہ کے فرار نے اسے اور زیادہ ناراض کردیا ہے۔''

''شاید برہنہ رقاصاؤں کا رقص اسے خوش کردے اور اس کی ناراضگی دور ہوجائے۔'' مقدوسی شمائز نے مشورہ دیا اور پھر پرشوق نگاہوں سے وہ بروہا کو دیکھنے لگا۔ نفس امارہ کا مذہب ایسے ہی مشورے دیتا ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں جہاں جہاں زندہ اور پتھروں کے بت خانے ہیں وہاں نفس کی پیاس کا بجھانا ہی مذہب ہے کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔

''تو کیا پھر برہنہ رقص کا اعلان کردیا جائے۔'' شمائز نے پوچھا اور بروہا اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

''ہاں برہنہ رقص کا اعلان۔'' بروہا نے کہا اور بات سمجھ میں آگئی کہ اس گرتے ہوئے مذہبی اقتدار کو فکرات سے آزاد ہونے کی ضرورت تھی اور یہ آزادی بنت حوا کی آغوش میں ہی میسر آسکتی تھی۔ کیا یہ حقیقت نہیں جس قوم پر ربّ کائنات اجتماعی عذاب لانا چاہتا ہے اس پر عیاش اور نفس پرست حکمراں مسلط کردیتا ہے۔

معبد کی بنات حوا کو حکم دے دیا گیا کہ وہ دیوتا حموزہ کے سامنے لباس سے عاری ہوکر رقص کریں

یہ سن کر رقاصاؤں میں ایک ہلچل مچ گئی۔
"آج تک تو ایسا ہوا نہیں۔" ایک رقاصہ نے دوسری رقاصہ سے کہا۔
"ہاں آج تک ایسا نہیں ہوا، لیکن اب ہوگا۔" دوسری رقاصہ تہمینہ نے جواب دیا۔
"کیا تمہارے اندر اتنی جرأت ہے کہ اپنے جسم کے خفیہ گوشوں کو بر سرعام پھیلا کر پیش کرو۔" ایک رقاصہ نے پوچھا۔
"صنم خانوں کا یہ ہی مذہب ہے۔" ایک سن رسیدہ خادمہ نے کہا۔
"خاموش رہو بوڑھی مہورہ، اپنی زندگی کے آخری دن سکون سے گزار لو۔" ایک رقاصہ کے ٹوکا۔
"ہاں زندگی کے آخری دن۔" ہمورہ نے ایک سرد آہ بھری اور گرد و نواح میں نگاہ اس طرح ڈالی جیسے کہہ رہی ہو کیا جیتے جی اس جہنم سے کبھی نجات نہیں ملے گی، معبد کی جتنی بھی خادمائیں تھیں ان میں سے اکثر جوانی میں رقاصائیں رہی تھیں اور جب عہد شباب ہوا کے جھونکے کی مانند آ کر گزر جاتا تو ان کو خادمہ بنا دیا جاتا اور اس طرح ان کی زندگیاں اسی مندر کی چہار دیواری میں گزر جاتیں۔
رات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ روشنیوں کی قندیلیں اور مشعلیں روشن کیے آئی، تاریکیاں جہاں ہوں گی، وہاں ہوں گی لیکن حموزہ کے معبد میں تو روشنیوں کے قافلے اتر آئے تھے عنبر اور صندل کی خوش بو سے فضا معطر ہوگئی تھی اور آج کی شب تو ایک انوکھا پیغام لے کر آئی تھی ایسا پیغام جسے سن کر دل دھڑکنے لگے تھے۔
"آج رات حموزہ دیوتا راضی ہو جائے گا اور کل صبح جل تھل ہو جائے گا۔" شمائر نے بڑے وثوق سے کیا۔ پھر انوکھے ساز بجنے لگے اور لباس سے عاری رقاصائیں اپنے چاندی کی مانند چمکتے جسموں کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ انہیں آخر اپنے عظیم دیوتا کو راضی کرنا تھا۔ مقدوسیوں کی تقدس مآب سانسیں رک گئی تھیں اور پلکوں نے جھپکنا چھوڑ دیا تھا اور جب وہ اپنے لباس سے عاری جسموں کو حرکت میں لائیں تو ہر شے ساکت ہو کر رہ گئی۔ رقص جاری رہا اور مقدوسیوں کے وجود میں شیطان مچلتا رہا اور آخر کار اس مقدس محفل کے برخاست ہونے کا وقت آ گیا اور اب ہر باعث احترام مقدوسی کے ساتھ ایک رقاصہ تھی۔ پھر ہر سمت چراغ گل ہونے لگے لیکن مقدوسیوں کے کمرے بدستور روشن رہے اور پھر رات گزرتی چلی گئی۔



تیسرا سال آ گیا۔ لیکن کھیت بدستور ویران رہے اور اب تو محسوس ہونے لگا تھا جیسے ویرانیاں جیسے خزائیں اپنی بہار پر ہوں۔ بنت حوا کی برہنگی نے بھی دیوتا حموزہ میں کوئی رمق پیدا نہیں کی تھی۔ اناج کے ذخیرے ختم ہونے لگے تھے۔ قوم عاد کا حکمران فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ لوگ جو بڑے زعم سے سینے ٹھوک کر کہتے تھے۔
"من اشد منا قوۃ"
(کون ہے ایسا زمین پر جو ہم سے زیادہ قوت رکھتا ہو)
اب وہ خالی خالی آنکھوں سے آسمان کو دیکھتے تھے جہاں بارش کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ قوم عاد کے امراء فکر مند تھے کہ اس خشک سالی سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ ان میں سے ایک شخص نے ان امراء سے کہا۔

"کیا ایسا نہ کیا جائے کہ بوقبیس کے سلسلے کے نشیب میں جو مقدس مقام ہے وہاں ایک قوم رہتی ہے اور شرف و فضیلت کا دعویٰ کرتی ہے سنا ہے اس محترم اور باعث حرمت مقام پر جا کر دعا مانگی جائے۔"
"تو کیا حموزہ کو چھوڑ دیں۔" ایک حمرازی نے سوال کیا۔
"حموزہ ناراض ہے دیوتاؤں کی ناراضگی ایک دو دن نہیں ہوتی سالوں پر محیط ہوتی ہے لہٰذا فی الحال کوئی اور برکتوں والی جگہ تلاش کی جائے۔" شمائر نے کہا۔
"میرا خیال ہے بوقبیس کے اس مقام کا ہی رخ کیا جائے سنا ہے وہاں جو دعا مانگی جاتی ہے وہ پوری ہوتی ہے۔ سنا ہے وہاں آخری اوتار آنے والا ہے۔"
"کیا اس سلسلے میں بروہا سے مشورہ نہ کیا جائے۔"
"بروہا سے مشورہ، آج کل دن رات نبیذ اور عقار ہے اور ایک رقاصہ ہے جسے لباس پہننے کی اجازت نہیں اور بروہا ہے وہ تو مسلسل حموزہ کے دھرم کے مطابق مذہبی فریضہ ادا کر رہا ہے اسے اس کی عبادت میں مصروف رہنے دو۔" ایک امیر کے لہجے میں بڑا طنز تھا۔ اس بات چیت کے بعد دوسرے دن چند حمرازیوں کی جماعت بوقبیس کے سلسلے کی جانب روانہ ہوگئی۔ جب لوگ وہاں پہنچے تو وہاں کے سردار نے کھلے دل سے ان کا استقبال کیا اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ پھر شراب کے دور چلے اس کے بعد راگ و رنگ کی محفل برپا ہوگئی رقاص دوشیزائیں نیم برہنہ حالت میں محو رقص ہوگئیں۔ قوم عاد کے امراء نے ان کے وجود میں کچھ زیادہ ہی کشش محسوس کی وہ بھول گئے کہ حرمت کے مقام پر انہیں خشک سالی دور کرنے کے لیے دعائیں مانگنی تھیں، وہ بھول گئے کہ سرزمین عاد ویرانیوں کی زد میں آ چکی ہے، خزاؤں کی دیوی نے اس زمین پر اپنے خشک بالوں کو پھیلا دیا ہے۔
"ہمیں شراب چاہیے، ہمیں رقص و سرور چاہیے اور یہ ہوڈ ایک ایسے خدا کی بات کرتا ہے جس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔" اور انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حموزہ کی پرستش سے ہرگز منہ نہ موڑیں گے۔
"کیا ایسا تو نہیں کہ ہم نے ہوڈ اور ان کے ماننے والوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے اور حموزہ دیوتا ہم سے سخت ناراض ہو گیا ہو، خشک سالی کو اب چوتھا سال ہونے کو ہے اور آسمان سے ایک بوند پانی نہیں گرا۔" ایک حمرازی نے کہا۔
"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے بلکہ اس کے قوی امکانات ہیں۔" دوسرے نے ہاں میں ہاں ملائی۔
"پہلا سوال ہوڈ کے ماننے والوں سے یہ کرنا ہے کہ جس خدا کی وہ بات کرتے ہیں، اسے ہمارے سامنے تو لائیں کہ وہ ہے کہاں۔" شمائر نے کہا۔
"ہاں سب سے پہلا سوال یہ ہی ہونا چاہیے اور وہ پہلے ہی سوال کا جواب نہ دے سکیں گے اور بات صاف ہو جائے گی۔" ایک دوسرے حمرازی نے کہا۔
"اسی پر بس نہیں کرنا ہے پھر یہ بھی کہنا ہے کہ یہ خدا صرف تمہارے ذہنوں کا فتور ہے اور اپنے اس فتور کو تم معصوم لوگوں میں بھی بٹھا دینا چاہتے ہو لہٰذا اس حرکت سے باز آ جاؤ۔"
"بہتر یہ ہوگا کہ براہ راست ہوڈ کو دھمکی دی جائے کہ اگر وہ اپنی اس تبلیغ سے باز نہیں آئے تو ان کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے گا کہ نہ رہے بانس نہ

بجے بانسری۔
الغرض ان لوگوں نے عوام میں حضرت ہودؑ کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ شروع کردیا۔



اخطونہ رات کی تاریکیوں میں نکلی تھی اور صبح ہوتے ہی اس مقام پر پہنچ گئی جو بالکل ویران تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے کبھی اس نے اس جگہ کو دیکھا ہے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ اس مقام سے گزری ہے پھر اسے سب کچھ یاد آ گیا یہ سب کچھ تو وہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا دور فاصلے پر ایک پہاڑی سلسلہ تھا۔

''ہاں یہی پہاڑی سلسلہ ہے جس کو اس نے خواب میں دیکھا تھا رات بھر پیدل سفر کرنے کے بعد اس کے حوصلے بلند ہوگئے اور جب وہ وہاں پہنچی تو ایک چشمہ اس طرح پھوٹ رہا تھا جیسے پھلجھڑی چھوٹ رہی ہو۔ اب سورج طلوع ہوگیا تھا پیلو اور کنہیر کی جھاڑیوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہر جانب سبزہ ہی سبزہ تھا۔ پھر اسے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔

''یہ تو وہی درخت ہے جنہیں اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ مسرت کی ایک لہر اس کے دل و دماغ میں دوڑ گئی۔

''یقیناً یہ سب پھل دار درخت ہیں۔'' اس نے پورے یقین کے ساتھ سوچا اور وہ سب پھلوں سے لدے ہوئے اشجار تھے۔ خنک ہوا کے جھونکے چل رہے تھے قریب ہی سے اسے بھیڑوں کے ممیانے کی آوازیں آنے لگیں۔

''کیا یہاں کوئی اور بھی ہے بھیڑیں کسی کی موجودگی کا پتا دے رہی ہیں۔'' اخطونہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ ایک دوشیزہ جس نے ڈھیلا لباس پہنا ہوا تھا سر پر چادر تھی جس نے اس کے کانوں تک کے حصے کو چھپا رکھا تھا ہاتھ میں بید مجنوں کی چھڑی لیے نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ سفید تھا۔ بڑی بڑی کجلائی ہوئی آنکھیں اور ان میں حیا اور شرم کے اثرات، ستواں ناک، کتابی چہرہ اس کی تھوڑی میں چاہِ زنخداں اخطونہ اسے دیکھتی رہ گئی، دوشیزہ کے ایک ہاتھ میں کھیرنی سے لدی ہوئی ایک شاخ تھی جو وہ بکری کے اس بچے کو کھلا رہی تھی جو اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو کچھ دیر تک دیکھتی رہ گئیں۔ دوشیزہ کو محسوس ہوا کہ اخطونہ کا لباس حیا سوز تھا اور جسم کے وہ حصے جنہیں پوشیدہ اور ڈھکا ہوا ہونا چاہیے وہ کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے۔

''تم کون ہو اور کہاں سے آرہی ہو؟'' دوشیزہ نے سوال کیا۔

''حموزہ کے معبد کی ایک رقاصہ حضرت ہودؑ کے مذہب کی دلدادہ۔'' اخطونہ نے جواب دیا۔

''فرار۔''

''ہاں فرار، جہنم سے فرار اور خدائے واحد پر ایمان لانے کی صداقت نے میری رہنمائی کی ورنہ حموزہ کا یہ مندر، ایک پوشیدہ طوائف خانے سے مختلف نہیں طوائف تو اپنی مرضی کی مالک ہے، جس کو چاہے اپنا جسم پیش کرے اور جس سے نفرت ہو اسے دھتکار دے اور مندر کی رقاصہ وہ مجبورِ محض ہے۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''اخطونہ۔''

''اور تمہارا نام؟''

''میرا نام ثمانی ہے۔'' دوشیزہ نے جواب دیا۔

''تم یہاں پہنچی کس طرح؟'' اخطونہ نے پوچھا

اور ثمانی نے اپنی تمام داستان بیان کردی۔

''اس جگہ کا نام کیا ہے؟'' اخطونہ نے کہا۔

''دارالامن ویسے یہاں کے بارے میں بڑی داستانیں مشہور ہیں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ یہ اہل ایمان کی بستی ہے، کفار کی نگاہوں سے ہمیشہ پوشیدہ رہے گی اگر کوئی عذاب آتا ہے اللہ کی جانب سے یہ خطہ محفوظ رہے گا۔'' ثمانی نے کہا۔

''کس طرح محفوظ رہے گا؟'' اخطونہ نے پوچھا۔

''جس طرح نوحؑ کی وسیع و عریض کشتی محفوظ رہی۔'' ثمانی نے جواب دیا۔

''نوح کی کشتی؟''

''ہمارے اجتماع میں اکثر کاہن ابرش ایسی ہی باتیں بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں جب کوئی قوم اپنے کردار کے اعتبار سے اس مقام پر آجائے تو یہی اس کا نقطۂ عروج ہوتا ہے اور پھر وہ اس قاہر کے عذاب کا انتظار کرے جو واحد ہے احد ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ حضرت ہود علیہ السّلام ہزار زیادتیوں، تکلیفوں اور اذیتوں کے باوجود قوم کو پکار رہے ہیں لیکن جن کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اب ان کا انجام صرف اللہ کا عذاب ہے۔''

''ہاں ثمانی جب مذہب کا لبادہ اوڑھ کر شیطان رقص کرتا ہے تو خوب وزشت کے پیمانے مٹ جاتے ہیں اور مجھے جیسا کہ تم نے بتایا ایک اور طوفان پھر سات صدیاں گزر جانے کے بعد بپا ہوگا۔'' اخطونہ نے کہا۔

''اللہ کو کسی لشکر کے بھیجنے کی ضرورت نہیں اس کی آواز کی ایک گونج ہی ان کے لیے کافی ہے یہ کہتے

ہیں ہم اپنا رب انہیں دکھائیں کیا یہ چاند' یہ ستارے' یہ سورج' یہ ہوائیں' یہ زمینیں اور دن اور رات کا ہونا کیا سب کچھ اس کے وجود کا ثبوت نہیں۔"

"ہاں ثماتی ہم جو اس کی مخلوق ہیں ہم کیا اسے سمجھ سکتے ہیں اور عقل سے عاری یہ لوگ جنہوں نے اپنے ہاتھوں سے ان پتھروں کو تراش کر بت بناتے ہیں انہیں اپنا معبود بنا بیٹھے۔"

"تم جب یہاں آ ہی گئی ہو تو میں تمہیں کاہن ابرش سے ملاتی ہوں اور بس میرا شوہر ابیل بھی ہوگا۔"

"کاہن ابرش۔"

"ہاں' یہ کہانت ترک کر کے حضرت ہود پر ایمان لا چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہانت شرک ہی نہیں بدترین شرک ہے۔" پھر ثماتی اخطونہ کو لے کر چلی گئی۔ اس کا حیا سوز لباس اتار کر اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑے اسے دے دیے۔



قوم عاد کے بازار' گھر اور کون سا مقام تھا جہاں یہ افواہ نہ پھیلائی گئی کہ حضرت ہودؑ کی بناء پر خشک سالی کی انتہا ہوگئی۔ اب چھٹا سال خشک سالی کا چل رہا تھا لوگ اناج نہ ہونے کی بناء پر جانوروں کے خشک گوشت پر گزارہ کر رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے ذہنوں میں یہ خیال پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ حموزہ کی ناراضگی کا سبب ہودؑ کی ذات تھی۔

"آخر کیا کیا جائے؟ کیا (نعوذ باللہ) ہود کو قتل کر دیا جائے۔" بروہا نے کہا اور یہ سن کر تھیم اور مزید کانپ کر رہ گئے انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر یہ اقدام اٹھایا گیا تو قوم عاد کو تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

"میرا خیال ہے سمارخ کاہن کو بلایا جائے کہ ہودؑ کو قتل کرنا مناسب ہوگا یا نہیں کیونکہ اس نے قوم عاد کی بستیوں میں بڑی ہلچل پیدا کر دی ہے۔" مزید نے کہا۔

"ہاں یہ تجویز ٹھیک رہے گی۔" تھیم نے کہا۔

"بہتر یہ ہوگا کہ اس بارے میں تاخیر مناسب نہیں اور اس کا قتل کر دینا ہی بہتر ہے۔" شمائز نے کہا۔

"نہیں یہ مناسب نہیں رہے گا بلکہ پہلی تجویز ہی بہتر ہے۔" مقدوسی ندبارہ جو ذہنی طور پر حضرت ہودؑ سے خائف تھا اس نے پہلی تجویز کی تائید کی اور پھر اسی روز بروہا نے اپنے ایک قاصد کو سمارخ کی جانب روانہ کر دیا' وہ ایک پہاڑی کے دامن میں رہتا تھا اور شاذ و نادر ہی اس کی شکل نظر آتی تھی' جب قاصد اس کے پاس پہنچا تو وہ کوئی زائچہ کھینچنے میں مصروف تھا اور غور و فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ قاصد غار میں داخل ہو کر کھڑا ہو گیا اس لیے کہ کاہن سمارخ زائچہ کھینچنے میں ڈوبا ہوا تھا پھر کافی دیر بعد نظریں اٹھا کر قاصد کو دیکھا۔

"بروہا نے بھیجا ہے تمہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں بزرگ کاہن مجھے محترم بروہا نے بھیجا ہے۔" قاصد نے کہا۔

"اس سے کہہ دینا ہودؑ کو قتل کرنے کی حماقت نہ کرے ورنہ پوری قوم عاد کو خطرے میں ڈال دے گا۔" قاصد اس کا چہرہ دیکھنے لگا کیونکہ اب تک تو اس نے کاہن سمارخ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"جاؤ اب چلے جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔" قاصد بغیر کچھ کہے روانہ ہو گیا اور بروہا اور مقدوسیوں کے سامنے اس نے جو کچھ سمارخ نے کہا تھا دہرا دیا۔

"ایک صورت ہو سکتی ہے کہ ہودؑ کو سخت ترین

دھمکی دی جائے کہ اگر وہ باز نہ آیا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا۔" ایک مقدوسی نے کہا۔

"ہاں اس کی تمام تر کارروائیوں کو روک دیا جائے اور اس کے ماننے والوں پر جس قدر سختی ہو سکے وہ کی جائے۔"

زندگی حضرت ہودؑ کے ماننے والوں پر تنگ کر دی گئی جس طرف وہ نکل جاتے طنز اور ملامت کے تیروں سے انہیں گھائل کیا جاتا۔

"یہ خدائے واحد کی بات کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے خیالی خدا کو صرف اپنے ذہنوں میں چھپا رکھا ہے۔" کسی نے کہا۔

"اور ان کے خیالی خدا نے انہیں تمام لذتوں سے محروم کر دیا ہے۔ عیش و نشاط کے تہوار کے دن آ رہے ہیں اور اس کو یہ لوگ گناہ کبیرہ کا نام دے رہے ہیں' خاص طور پر ہماری خواتین سے کہا جا رہا ہے کہ یہ بدکاری ہے' ہماری خواتین کی آرزو' ان کی خواہشات پر پانی پھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ آرزوں اور امیدوں کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے یہ تو ہمارے دیوتاؤں کی برکتوں کا دن اور رات ہے۔" ایک رنگین مزاج عورت نے کہا۔

پھر ایک دن مقدوسیوں کا ایک گروہ حضرت ہودؑ کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔ "باز آ جاؤ اپنے اس خیالی خدا کی تبلیغ سے ورنہ تمہیں بے دردی سے قتل کر دیا جائے گا ہم تمہیں قتل کرنے میں ذرا بھی تعرض نہیں کریں گے۔" یہ ایک بھیانک دھمکی تھی۔ اس وقت آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ "اے اللہ مجھے ان کے ظلم سے بچا کیونکہ مجھ میں ان سے لڑنے کی قوت نہیں۔" وہ اللہ کی جناب میں گریہ وزاری کرتے رہے روتے رہے اور پھر مہر سکوت ان کے ہونٹوں پر ثبت ہوگئی۔



عیش و نشاط کے تہوار کی رات آ گئی اور رنگین مزاج بدکار شادی شدہ عورتوں کے دلوں میں لڈو پھوٹنے لگے سب سے زیادہ درخواستیں بروہا کے پاس آئیں کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ خواتین پر اپنی برکتیں نچھاور کرنے میں بڑا قوی اور فیاض تھا۔ قوم عاد کی کون سی عورت تھی جو اس کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کی آرزو نہ رکھتی تھی اور پھر قوم عاد کی روشن خیال خواتین اپنے اپنے پسندیدہ مردوں کو پیغامات روانہ کر چکی تھیں۔ وقت کا تعین کر رہی تھیں اور گمراہی کی اس دلدل کو عین مذہبی فریضہ سمجھ رہی تھیں۔ عیش و نشاط کے اس تہوار کے نو ماہ بعد اگر کسی بچے کی ولادت ہوتی تھی تو اس کا مقدوسی بنانا لازمی ہوتا تھا۔

صبح طلوع ہوئی سرخ رنگوں میں ڈوبی ہوئی فجر کے وقت کاہن ابرش اللہ کی عبادت سے فارغ ہو کر اہل ایمان کے ٹھکانوں کی جانب روانہ ہو گیا اور ایک ایک فرد سے کہتا گیا کہ اب وہ دارالامن کا رخ کریں کیونکہ آنے والی رات بارہ بجے اس اجتماعی زنا کا تہوار شروع ہونے والا تھا اور اب ہجرت کا وقت آ گیا تھا۔

"مقدس ابرش کیا ہم اس پہاڑ کی سمت روانہ ہو جائیں جس کے عقب میں وادیٔ دارالامن ہے؟" ایک خاتون نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں' پہاڑ کے عقب میں دارالامن کی جانب جہاں ایک چھوٹا سا درہ ہے' جو ان کفار کی نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اہل ایمان کو نظر آتا ہے۔ حضرت ہودؑ نے یہاں ایک خط کھینچ دیا ہے۔" ابرش نے کہا۔

''کیا عذاب کا وقت آ پہنچا ہے؟'' خاتون نے سوال کیا۔

''ہاں، اب وقت بہت ہی قریب ہے، نکل جاؤ اس وادیٔ عذاب سے جتنی جلد ممکن ہو سکے نکل جاؤ اور فرداً فرداً ہر شخص نے نکلنا ہے۔'' اتنا کہہ کر ابرش دوسروں کو آگاہ کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس سرخ صبح کے آغاز سے ہی قوم عاد میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی تھی اس بابرکت تہوار کے خیال سے ہی ان شادی شدہ عورتوں کے دلوں میں ایک اضطرب ایک بے چینی شروع ہو گئی تھی اس لیے کہ وہ مرد کی قربت کی لذتوں سے پہلے سے ہی آشنا تھیں اور چاہتی تھیں کہ جلد سے جلد یہ ساعتیں گزر جائیں اور وہ مذہبی لذتوں میں کھو جائیں۔

اس تہوار کا آغاز ہی رقص سے ہوتا تھا۔ البتہ جن رقاصاؤں نے رقص میں حصہ لینا تھا ان کے رقص کے خاتمے پر مقدوسی بھوکے بھیڑیوں کی مانند ان کو بھنبھوڑنا شروع کر دیتے تھے اور پھر انہیں اور پھر انہیں خوف بھی کیا تھا وہ تو ان رقاصاؤں پر برکتیں نچھاور کرتے تھے اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ دوسری جانب عام گھرانوں کی خواتین بھی اپنے دل کے ارمان نکال رہی تھیں اور یہ دنیا کی تاریخ ہے مادی تہذیب جب اپنے عروج پر پہنچتی ہے تو یہ ہی ہوتا ہے نفس کا اژدھا پھنکاریں مارتا پھرتا ہے، مصر کی تہذیب جب اپنے عروج پر پہنچی تو امراء کی خواتین کے درجنوں محبوب ہوتے تھے اور یہ بات فیشن میں شامل تھی۔

رات بھر ذلالتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد صبح ہوئی تو کسی نے بلند آواز میں کہا۔ ''بادل اٹھ رہے ہیں گہرے اور دبیز بادل، اب جل تھل ہو جائے گی۔'' یہ سن کر گھروں سے، حویلیوں سے، بالا خانوں سے منادر اور امراُ کے محلات سے ہر ایک نے ایک وسیع و عریض میدان میں جمع ہونا شروع کر دیا۔

''بادل گھر کر آ رہے ہیں، یہ ہمارے عیش و نشاط کے تہوار کی برکتیں ہیں شاید حموزہ دیوتا خوش ہو گیا ہے۔'' ایک مقدوسی جو رات بھر ایک بے بس رقاصہ کو عقار کے جام چڑھا چڑھا کر کچلتا رہا تھا بولا۔

......☆☆☆......

''کوئی اہل ایمان عاد کی بستیوں میں باقی تو نہیں رہ گیا۔'' کاہن ابرش نے پہاڑ کی اوٹ میں چھپے ہوئے دارالامن کے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔

''ہم ستر افراد یہاں امن و عافیت سے ہیں۔'' ثماتی کے شوہر ابیل نے کہا۔

''حضرت ہود علیہ السلام نے ایک خط کھینچ دیا ہے اور یہ وادی عافیت میں رہے گی۔ اتنی دیر میں تھیم اور مزید بھی ہانپتے کانپتے یہاں پہنچ گئے۔

''شکر ہے کہ آپ لوگ آ گئے بادل اٹھنے شروع ہو گئے ہیں۔'' کاہن ابرش نے کہا۔

''صبح ہونے کے باوجود ہر سمت گہرا سناٹا ہے جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے خدا رحم کرے۔'' ایک ضعیف اہل ایمان نے کہا۔

''فضا کی لامتناہی وسعتوں میں پرندے ادھر اُدھر منڈلا رہے ہیں۔'' ایک دوسرے شخص نے کہا اور دوسری جانب رات بھر مقدوسیوں سے برکتیں حاصل کرنے والی قوم عاد کی عورتیں اپنے وجود کو لہرا لہرا کر رقص کر رہی تھیں۔ ان کے ارمان نکل چکے تھے اور ان کے دل مسرتوں سے ہمکنار تھے۔ سفید بادل اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پہلو سے ایک سرخ بادل نے پھیلنا شروع کر دیا۔

''یہ دوسرا سرخ بادل یہ کس بات کی علامت ہے۔'' ثمائر نے دوسرے مقدوسی سے سوال کیا۔

''یہ ہماری مسرتوں اور خوشیوں کی نشاندہی کر رہا ہے اس لیے کہ ہمارا بابرکت تہوار ابھی نصف رات تک اور جاری رہے گا اور عاد کی سرزمین کو رنگ برنگی مسرتوں سے ہمکنار کر دے گا۔''

''ہاں ہماری خوشیوں کو دوبالا کر دے گا، اب کلفتوں کے دن گزر گئے اب ویرانیاں ختم ہو جائیں گی اور بہاروں کی رت آ جائے گی۔'' ایک اور مقدوسی نے کہا۔

''زندگی لہرائے گی مسکرائے گی، رقص میں آ جائے گی۔'' ایک دہرے بدن کی عورت حیا سوز لباس پہنے ہوئے گاتی ہوئی ان کے قریب سے گزر گئی پھر کچھ دیر ہی گزری تھی بائیں سمت سے سرخ بادل کے پہلو سے دبیز سیاہ بادل نے ابھرنا شروع کیا۔

''یہ ہے ہماری دیرینہ آرزو کی تکمیل، دبیز گہرا سیاہ بادل جو پیاسی سرزمین عاد کی تشنگی کو دور کر دے گا۔ سوکھے تالاب پانی سے لبریز ہو جائیں گے، خشک کھیتوں کی زمین سیراب ہو جائے گی، حموزہ دیوتا برسا دے اس بادل کو۔'' سب لوگوں کی یہ تمنا تھی سیاہ بادل نے پھیلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ سرخ اور سفید بادلوں کو بھی اس نے اپنی اوٹ میں لے لیا۔

''سجدہ ریز ہو جاؤ اے دارالامن کے باسیوں اور توبہ کرو اپنے گناہوں کی وہ دیکھو سیاہ بادل پھیلتا جا رہا ہے عذاب الٰہی شروع ہو چکا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام خاموش ہیں اور اللہ کے حضور جھکے ہوئے ہیں۔ سنا ہے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی عذاب آنے کا اندازہ ہو گیا تھا اور پھر پورے سات سو سال بعد آدم کے نافرمان بیٹوں نے عذاب کو دعوت دے دی ہے۔ اب اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔'' کاہن ابرش نے کہا۔ پھر ہوا نے قوم عاد کی سرزمین کی فضاؤں میں چلنا شروع کر دیا۔

''اب بارش شروع ہو جائے گی دیوتا حموزہ کی تعریف میں بھجن گانا شروع کرو۔'' ایک مقدوسی نے کہا اور عورتوں نے لہرا لہرا کر گانا شروع کر دیا۔ دفعتاً شدید ہوا کا جھونکا آیا در و دیوار لرز کر رہ گئے اور انسان ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے ایک شدید جھونکے نے ان کے پیر اکھاڑ دیے بروہا جو اپنی مسند پر بڑے جاہ و جلال سے بیٹھا ہوا تھا اپنی مسند سمیت فضا میں بلند ہو گیا اور حموزہ کا بت لرزنے لگا پھر ایک غیبی آواز ابھری یہ ہے وہ عذاب جس کی تمہیں جلدی تھی۔ اب لوگ زمین پر نہیں تھے بلکہ فضا میں تنکوں کی مانند اڑ رہے تھے۔ ان کے سر اس شدت سے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے کہ ان کے دماغوں کے بھیجے منہ اور ناک کے راستے بہہ نکلے تھے۔ ہوا کے جھکڑوں کی خوفناک آوازیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خوفناک مافوق الفطرت بلائیں چنگھاڑ رہی ہوں۔ حموزہ کا بت تنکے کی مانند اپنی جگہ سے اڑا اور بروہا جس کا وجود ہوا میں منڈلا رہا تھا حموزہ کے بت سے ٹکرایا اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے نکل گئیں اور اس کا سر پاش پاش ہو کر ہوا میں منتشر ہو گیا۔ ہواؤں کی شدت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر وہ پہاڑ جنہیں تراش کے قوم عاد نے محلات و منادر تعمیر کیے تھے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے اور ان کے پتھر اڑتے ہوئے انسانوں سے ٹکرا ٹکرا کر ان کے ایک ایک عضو کو چکنا چور کر رہے تھے۔ ایک قیامت خیز منظر تھا۔ محلات و حویلیاں منہدم ہو چکی تھیں۔ حموزہ کے مندر میں وہ عشرت گاہیں جہاں بے بس رقاصاؤں

کے جسموں کو ہر آنے والی رات کچلا جاتا تھا' بھنبھوڑا جاتا تھا اب وہ کھنڈرات میں تبدیل ہو رہی تھیں اور ہواؤں کا زور بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا لیکن وہ وادی جس کے اور عاد کی زمین کے درمیان حضرت ہود نے ایک خط کھینچ دیا تھا' وہاں ہوائیں تو چل رہی تھیں لیکن ہواؤں نے اس وادی کی فضا کو سہانا اور خوش گوار بنا دیا تھا۔ ہلکے ہلکے ہوا کے جھونکے اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور جھومتے ہوئے درخت اور پودے ماحول میں ایک عجیب کیف پیدا ہو گیا تھا اور سر زمین عاد اور اس کے باسی ان ہلاکتوں سے دو چار تھے جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ کہاں گیا وہ زعم' وہ تکبر' وہ غرور کہ ہم جیسا کوئی دراز قامت نہیں؟ ہم جیسا کوئی قوی اور طاقتور نہیں' یہ تو خس و خاشاک کی مانند ہواؤں میں منتشر تھے۔ یقیناً خدا کسی قوم کے اجتماعی گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ اب عاد کی فضاؤں میں اسی خود سر اور مغرور قوم کے پرزے بکھر رہے تھے۔ انسان پتھروں سے دوسرے انسانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ وہ سیاہ گھٹا جو اٹھی وہ تاریک سے تاریک تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی اس سے نہیں نکل رہا تھا اور مقدوسیوں کے بت خانے کے بت اس طرح فضا میں قلابازیاں کھا رہے تھے جیسے ان میں کوئی وزن ہی نہ ہو۔ آج بادشاہی کس کی تھی' اسی رب العالمین کی جس کو دیکھنے کی انہیں بڑی آرزو اور تمنا تھی پھر ہوا کا ایک شدید ترین ریلا آیا جس نے حموزہ کے مندر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور اس کا قد آور بت ہواؤں میں اس طرح قلابازیاں کھا رہا تھا جیسے کوئی ماہر نٹ ہو پھر وہ جس سے ٹکراتا تھا اسے چکنا چور کر دیتا تھا۔ پھر شمالی پہاڑ کا ایک پہاڑ جیسا حصہ فضا میں بلند ہوا اور یہ بت اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ انسانوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں تھی کسی کا سر' کسی کا پاؤں اور کسی کا دھڑ روئی کے گالوں کی مانند اِدھر اُدھر منتشر تھے۔ اس سطح زمین کی ہمیشہ سے ہی تاریخ رہی ہے کہ جب بھی آدم کے گمراہ بیٹوں نے نفس پرستی کو روشن خیالی کا لبادہ پہنایا' جب بھی انسان نے اپنے نفس عمارہ کو اپنا معبود بنایا' جب بھی انسان نے ضلالتوں کو مسند اقتدار پر بٹھایا' جب بھی انسان نے برہمیت کو پاپائیت کو خدائی حقوق دیے پھر وہ عذاب الٰہی سے نہ بچ سکے۔

اور جب زمین کے اس خطے میں بسنے والی قوم ہلاک ہو گئی تو ہواؤں کا یہ طوفان تھم گیا۔ چاند کا طباق جیسا چہرہ قوم عاد کے مکانات' حویلیوں' منادر اور محلات پر طلوع ہو گیا۔ کل تک جہاں عظیم الشان محلات تھے اب وہاں کھنڈرات تھے جو زبان حال سے کہہ رہے تھے۔

دیکھ مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

آج بھی سعودی عرب اور شام کے درمیانی حصے میں یہ کھنڈرات موجود ہیں اور انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دائمی سوگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے ارد گرد کے پہاڑ جیسے اس سر زمین کے ان کھنڈرات کے ایسے تماشائی ہوں جو اس نظارۂ عبرت سے سیر حاصل ہوتے نظر نہیں آتے۔

''خدا کسی قوم کے اجتماعی گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔''

